پیاسے

جُرم وسزا، چاردیواری کی دنیا کی دس سچی آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں سنسنی خیز جگر سوز



عنایت اللہ

فہرست

پیش لفظ

یہ اپنے معاشرے کی دس سچی آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اُن خواتین و حضرات کی خود نوشت داستانیں ہیں جن کے ساتھ یہ واقعات پیش آتے ہیں۔

یہ تمام کہانیاں "حکایت" کے سالناموں کی انعام یافتہ ہیں۔ اس وقت تک "حکایت" کے چودہ سالنامے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ "حکایت" کے سالناموں کو قارئین منتخب اور انعام یافتہ سچی کہانیوں کی وجہ سے مستقل اہمیت کی کتابوں جیسی اہمیت دیتے ہیں۔ ہر کہانی ڈیڑھ دو سُو مسودوں میں سے ایک بورڈ منتخب کرتا اور اِسے انعام کے قابل قرار دیتا ہے۔

چونکہ یہ آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں لکھنے والے پیشہ ور قلمکار نہیں، ان پر جو بیتی وہ انہوں نے لکھ دی اس لئے "حکایت" کا ادارتی سٹاف اِن تحریروں کی نوک پلک اور ترتیب درست کرتا ہے۔ واقعات میں ذرا سی بھی ردو بدل نہیں کی جاتی، صرف تحریر کو بہتر بنایا جاتا ہے۔ اس طرح کہانی ایک شاہکار سچی کہانی بن جاتی ہے۔

یہ مجموعہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ چار ادیبوں کے بورڈ کی منتخب کی ہوئی آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں میں سے منتخب کیا گیا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہونا چاہیئے کہ ان کہانیوں کا معیار کتنا بلند ہو گا۔

سچی کہانی کا معیار صرف طرزِ تحریر سے ہی نہیں پرکھا جاتا، اس کے کچھ اور پہلو بھی ہوتے ہیں۔ ان میں ایک پہلو جذبات اور احساسات سے تعلق رکھتا ہے۔ پڑھ کر آزمائیں۔ ہر کہانی آپ کی جذباتی دُنیا میں زلزلے بپا کر دے گی۔

ان کہانیوں کا کوئی ایک بھی کردار آپ کے لئے اجنبی نہیں۔ ایسے کردار آپ کے محلے اور گاؤں میں بھی ہوں گے۔ آپ کے اپنے رشتہ داروں میں بھی یہ کردار ہوں گے۔ ہوسکتا ہے آپ خود ہی ان میں سے کسی کہانی کے کردار ہوں یا آپ ایسے ہی حالات کی چکی میں پس رہے ہوں یا پس چکے ہوں۔

یہ اعزاز صرف مکتبۂ داستان کو حاصل ہے کہ یہ ادارہ اپنے معاشرے کے ڈھکے چھپے کونوں کھدروں سے سچی آپ بیتیاں، جگ بیتیاں اور ناقابلِ فراموش واقعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ کتاب فروخت کرنے کے لئے آج کل مار دھاڑ، ایکشن اور فحاشی کا سہارا لیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ایسی کہانیاں ہماری اُبھرتی ہوئی نسل کا کردار تباہ کر رہی ہیں۔

ہماری کسی کہانی میں آپ کو ایسی غلاظت نہیں ملے گی بلکہ ایسا آئینہ ملے گا جس میں آپ کو اپنی ذات کا، اپنے گھر کا اور اپنے معاشرے کا صحیح اور واضح عکس ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو کہانی کی دلچسپیاں بھی ملیں گی۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

بیٹی جو بیوی نہ بنی

مَیں نے حال ہی میں اپنی بیوی کی تیسری برسی منائی ہے۔ مرحومہ میری زندگی میں بہت بڑا خلا چھوڑ گئی ہے۔ اُس کی وصیّت کے مطابق برسی کے موقع پر قرآن خوانی مسجد کے مولوی اور اُس کے پیشہ ور شاگردوں سے نہیں کرائی گئی تھی بلکہ پہلی دو برسیوں کی طرح میں نے اور میری اولاد نے قرآن ختم کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے مجھے اتنا دیا ہے کہ اس موقع پر زیادہ نہیں تو تین دیگیں پکوا کر محلے میں تقسیم کر سکتا تھا لیکن یہ بھی مرحومہ کی وصیّت تھی کہ اُس کے بعد اُس کے نام پر کچھ کرنا ہو تو ختم قرآن کے ساتھ ایک یا دو انتہائی غریب اور نادار لڑکیوں کو نئے کپڑے اور اپنی توفیق کے مطابق کچھ پیسے دیئے جائیں۔ مَیں نے اُس کی وصیّت پر عمل کیا ہے۔

میری نگاہ میں مرحومہ کا احترام اور پیار صرف اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ میری بیوی یا میرے بچّوں کی ماں تھی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بہت بڑی قربانی کی یادگار تھی۔ اُس روز سے جس روز مرحومہ کی ڈولی میرے گھر اُتری تھی اُس روز تک جس روز اُس کا جنازہ میرے گھر سے اُٹھا تھا، یاد کرتا ہوں تو یہ داستان جو سنانے لگا ہوں میری ذاتی کہانی نہیں رہتی۔ اگر یہ آپ بیتی یا جگ بیتی ہے تو یہ ہزاروں پاکستانیوں پر بیت گئی ہے۔ تمہید سے ہٹ کر مَیں اصل بات پر آتا ہوں۔ یہ بات اڑتیس سال پہلے شروع ہوئی تھی۔

شروع اس طرح ہوئی کہ میری شادی کا مسئلہ آگیا۔ میرے رشتہ داروں میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ میری والدہ اور بہنوں نے رشتے کرانے والی دو عورتوں کو کہا کہ وہ میرے لئے کوئی لڑکی دیکھیں اور گھر ایسا ہو جیسا درمیانے درجے کا ہمارا گھر ہے۔ دونوں عورتیں اپنے پیشے کے مطابق

دوسرے چوتھے روز باری باری آکر رشتے بتلانے لگیں۔ آخر ایک گھر میری والدہ اور بہنوں کو پسند آگیا۔ وہ جاکر لڑکی کو دیکھ آئیں۔ لڑکی ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی۔ اُس کا باپ شہر کے ایک بڑے بازار میں دُکاندار تھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔

لڑکی کے والدین مجھے اور میرے گھر کو دیکھنے آئے۔ اُسی روز رشتہ طے ہوگیا۔ لڑکی کے والد نے کہا کہ شادی پر پیسہ ضائع نہیں کیا جائے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ رسمی سا جہیز دے گا اور باقی جہیز نقد رقم کی صورت میں دے گا۔

ہم نے کہا کہ جہیز رسمی ہی دیا جائے لیکن نقد رقم بالکل نہ دی جائے۔

یہ تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو میں بیان کروں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور آپ کے لئے بوریت بھی پیدا ہوگی۔ ہُوا یہ کہ تھوڑی سی بارات کے ساتھ ہم لوگ گئے اور باعزت طریقے سے لڑکی کو لے کر آگئے۔ باعزت طریقے سے مراد یہ ہے کہ لڑکی کے والدین نے شریفانہ اور جائز خرچ کیا۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ پاکستان کی عمر ابھی دو سال پوری ہوتی تھی۔ ابھی تک مشرقی پنجاب سے آتے ہُوتے مہاجرین کی زیادہ تعداد ریفیوجی کیمپوں میں، ہندوؤں اور سکھوں کے چھوڑے ہوتے احاطوں میں اور پرانے مکانوں کے کھنڈروں میں پڑی ہوتی تھی۔ بعض مقامی لوگوں نے ان بے گھر مہاجرین کی جوان لڑکیوں کے ساتھ شادی کر کے اُنہیں سنبھال لیا تھا۔ یہ شادیاں نہایت سادگی سے ہوتی تھیں، صرف نکاح پڑھا جاتا تھا اور لڑکی کو اپنے گھر لے آتے تھے۔ جہیز کی کون سوچتا، ان بے چاری لڑکیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑوں کا تھا۔

میری شادی جس گھر میں ہوتی وہ مقامی لوگ تھے۔ مقامی ہونے کے باوجود شادی اس وجہ سے بھی سادگی سے کی گئی تھی کہ وہ وقت ڈھول باجے بجانے کے لئے مناسب نہیں تھا اور فضول خرچی بھی بُری لگتی تھی۔ لوگوں

میں قومی جذبہ ابھی تازہ تھا۔ اپنے ساتھ مہاجرین کو دیکھ کر مقامی لوگ فضول خرچی نہیں کرتے تھے۔

مَیں نے عروسی کی رات پہلی بار دُلہن کو دیکھا تو میں اپنی قسمت پر حیران رہ گیا۔ وہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی جتنی مجھے میری ماں اور بہنوں نے بتائی تھی۔ مَیں نے اُس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ مجھے ایسی اُمید نہیں تھی کہ وہ پہلی ملاقات میں ہی میرے ساتھ بے تکلفی سے باتیں شروع کر دے گی۔ شرم اور حجاب بالکل قدرتی تھا اور اپنے ماں باپ کی جدائی کا افسوس بھی قدرتی تھا لیکن میں نے پہلی ملاقات میں ہی محسوس کیا کہ لڑکی پر خوف چھایا ہُوا ہے یا وہ میری رفاقت کو قبول نہیں کر رہی۔ اُس نے ہر وہ حرکت کی جو نئی دُلہنیں کیا کرتی ہیں۔ مَیں نے پہلی رات اُس کے ان مظاہروں کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔

دوسرے دن ولیمہ ہونا چاہیئے تھا لیکن محلّے کے بزرگوں نے کہا کہ ولیمہ نہ کرو کیونکہ اس کا مہاجرین پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ مہاجرین میں بڑے اچھے اور خوشحال گھرانے بھی تھے جو لُٹ لُٹا کر آئے اور بھکاری بن چکے تھے۔ اگر ہم ولیمہ کرتے تو جو مہاجرین ہمارے محلّے میں اردگرد بیٹھے ہوتے تھے وہ ترسی ہوئی نظروں سے دیکھتے۔ میں اپنی دُلہن کو ساتھ لے کر اُس کے والدین کے گھر گیا اور دوسرے روز ہم واپس آئے۔

اس طرح ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز ہُوا۔ سات آٹھ دِنوں تک میری بیوی کو میرے ساتھ اور میری ماں کے ساتھ بے تکلف ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن وہ زیادہ وقت خاموش رہتی تھی اور ایسے بھی ہوتا تھا کہ اُسے میں نے یا میری ماں یا کسی بہن نے بلایا تو وہ اس طرح بدک گئی جیسے سوتے ہُوتے آدمی کو زور سے جھنجھوڑا جاتا ہے اور وہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھتا ہے۔ اس سے مَیں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ لڑکی کسی خیال یا تصوّر میں گم ہو جاتی ہے اور گُم بھی ایسی ہوتی ہے جیسے نیند میں خواب دیکھا جاتا ہے۔

میں یہ سمجھا کہ ابھی نو عمر ہے اس لئے اس کے ذہن نے اپنی زندگی
کی اس اتنی بڑی تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا، لیکن اُس کی حالت سُدھرنے
کی بجائے بگڑتی گئی۔ یہ مَیں نے شادی کی نویں یا دسویں رات دیکھا کہ ہم دونوں
اپنے کمرے میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اچانک میری بیوی نے چیخ
ماری۔ یہ چیخ اتنی کرخت اور بلند تھی کہ مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے ایک تیر آیا
اور میرے سینے سے پار ہو گیا ہو۔ مَیں نے گیند کی طرح اُچھل کر بتی جلائی۔ میری
بیوی بستر پر بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے دونوں بازو اپنے چہرے پر رکھے ہوئے
تھے اور اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر اُس نے تڑپنا شروع کر دیا اور اُس
کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ـــــ "وہ اِدھر آ رہے ہیں۔ مجھے مار ڈالیں گے
.... مجھے کھا جائیں گے"۔

مَیں نے اُسے جھنجھوڑا۔

"چھوڑو مجھے" ـــــ اُس نے مجھ سے پرے ہٹتے ہُوئے کہا ـــــ "خُدا
کے لئے مجھے چھوڑ دو"۔

"کیا ہُوا سُلطانہ!" ـــــ مَیں نے اُس کی بغل کے نیچے ہاتھ رکھ کر اپنی
طرف گھسیٹتے ہوئے پوچھا ـــــ "خواب میں ڈر گئی ہو؟"

وہ رضائی میں چھُپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔
اُس کا چہرہ ایک خوبصورت چہرہ تھا لیکن اُس کے چہرے پر خوف کے ایسے
آثار آ گئے تھے کہ مجھے اُس کے چہرے سے ڈر آنے لگا۔ اُس کی آنکھیں گہری
لال کلیجی کے ٹکڑوں کی طرح ہو گئی تھیں۔ اُس کا مُنہ کچھ کھُلا ہُوا تھا اور میں
اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا کہ اُس کا چہرہ کتنا اور کس طرح بھیانک ہو گیا تھا۔

مجھے یہ خیال آیا کہ یہ خواب میں نہیں ڈری بلکہ اسے کوئی آسیبی دَورہ پڑ گیا
ہے۔ مَیں اپنی ماں کو بلا لانے کے لئے چلا تو میری بیوی کی آواز سنائی دی۔

"مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں"۔

میں اُس کی طرف مُڑا تو وہ گولی کی طرح پلنگ سے اُتری اور میرے

ساتھ لپٹ گئی۔ جب اُس کا جسم میرے ساتھ لگا تب میں نے محسوس کیا
کہ یہ کتنی زیادہ کانپ رہی ہے۔ مَیں نے اُسے پلنگ پر بٹھایا اور رضائی اُوپر
کر دی۔ اُس نے مجھے بھی گھسیٹ کر اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا لیا۔ پھر میری
آغوش میں ڈرے ہُوئے بچے کی طرح پناہ لینے لگی۔

باقی رات اسی طرح گزر گئی۔ وہ بہت دیر بعد اپنی اصلی حالت پر آئی۔
مَیں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے یہی بتایا کہ بڑا خوفناک خواب دیکھا تھا۔
مَیں اُس سے پوچھتا تھا کہ خواب کیا تھا۔ میں اس لئے چاہتا تھا کہ وہ اپنا خواب
بیان کرے کہ اس طرح جس سے وہ ڈر گئی تھی وہ اس کے سامنے آئے گا
تو اس کے دل سے خوف اُتر جائے گا، لیکن وہ بتا نہیں رہی تھی۔ مَیں
خاموش ہو گیا۔

یہ تو اُس کے خوفزدہ ہونے کا قصہ تھا لیکن گھر میں اُس کا برتاؤ ٹھیک
نہیں تھا۔ میری بہنوں کے ساتھ بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ میں سچ کہہ
رہا ہوں کہ میری ماں اُسے دلی طور پر چاہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکلوتا
بیٹا تھا۔ اسی وجہ سے میری دونوں بہنیں اُس سے پیار کرتی تھیں کہ میں اُن
کا ایک ہی بھائی تھا۔ والد صاحب فوت ہو چکے تھے اس لئے بہنوں سے چھوٹا
ہونے کے باوجود میں گھر میں بڑا تھا۔

ایک دو مہینے اور گزر گئے۔ اس دوران چھ سات دفعہ رات کو سوتے
سوتے وہ چیخ مار کر جاگی اور بیٹھ گئی۔ اب اُس کی چیخ بہت اونچی نہیں ہوتی
تھی، لیکن خوف ہر بار ایک جیسا ہوتا تھا۔ اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ ہر بار
نکلتے تھے کہ وہ مجھے کھا جائیں گے۔ ایک بار اُس نے یہ الفاظ بھی کہے ـــــ
"مجھے چھوڑ دو۔ مَیں اپنی جان خود لے لوں گی" ـــــ وہ کانپتی تھی اور سر میری
آغوش میں چھپاتی تھی۔

اس خوفزدگی کے دَورے کو برداشت کیا جا سکتا تھا، لیکن گھر کے ہر
فرد کے ساتھ اُس کا جو سلوک اور برتاؤ ہوتا تھا وہ مشکوک تھا۔ اُسے کوئی بھی
عقلمند آدمی دیکھتا تو یہی کہتا کہ اس لڑکی کو اس گھر کے ساتھ اور اس گھر کے کسی

بھی فرد کے ساتھ دلچسپی نہیں۔ گھر کے روزمرّہ کے کام کاج میں وہ دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ بیوی کی حیثیت سے میری ہر ضرورت پوری کرتی تھی لیکن اس طرح جیسے وہ مجبور ہو کر وہ فرض ادا کر رہی ہو جو اُس پر مسلط کر دیا گیا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ دلی طور پر ساتھ نہیں دیتی تھی۔

میں ذرا سا واضح کر دیتا ہوں۔ مثلاً میری والدہ نے اُسے کہا، سلطانہ بیٹی! ذرا آٹا تو گوندھ دو۔ وہ خاموشی سے باورچی خانے میں گئی اور آٹا گوندھ کر نکل آئی۔ ایسے ہی کبھی میں نے اُسے کمرے میں چلنے کو کہا تو وہ خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔ وہ لڑتی جھگڑتی بھی نہیں تھی کہ ہم کہتے کہ اُس میں کوئی جان ہے یا جذبات ہیں۔ سارے واقعات اور اتنی زیادہ باتیں سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں مختصراً بتا رہا ہوں کہ اُس کا انداز کیا تھا۔

دو تین مہینے اور گزرے تو رات کو اُس کا ڈر کر جاگ اُٹھنا جاری رہا۔ سات آٹھ دنوں کا وقفہ پڑتا تھا، لیکن اُس کا جو برتاؤ مشکوک سا تھا اُس پر ہمیں پختہ شک ہونے لگا۔ میں تو اپنے آپ کو یہ یقین دلانے لگا کہ میں اس لڑکی کی پسند کا خاوند نہیں ہوں۔ اگر اُس نے مجھے قبول نہیں کیا تھا تو یہ اُس کا حق تھا۔ وجہ صاف تھی۔ اُس کا رنگ گورا تھا، میں سانولے رنگ کا تھا۔ ویسے بھی وہ اتنی زیادہ خوبصورت تھی کہ میں اُس کے قابل نہیں تھا۔ مجھ میں بس اتنی سی خوبیاں تھیں کہ میں ایک تندرست مرد تھا اور میں اتنے پیسے کما لیتا تھا جس سے گھر میں خوشحالی اور فارغ البالی تھی۔ میری دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اس شہر میں تھیں اور قریب ہی رہتی تھیں اس لئے ہفتے میں ایک دو چکر اُن کے لگ ہی جاتے تھے۔ وہ بھی میری بیوی کے سلوک اور بے رُخی کی وجہ سے پریشان رہتی تھیں۔

"سلطانہ!" — میں نے ایک رات بڑے دُکھ سے اُس سے پُوچھا — "اگر تمہاری شادی تمہارے والدین نے زبردستی میرے ساتھ کر دی ہے تو بتا دو۔ خدا کی قسم! پوری عزت کے ساتھ تمہیں آزاد کر دوں گا اور تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ اگر میں تمہاری کوئی ضرورت جسمانی،

جذباتی یا کوئی اور ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں ہوں تو وہ بھی بتا دو۔ میں نے یہ تو دل کو سمجھا لیا ہے کہ میں تمہارے قابل نہیں۔ تم واقعی بڑی حسین لڑکی ہو اور میں تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔"

اُس کا سر جُھکا ہُوا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ میں بول رہا تھا اور اُس کا سر نہایت آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔ آخر اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھ میں پکڑ لیا اور اُسے دبانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنی زبان سے کچھ کہے، لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ یہی اُس میں خرابی تھی کہ وہ بولتی نہیں تھی۔

اُس کا رات کو ڈر کر جاگ اُٹھنا پہلے سے زیادہ ہو گیا اور دن کے وقت میرے ساتھ اور میری ماں کے ساتھ اُس کا رویّہ ایسا ہو گیا جس میں بے رُخی صاف پتہ لگتی تھی۔ میں نے ایک روز محسوس کیا کہ میری ماں کے لئے اُس کا یہ رویّہ ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اگر میری ماں اُن ساسوں کی طرح ہوتی جس طرح کہ ساسیں ہوتی ہیں تو اُس کے لئے کوئی مشکل نہیں تھی لیکن وہ ابھی ماں کا رول ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے ایک کارروائی یہ کی کہ ایک بزرگ کے پاس چلی گئی جو آسیب، سایہ وغیرہ رفع کرنے میں شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے تعویذ دیئے۔ ایک تعویذ پانی میں گھول کر پلانا تھا۔ دوسرا کورے کپڑے میں سی کر اُونچی جگہ رکھنا تھا اور تیسرا میری بیوی کے گلے یا بازو کے ساتھ باندھنا تھا۔

"انہوں نے کہا ہے کہ لڑکی پر ایک سایہ ہے" — میری والدہ نے اس بزرگ کی تشخیص مجھے یوں سنائی — "ٹھیک ہو جائے گی لیکن بہت وقت لگے گا۔"

میں اس قسم کے بزرگوں کو مانتا تھا۔ ایک روز میں کسی کو بتائے بغیر اُن کے پاس چلا گیا۔ اُنہوں نے میری بات سُنی اور یہ بھی سُنا کہ میری بیوی کا رویّہ کیا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے آنکھیں بند کر لیں پھر تسبیح اپنے سامنے رکھ کے

دونوں ہاتھوں سے کھینچی اور تسبیح کے دانوں کو اِدھر اُدھر کیا پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر تسبیح رکھ دی۔

"لڑکی کا دل یہاں نہیں ہے"۔۔۔ بزرگ نے فیصلہ دینے کے لہجے میں کہا ۔۔۔"دل لگ جائے گا، لیکن ذرا مشکل سے۔"

"مجھے صرف یہ بتائیں سرکار!"۔۔۔ مَیں نے پوچھا ۔۔۔"کیا وہ کسی اور کو چاہتی ہے؟"

"یہ بھی بتا دیں گے"۔۔۔ انہوں نے کہا ۔۔۔"مجھے کچھ کر لینے دو۔ ابھی اُس کا دل یہاں نہیں آیا ۔۔۔ کالے بکرے کی سری اور کالے پائے پورے چار کسی روز لے آنا۔ اس کے ساتھ دس روپے نقد اور چار آنے الگ لے آنا۔ یہ خیال رکھنا کہ سری اور پائے اچھے تندرست بکرے کے ہوں۔ ویسے ہی کسی کمزور بکرے کے نہ اُٹھا لانا۔"

دو تین روز بعد میں یہ چیزیں اور پیسے اُس بزرگ کو دے آیا۔ انہوں نے دو روز بعد بلایا۔ میں گیا تو اُنہوں نے شک مزید پختہ کر دیا۔

"یہ نیت لڑکی کی اپنی نہیں"۔۔۔ اُنہوں نے کہا ۔۔۔"اس پر سایہ جو ہے وہ بہت منحوس اور بہت بُرے اثر والا ہے۔"

بزرگ نے مجھے ایک وظیفہ بتایا جو چالیس روز کرنا تھا اور اس کے بعد دو ٹونے بتاتے۔ مَیں نے یہ سب کئے لیکن سب بیکار ثابت ہوتے۔ مَیں اتنا تنگ آ گیا کہ ایک روز اُس کے والدین کے پاس چلا گیا اور اُنہیں بتایا کہ اُن کی بیٹی کا رویہ کیا ہے۔

"خواب میں تو وہ یہاں بھی ڈرتی تھی"۔۔۔ میرے سُسر نے کہا ۔۔۔"اور وہ زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہیں۔ میں اُسے کیا سمجھاؤں گا۔ وہ نیت کی بُری نہیں۔"

"بڑے چچا جان!"۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔"اگر یہ صرف میرا معاملہ ہوتا تو میں آپ کو پریشان نہ کرتا۔ میں اپنی والدہ کو پریشان ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ بیوہ ہیں اور یہ میرا اور میری بیوی کا فرض ہے کہ اُنہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیں۔ اگر

آپ سلطانہ کو کچھ کہیں سُنیں تو میں اُس کو آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔"

"ہاں ہاں"۔۔۔ میرے سُسر نے بخوشی کہا ۔۔۔"آج ہی اُسے چھوڑ جاؤ۔ دو تین روز بعد اُسے لے جانا۔"

مَیں نے ایسا ہی کیا اور تیسرے روز اُسے لے آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری بیوی کا رویہ ایسا تھا جیسے میں اُسے اُس کے ماں باپ کے گھر لے ہی نہیں گیا تھا اور جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ اُس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ آئی۔

آپ مرد کی نفسیات کو سمجھتے ہوں گے۔ بیوی اپنے خاوند کو یا کوئی عورت کسی آدمی کو یہ کہہ دے کہ تجھے میں اپنے قابل نہیں سمجھتی تو وہ آدمی بدصورت ہی ہو اور جسمانی لحاظ سے کمزور ہی ہو، وہ مرنے مارنے پر اتر آتا ہے اور اگر اُس میں یہ جرأت نہ ہو تو خودکشی کی کوشش بھی کر گزرتا ہے۔ میری بیوی نے مجھے ایسے الفاظ نہیں کہے تھے لیکن اُس کا رویہ اتنا زیادہ بے رُخی والا ہو گیا تھا کہ اُسے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی کہ میں اُس کے قابل نہیں۔ ہم نے پورا ایک سال اُسے برداشت کیا۔ آخر ایک روز میری والدہ پھٹ پڑی اور اُس نے میری بیوی کو بہت ناگوار باتیں کہہ دیں۔

میری بیوی کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ کچھ بھی نہ بولی اور کمرے میں جا کر بیٹھ گئی اور روتی رہی۔

میری اس بپتا کی باقی تفصیلات ایک ہی جیسی ہیں۔ سارے واقعات سنانے کی ضرورت نہیں۔ تین بزرگوں کے تعویذ اور ٹونے اور وظیفے بیکار ہو چکے تھے۔ میری ماں کا پیار اور خلوص اور میری بہنوں کا پیار اور خلوص بھی رائیگاں گیا تھا۔ میں نے اُس کی منتیں بھی کی تھیں۔ ایک رات اُس کے سامنے میرے آنسو بھی نکل آئے تھے اور پھر میں نے اُسے ڈانٹا بھی تھا۔ ایسے معلوم ہونے لگا تھا جیسے ہم گھر کے چاروں فرد ایک چٹان کے ساتھ ٹکریں مار رہے ہیں۔

چار مہینے اور گذرے تو میری والدہ نے مجھے کہا ایک کوشش رہ گئی ہے وہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ بچہ ہونے کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

محلے کے لوگ عجیب کہانیاں گھڑ رہے تھے۔

میں نے اپنے دوستوں کے مشورے پر ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر سے وقت لیا اور بیوی کو اس کے پاس لے گیا۔ اس وقت ڈاکٹروں کے پاس مریضوں کا ہجوم نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ ہر مریض کو پوری تسلی سے دیکھتے تھے۔ ڈاکٹروں میں خلوص بھی تھا اور ہمدردی بھی۔

"دیکھو میاں!"۔۔۔ سپیشلسٹ ڈاکٹر نے مجھے کہا ۔۔۔"کیوں پریشان ہوتے ہو؟ میں نے تمہیں باہر بھیج کر تمہاری بیوی سے بہت سی باتیں پوچھی ہیں۔ اس میں کوئی دماغی خرابی نہیں نہ ہی یہ ذہنی مریضہ ہے اس پر ایک سال گزر جانے کے بعد بھی شادی کا خوف طاری ہے۔ اس کے ساتھ پیار و محبت جاری رکھو اور یہ جو کچھ بھی کرتی ہے وہ برداشت کرتے رہو۔ کچھ عرصے کے بعد یہ حقیقت کو قبول کر لے گی۔ میں کوئی دوائی نہیں دوں گا جو اس کے ذہن کو سلا دے۔ اسے سلانا نہیں بلکہ بیدار کرنا ہے۔"

میں نے اس سپیشلسٹ کو اپنا یہ مسئلہ بھی بتایا تھا کہ سوا سال گذر جانے کے بعد بھی بچہ پیدا ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ ڈاکٹر نے ایک لیڈی ڈاکٹر کا نام پتہ بتا کر اپنے پیڈ پر چٹھی لکھ دی۔ اس معمر لیڈی ڈاکٹر نے میری بیوی کا معائنہ کیا اور کچھ باتیں پوچھیں۔ یہ بھی ایک مخلص ڈاکٹر تھی۔ اس نے مجھے میڈیکل سائنس کی اصطلاحوں میں سمجھایا کہ لڑکی پر خوف کا قبضہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کا جسم بیوی کا رول ادا کر ہی نہیں رہا۔ یہ بچے کی پیدائش کو قبول نہیں کر رہی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی دوسرے ڈاکٹر کی طرح کہا کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک جاری رکھا جائے تاکہ اس کے ذہن سے خوف نکل جائے۔

یہ تشخیص مان لینے کے باوجود میری بیوی کا رویہ ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی والدہ کو بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر نے بچے کے متعلق کیا بتایا ہے تو والدہ نے اسی وقت فیصلہ کر دیا۔

"تو ابھی بچہ ہے"۔۔۔ والدہ نے مجھے کہا ۔۔۔"یہ لیڈی ڈاکٹر کہتی شریف زادی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ لڑکی بچہ پیدا کرنے کے قابل

نہیں۔ اس نے تجھے دکھی نہیں کیا۔ اس نے تیرا دل رکھنے کے لئے یہی بات اس طرح کی ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک جاری رکھو۔ پھر اللہ پہ چھوڑ دو کہ کچھ ہوتا ہے یا نہیں۔"

میری والدہ اور دونوں بہنوں نے مجھے تیار کر لیا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ مجھے آمادہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اس سے کہیں زیادہ تنگ آ چکا تھا جتنا میں نے ظاہر کیا ہے۔ میں اب یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ لڑکی میری بے عزتی کر رہی ہے۔ میں نے ایک رات سلطانہ کو اپنے پاس بٹھایا۔

"میں اپنی زندگی اس طرح نہیں گذار سکتا"۔۔۔ میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا ۔۔۔"میں خود صدمے برداشت کر لوں گا لیکن اپنی ماں کو یہ دکھ نہیں دیتا چلا جاؤں گا کہ میری بیوی اسے دن رات پریشان کرتی رہے۔"

میری بیوی نے جھٹکے سے اپنا سر اوپر کیا اور میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔

"میں زیادہ باتیں نہیں کروں گا سلطانہ!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔"میں صبح تمہیں تمہارے والدین کے پاس چھوڑ آؤں گا۔ پورا حق مہر ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ جو مانگو گی دوں گا اور تحریری طلاق لکھ دوں گا۔"

اس نے بجلی کی سی تیزی سے میرے پاؤں پکڑ لئے پھر سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔

"نہیں"۔۔۔ اس نے سر اٹھا کر کہا ۔۔۔"ایسا نہیں ہو گا۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

"تم نے میرے گھر کو اپنا ٹھکانہ سمجھا ہی کب تھا!"۔۔۔ میں نے کہا۔

وہ چونکہ بولنے کی عادی نہیں تھی، اس لئے چپ چاپ، حیران اور پریشان میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔

"کچھ بولو سلطانہ!"۔۔۔ میں نے اکتاہٹ کے لہجے میں کہا ۔۔۔"کچھ تو کہو۔ میں تمہیں طلاق نہیں دینا چاہتا لیکن تم نے مجبور کر دیا ہے۔"

"ایک بات بتائیں"— اُس نے رُک رُک کر پوچھا —"کوئی انسان قرآن کی قسم توڑ دے تو وہ کوڑھی ہو جاتے گا؟"

"کیا کہہ رہی ہو؟"— میں نے کہا —"کس قسم کی بات کر رہی ہو؟ سیدھی بات کرو۔ یہ ہماری ازدواجی زندگی کی آخری رات ہے۔ دل میں جو چھپا رکھا ہے وہ میرے آگے رکھ دو۔"

"میں نے ایک قسم کھائی تھی"— اُس نے کہا —"میں وہ توڑنے سے ڈرتی ہوں۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ"— میں نے کہا —"کہ یہ کیسی قسم ہے؟ میں علماء سے فتویٰ لے لوں گا۔ تمہیں انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا۔"

"پھر میری پوری بات سُن لیں"— اُس نے کہا —"میں اس باپ کی بیٹی نہیں اور یہ عورت جو اس شخص کی بیوی ہے میری ماں نہیں .... میں اِدھر کی رہنے والی ہی نہیں۔ میں اُدھر سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ مجھ سے قرآن مجید پر قسم لی گئی تھی کہ میں اسے راز میں رکھوں گی۔ بس یہ ہے میری قسم جو میں نے آج توڑ دی ہے۔"

میں نے اپنی عقل اور دلیل بازی سے اُسے سمجھایا کہ اس قسم کی قسم توڑنے سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اس سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہو گا اور دوسرے یہ کہ وہ میری بیوی ہے اور بیوی کو اپنے خاوند سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیئے۔

بات تو کھل چکی تھی۔ اب تفصیل سُننی باقی تھی۔ میری بیوی نے جو تفصیل سنائی وہ میں اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔ یہ لڑکی جالندھر چھاؤنی کے علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس کے والد معراج الدین کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے اور وہ مسلم لیگ کے اُن ورکروں میں سے تھے جو اپنا تن من دھن لگا کر کام کیا کرتے ہیں، لیکن رہتے گمنام ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ براہِ راست ٹکر لینے والے آدمی تھے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں اُنہوں نے اس انداز سے کام کیا تھا کہ اُس حلقے کے ہندو اور سکھ اُن کے دُشمن ہو گئے تھے۔ پھر اُن کی

کوششیں کامیاب ہوئیں اور جُون ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔

میں بڑی لمبی بات کو مختصر کر رہا ہوں۔ ہندوؤں اور سکھوں نے جُون کے مہینے میں ہی معراج الدین کو قتل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ایک کوشش کے کامیاب ہونے میں بال برابر فرق رہ گیا تھا۔ یہ ایک ہندو کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی تھی جو معراج الدین کے جسم کے ساتھ لگتی ہوئی گزر گئی تھی۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل اور اُن کے گھروں کی لُوٹ مار کے واقعات شروع ہو گئے تھے لیکن مسلمانوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ قیامت ابھی آنے والی ہے۔ سلطانہ کے والد معراج الدین قاتلانہ حملوں کے باوجود جالندھر میں سینہ تان کر پھرتے رہے۔ وہ تقسیمِ ہند کے فاتحین میں سے تھے۔ اُن کے صرف قریبی دوست جانتے تھے کہ اُنہوں نے پاکستان کے حصول کے لئے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں اور اپنے آپ کو کیسے کیسے خطروں میں ڈالا ہے۔

پھر وہ قیامت ٹوٹ پڑی جو خاک و خون کا طوفان تھا۔ ہر طرف آگ کے شعلے اور خون کے چھینٹے تھے۔ شعلوں میں مسلمانوں کی املاک جل رہی تھیں اور چھینٹے مسلمانوں کے خون کے تھے۔ صرف "حکایت" ایک پرچہ ہے جس میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتلِ عام اور تباہی کے واقعات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک باب ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ باب اپنے بچوں کو زبانی یاد کرا دیں۔

جالندھر کے ہندوؤں نے پورے اہتمام کے ساتھ معراج الدین کے گھر پر حملہ کیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ کچھ روز پہلے ہندوؤں نے معراج الدین کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ اُس کی بیٹی کو یعنی سلطانہ کو اغوا کر لیں گے۔ معراج الدین کو صرف یہ ایک غم تھا کہ اپنی بیٹی کو کس طرح بچا کر پاکستان لے جائے گا۔

حملے سے ایک دو روز پہلے معراج الدین نے سُلطانہ کو اور دو اور آدمیوں نے اپنی جوان بیٹیوں کو ایک ایسے گھر میں بھیج دیا تھا جہاں مرد زیادہ تھے۔ جگہ تو کوئی بھی محفوظ نہیں تھی۔ مسلمانوں کے لئے وہاں کوئی پناہ نہیں تھی۔ پھر

وہ وقت بھی آیا کہ معصوم بچوں کو اپنی ماؤں کی گودیوں میں بھی پناہ نہ ملی۔ رات ہی رات معراج الدین کے گھر کا صفایا ہو گیا۔ معراج الدین تمام کنبے سمیت شہید ہو گیا سوائے سلطانہ کے۔

مسلمان وہاں سے بھاگنے لگے۔ سلطانہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ چھ سات مردوں کی حفاظت میں رات کے وقت وہاں سے نکلی اور یہ چھوٹا سا قافلہ صبح تک جالندھر سے بہت دُور آ گیا۔ رات نے جب اپنا تاریک پردہ اُٹھا دیا تو ہر طرف موت کے قہقہے تھے۔ مشرقی پنجاب کے لہلہاتے کھیت جو بہت ہی خوبصورت لگا کرتے تھے اب مسلمانوں کے دشمن ہو گئے تھے۔ فصل کے اندر جو چھپتا تھا وہ بھی سکھوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔ ارد گرد تک جو بھی گاؤں نظر آتا تھا وہاں سے جلتے مکانوں کا دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلطانہ جس کی عمر اُس وقت پندرہ سال تھی کس قدر خوفزدہ ہوئی ہو گی۔ اگر وہ خوف سے ہی مر جاتی تو یہ عین قدرتی تھا۔ وہ تین چار سال بعد مجھے اُس وقت کی داستان سُنا رہی تھی تو بھی وہ کانپنے لگی تھی اور سرک کر میرے قریب ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر سی جاتی تھیں جیسے وہ منظر اُسے نظر آ رہا ہو۔

ان لڑکیوں کو اپنے مردوں کی حفاظت حاصل تھی۔ شام کو وہ بھی نہ رہی۔ اچانک سکھوں کا ایک جتھہ سا سامنے آ گیا اور وہ ان پر ٹوٹ پڑا۔ اُس جگہ کھڈ بھی تھے جن میں بعض کھڈ گہرے اور لمبائی میں دُور تک چلے گئے تھے۔ سلطانہ سکھوں کو دیکھتے ہی ایک دو قدم پیچھے ہٹی اور کھڈ میں گر پڑی۔ اُسے لاٹھیاں، کلہاڑیاں، کرپانیں اور برچھیاں ٹکرانے کی آوازیں اور لڑکیوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ وہ خود کھڈ کے نیچے نیچے وہاں سے دُور نکل گئی۔ اُس نے مجھے سنایا کہ وہ اپنے زور پر یا اپنی ہمت سے نہیں دوڑ رہی تھی۔ یہ خدا کا ہاتھ تھا جو اُسے آگے ہی آگے دھکیلتا جا رہا تھا۔

یہ لمبوترا کھڈ آگے جا کر خشک اور تنگ سا نالہ بن گیا تھا۔ رات آ گئی تھی۔ سلطانہ کے بچ نکلنے میں اس رات کی تاریکی کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ سلطانہ یہاں سے آگے سنانے لگی تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے اُسے ڈرے ہوئے بچے

کی طرح اپنے بازوؤں میں لے کر اپنی پناہ میں لے لیا۔ میں نے اُسے روک دیا۔ اُس کے باقی سفر کی تفصیل چار پانچ سال بعد سُنی تھی۔ وہ یُوں تھی کہ وہ غشی کی حالت میں چلتی رہی، چھپتی رہی۔ مختصر یہ کہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتی چھپتی چھپاتی اُس طرف جا نکلی جدھر گنڈا سنگھ والا کی طرف آنے والے قافلے آ رہے تھے۔ اُس کے پاؤں سُوج گئے تھے۔ پنڈلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ خاردار جھاڑیوں کے کانٹوں نے اُسے زخمی کر دیا تھا۔

اُسے والٹن کے ریفیوجی کیمپ میں ہوش آئی۔ اُسے کچھ کھلایا پلایا گیا۔ وہاں اُس جیسی لڑکیاں بھی تھیں جو پناہ گزین لڑکیوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ یہ لاہور کے سکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں تھیں۔ ان کے ساتھ کالجوں کے لڑکے بھی تھے جنہوں نے سلطانہ اور اُس جیسی سینکڑوں لڑکیوں اور بڑی عمر کی مستورات کو اپنے سگے عزیزوں کی طرح سنبھالا۔

سلطانہ پوری طرح ہوش میں آتی تو اُسے یاد آنے لگا کہ راستے میں اُسے کیسے کیسے بھیانک منظر نظر آتے تھے۔

معصوم بچوں کی کٹی ہوئی لاشیں، جوان عورتوں کی برہنہ لاشیں، ہر عمر کے آدمیوں کی لاشیں، بکھرے ہوئے کپڑے، جوتے اور ایسی ہی بے شمار چیزیں۔ اُسے یاد آنے لگا کہ پاکستان نے قوم سے کتنی بڑی قیمت وصول کی ہے۔

سلطانہ اکیلی رہ گئی تھی۔ راتوں کو ڈرنا اور چیخیں مارنا وہیں کیمپ میں شروع ہو گیا تھا۔ اُس کی بارک میں جو مہاجر رہتے تھے وہ اُسے سنبھال لیتے تھے۔ پھر مہاجرین وہاں سے بکھرنے لگے۔ جس کسی کو سر چھپانے کی کہیں جگہ مل جاتی تھی وہ کیمپ سے چلا جاتا تھا۔ جن کا کوئی وسیلہ نہیں تھا وہ بے چارے کیمپوں میں پڑے رہے۔ کچھ اور عرصہ گزرا تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ کوئی آدمی کیمپ میں آتا اور اس قسم کی درخواست کرتا کہ اگر کیمپ میں کوئی جوان لاوارث لڑکی ہو تو وہ اُسے دے دی جاتے جسے وہ اپنی بیٹی بنا کر پالے گا۔

کیمپوں میں ایسی لاوارث لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ اچھی قسم کے لوگوں کے حوالے کی گئیں۔ اس سلسلے میں کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں مثلاً یہ کہ بعض غلط

قسم کے لوگ شرفا کے بھیس میں لڑکیوں کو غلط مقاصد کے لئے لے گئے اور اُنہیں خراب کیا۔ یہ تفصیلات بڑی دردناک اور شرمناک ہیں۔ مَیں یہ بیان نہیں کروں گا۔ مَیں آپ کو اپنی بیوی سلطانہ مرحومہ کی بات سناؤں گا۔

ریفیوجی کیمپ میں سلطانہ ایک غریب سے کُنبے کے ساتھ پڑی رہی۔ اُس کی دولت اُس کی عصمت تھی جسے وہ سرحد پار سے بچا کر لائی تھی۔ وہ دن رات روتی اور دل ہی دل میں فریادیں کرتی رہتی تھی۔ ایک روز اُس سے پوچھا گیا کہ اُسے ایک شریف آدمی کے حوالے کر دیا جائے تو اُسے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ اُسے یقین دلایا گیا کہ وہ ایک باعزّت گھر میں رہے گی اور ایسے ہی ایک اچھے گھر میں اُس کی شادی کی جائے گی۔

سلطانہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اُس کا دماغ سوچنے کے قابل رہا ہی نہیں تھا۔ اُس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس طرح وہ اس آدمی کے ساتھ آگئی جو میرا سُسر بنا۔

"مَیں جب اُس گھر میں گئی تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خدا نے میری فریادیں سُن لی ہیں"۔۔۔ سلطانہ نے مجھے اُس وقت کی داستان سناتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ "اس گھر میں ایک تو یہ صاحب تھے جنہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنایا تھا اور ان کی بیوی تھیں جنہیں مَیں نے امّی کہنا شروع کر دیا۔ آپ نے اس گھر کو اچھی طرح دیکھا۔ کتنا اچھا گھر ہے۔ ہر چیز اور ہر آسائش موجود ہے۔ مجھے تو صرف پیار اور پناہ کی ضرورت تھی۔ خدا نے مجھے دونوں چیزیں دے دیں"۔

ان میاں بیوی نے سلطانہ کو بہت پیار دیا اور صحیح معنوں میں اپنی بیٹی بنا لیا۔ دراصل سلطانہ نے اُن کی ایک ضرورت پوری کر دی تھی۔ وہ یہ کہ وہ بے اولاد تھے۔ ان کی عمریں چالیس سال سے اُوپر ہو گئی تھیں۔

سلطانہ نے اس گھر میں دو سال گزار دیئے۔ اس عرصے میں ڈرنے اور چیخیں مارنے کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ سلطانہ کو اپنے ماں باپ، چھوٹے اور بڑے بہن بھائی یاد آتے تھے تو وہ تڑپ اُٹھتی تھی لیکن اس گھر میں اُسے جو پیار ملتا تھا وہ اُس کے دل کے درد کو سہلا لیتا تھا۔ جس محلّے میں

وہ رہتے تھے وہاں زیادہ تر گھر ہندوؤں اور سکھوں کے تھے۔ وہ سب چلے گئے تھے۔ ان کی جگہ مہاجرین آکر آباد ہو گئے۔ اس طرح کسی کو پتہ نہ چلا کہ سلطانہ ان میاں بیوی کی سگی بیٹی نہیں۔

سلطانہ اب شادی کی عمر تک پہنچ گئی تھی لیکن اُس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی نہیں کرے گی۔ اُس نے مجھے اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ ڈرتی تھی کہ اُسے جو پیار اور خلوص یہاں مل رہا ہے وہ سُسرال میں نہیں ملے گا۔ اُس نے اپنا یہ فیصلہ اپنے دل میں چھپا کر رکھا ہُوا تھا۔ آخر ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ اُسے اس گھر سے رخصت ہونا پڑا۔

واقعہ یہ ہُوا کہ جسے اُس نے امّی بنایا تھا وہ کچھ دنوں کے لئے اپنے رشتے داروں کے گھر چلی گئی۔ اُس کے رشتہ دار اس شہر سے دُور رہتے تھے۔ گھر میں یہ آدمی رہ گیا جس نے سلطانہ کو اپنی بیٹی بنایا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ سلطانہ اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔

"سلطانہ!"۔۔۔ اُسے ہلکی سی آواز سنائی دی۔

سلطانہ کی نیند بڑی کچی تھی۔ یہ ایک نفسیاتی وجہ تھی۔ یہ خوف اُس کے ذہن میں اُتر گیا تھا کہ وہ گہری نیند سو جائے گی تو اُسے کوئی اُٹھا کر لے جائے گا۔ اُس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اُس کا یہ باپ جس نے اُسے بیٹی بنایا تھا اُس کے پلنگ کے ساتھ کھڑا تھا۔

"کیوں آباجان!"۔۔۔ سلطانہ نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔۔۔ "کچھ چاہیئے؟"

"سو گئی تھی؟"۔۔۔ اُس شخص نے پوچھا۔

"تو کیا ہُوا آباجان!"۔۔۔ سلطانہ نے پیار سے کہا۔۔۔ "بتائیں نا کیا کام ہے؟ میں کر دیتی ہوں"

اُس کے آباجان پلنگ پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر چُپ ہی رہے۔ سلطانہ ڈر گئی کہ معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ جسے وہ اپنا محافظ اور پاسبان سمجھتی ہے وہ اس قدر پریشان ہے۔

"کیا ہُوا ابّا جان؟" ـــ سُلطانہ نے پوچھا۔

"ہُوا تو کچھ نہیں سلطانہ" ـــ اُس نے کہا ـــ "میں بات کرتے اس لئے ڈرتا ہوں کہ تم مایوس کر دو گی۔"

"بیٹی اپنے باپ کو مایوس نہیں کر سکتی" ـــ سلطانہ نے کہا ـــ "آپ پر تو میں اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں۔ کچھ کہیں تو سہی۔"

"کہنا صرف یہ ہے" ـــ سلطانہ کے ابّا جان نے کہا ـــ "کہ مجھے باپ نہ کہو اور میں تمہیں بیٹی نہیں کہوں گا۔"

سلطانہ کی یہ حالت ہو گئی جیسے ایک سکھ نے اپنی برچھی اُس کے سینے میں اُتار دی ہو۔ اُس کی زبان اکڑ گئی اور کمرے کی دیواریں اُس کے ارد گرد ایک چکر میں گھومنے لگیں۔ رات کا وقت تھا، تنہائی تھی اور سلطانہ نے جسے اپنا باپ کہا تھا وہ ایک غیر مرد بن گیا تھا۔

"تم تو بہت ہی گھبرا گئی ہو سلطانہ!" ـــ اس شخص نے کہا ـــ "میں تمہیں گھر سے نکال تو نہیں رہا بلکہ پہلے سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔ اب تک بیٹی کہتا رہا ہوں پھر بیوی کہا کروں گا۔"

"نہیں!" ـــ سلطانہ نے گھبراہٹ اور خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــ "نہیں ابّا جان! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ میرے باپ ہیں۔ میں نے تو فیصلہ کر رکھا ہے کہ میں شادی کروں گی ہی نہیں۔ میں ساری عمر آپ کی اور امّی کی خدمت میں گزار دوں گی ....کیا آپ مجھے میری امّی کی سوکن بنانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں سلطانہ!" ـــ اُس نے بڑے پیار سے کہا ـــ "اُسے تو میں طلاق دے رہا ہوں .... پہلے میری پوری بات سُن لو۔ تم دیکھ رہی ہو کہ میری کوئی اولاد نہیں۔ میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہُوا کہ اولاد پیدا نہ کر سکوں۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، نقص میری بیوی میں ہے۔ میں نے آج سے تین سال پہلے جب مہاجرین آنے شروع ہوتے تھے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی جوان مہاجر لڑکی کے سا

وارث زندہ نہیں ہوگا۔ اس فیصلے میں میرے دو فائدے تھے۔ ایک تو اولاد کے لئے شادی کرنی تھی اور دوسرے یہ کہ ایک لاوارث لڑکی کو باعزّت گھرانہ مِل جانا تھا۔ یہ ایک نیکی بھی ہوتی۔ میں یہ نیکی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تمہیں یہاں لانے سے پہلے میں نے کیمپ میں گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ میری نظر تم پر جم گئی تھی پھر میں تمہیں گھر لے آیا۔ اب تم جوان ہو گئی ہو۔ میرا دل توڑ نہ دینا۔"

سلطانہ نے اپنے اُس رات کے تاثرات مجھے سناتے تو مَیں نے اپنی یہ رائے قائم کی کہ سلطانہ کے لئے یہ رات اتنی ہی خوفناک تھی جتنی وہ رات بھیانک تھی جب وہ جالندھر سے نکلی تھی اور ہر طرف موت ہی موت تھی اور انسان جو تھے وہ درندے بن گئے تھے۔ یہ رات مشرقی پنجاب کی اُس رات سے اس لئے زیادہ خوفناک تھی کہ جسے اُس نے اپنا باپ کہا تھا وہ باپ بن کر درندہ ہو گیا تھا۔ وہ درندہ اس طرح ہُوا کہ پہلے سلطانہ کو پیار اور محبت سے راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا، وہ نہ مانی تو اُسے اپنے احسان اور نیکیاں جتانے لگا۔ سلطانہ بڑی زور زور سے سر ہلا ہلا کر انکار کرتی رہی۔ اس شخص نے جب دیکھا کہ لڑکی نہیں مانتی تو وہ زبردستی پر اُتر آیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے دل سے شادی کا خیال نکل گیا ہے اور وہ سلطانہ کو ہوس کا نشانہ بنانے پر تُل گیا۔

سلطانہ پلنگ سے اُٹھ کر فرش پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس کا بناوٹی باپ اُس کی طرف لپکا تو سلطانہ نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔ یہ آدمی اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھتا تھا تو سلطانہ اُس کے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹتی تھی۔ سلطانہ باہر کو بھاگنے کے لئے کمرے کے دروازے تک گئی تو دروازے کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ یہ اُس آدمی نے چڑھائی تھی۔ سلطانہ چٹخنی کھولنے لگی تو اس شخص نے پیچھے سے اُسے پکڑ لیا۔ سلطانہ نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ اور پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔

"میں سارے محلّے کو بتاؤں گی" ـــ سلطانہ چیخ چیخ کر کہتی تھی ـــ "امّی آئے گی تو اُسے بھی بتاؤں گی۔"

دراصل یہ شخص کوئی غنڈہ اور بدمعاش نہیں تھا۔ سلطانہ اتنی خوبصورت اور بے آسرا تھی کہ یہ شخص اپنی عمر اور اپنی شرافت کو بھلا بیٹھا۔ اولاد کی خواہش بھی بجا تھی لیکن سلطانہ اُسے خاوند کے روپ میں قبول کر ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ آدمی سلطانہ کی چیخ و پکار سے ڈر گیا۔ اُس نے سلطانہ کی منّت سماجت شروع کر دی کہ وہ چُپ ہو جائے مگر وہ چُپ نہیں ہوتی تھی۔ کہتی تھی کہ مجھے اس گھر سے نکل جانے دو، میں کسی کنوئیں یا دریا میں کُود جاؤں گی۔

اُس کا یہ باپ اتنا گھبرایا کہ اُس نے سلطانہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور یہاں تک کہا کہ میں تمہارے قدموں میں سر رکھتا ہوں، مجھے معاف کر دو اور کسی کو بتانا نہیں۔

"میں تمہیں بیٹی بنا کر ہی گھر میں رکھوں گا" ـــــ اُس نے سلطانہ سے کہا۔

"میں اس طرح نہیں مانوں گی" ـــــ سلطانہ نے کہا ـــــ "قرآن مجید لے آئیں اور اللہ کے کلام پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ آپ مجھے ہمیشہ بیٹی سمجھتے رہیں گے اور یہ بھی قسم کھائیں کہ امّی کو طلاق نہیں دیں گے۔"

وہ قرآن مجید لے آیا اور بالکل اُسی طرح قسم کھائی جس طرح سلطانہ نے اُسے کہی تھی۔

"اب تم قسم کھاؤ سلطانہ!" ـــــ اُس شخص نے کہا ـــــ "قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھاؤ کہ آج رات ہمارے درمیان جو کچھ ہُوا ہے اس کا ذرا سا بھی ذکر کسی کے ساتھ نہیں کرو گی۔"

سلطانہ نے انہی الفاظ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔

میں سُنا چکا ہوں کہ سُلطانہ کے ذہن میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ وہ سوئی ہوئی ہوگی تو رات کو اُسے کوئی اُٹھا کر لے جائے گا۔ اس رات کے واقعہ سے یہ خوف پہلے سے زیادہ ہو گیا، حالانکہ اُس آدمی نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی۔ اُس کا یہ مرض پھر جاگ اُٹھا کہ رات کو خواب میں ڈر جاتی اور چیخیں مارتی ہوئی جاگ اُٹھتی تھی۔ اُسے یہ دَورہ آٹھ دس روز بعد پڑتا تھا۔ ایک وہم اُس پر سوار ہو گیا تھا کہ یہ شخص پھر بھی کبھی نہ کبھی اُس کے ساتھ دست درازی کرے گا۔

ایک روز اچانک اُسے بتایا گیا کہ اُس کی شادی کا دن مقرر کر دیا گیا ہے۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ میری ماں اور بہنیں اُس کے گھر جاتی تھیں تو اُسے پتہ ہی نہیں چلنے دیا جاتا تھا کہ یہ عورتیں اُس کے رشتے کے لئے آئی ہیں۔

پھر ایک روز میں سُلطانہ کو بیاہ لایا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی سلطانہ!" ـــــ میں نے اُس کی ساری کہانی سُن کر کہا ـــــ "مَیں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے پیار دیا ہے۔ امّی نے اور میری دونوں بہنوں نے بھی تمہارے ساتھ پیار اور محبت کی کمی نہیں رہنے دی پھر تم یہاں کیوں ڈرتی رہی ہو؟ کیا تمہیں ہم پر اعتبار نہیں تھا؟"

"میں کچھ بتا نہیں سکتی" ـــــ اُس نے بے چین ہو کر کہا ـــــ "مَیں آپ کو یہ ساری بات سنانا چاہتی تھی۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپانا تھا لیکن میں نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر جو قسم کھائی تھی اسے توڑنے سے ڈرتی تھی۔ مجھ سے قرآن مجید پر قسم لے لو، میں آپ کو دل اور روح سے چاہتی ہوں میرا کوئی علاج کروائیں اور اب مجھے یہ بتائیں کہ میں نے قرآن مجید کی قسم جو توڑی ہے یہ گناہ نہیں اور اس کی مجھے سزا نہیں ملے گی۔"

"خود سوچو سلطانہ!" ـــــ مَیں نے کہا ـــــ "تم نے یہ قسم تو نہیں کھائی تھی کہ تم کسی کو یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم مہاجر ہو اور یہ شخص تمہارا باپ نہیں .... دوسری بات یہ ہے کہ تم نے قسم توڑ کر کسی کا نقصان نہیں کیا بلکہ میری اور اپنی ازدواجی زندگی کو بچا لیا ہے ورنہ تم واپس اُس گھر میں جا کر پہلے سے زیادہ بے چین اور پریشان رہتیں، اور مَیں اور میری امّی یہاں دُکھی رہتے اور سوچتے رہتے کہ اس لڑکی کو ہمارا گھر کیوں پسند نہیں آیا۔ پھر بھی تم ڈرو نہیں میں صدقے کا ایک بکرا دے دوں گا۔"

مَیں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اب طلاق کا نام بھی نہیں لوں گا۔ یہ سُن کر اس کی جان میں جان آئی۔ مَیں نے اُس کے ساتھ جو باتیں کیں وہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ بتاؤں گا کہ اُسے مجھ پر اعتبار آ گیا۔ میں نے صبح اُٹھتے ہی اپنی ماں کو الگ بٹھا کر یہ ساری بات سنائی اور اُسے کہا کہ اب سلطانہ

جو کچھ بھی کرے اسے محسوس نہ کیا جاتے۔ میں نے یہی بات اپنی بہنوں کو بھی
بتائی۔ وہ تو پہلے ہی اُسے بڑی اچھی لڑکی سمجھتی تھیں، اب اور زیادہ اُس
کے ساتھ پیار محبت کرنے لگیں۔

سلطانہ کے رات والے ڈر کر جاگنے کے دَورے کم ہونے لگے کبھی
مہینے میں دو بار کبھی ایک بار دورہ پڑتا تھا پھر تین مہینے بعد پھر پانچ مہینے بعد
دَورہ پڑا۔ پھر یہ دورے بالکل ختم ہو گئے۔ اس میں کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا
تھا۔ آہستہ آہستہ گھر میں اُس کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی اور وہ نارمل حالت میں آ
گئی۔ اس کے بعد اُس میں پہلے بچے کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس سے یہ ہُوا کہ
وہ پوری طرح حقیقی زندگی میں آگئی۔

یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے سلطانہ کے روّیے کو کس طرح برداشت
کیا تھا۔ بہت ہی مشکل کام تھا لیکن میں جب سوچتا تھا کہ اس لڑکی کے باپ نے
پاکستان کے لئے کتنا جہاد کیا تھا اور اُس نے صرف اپنی ہی جان نہیں دی
بلکہ اُس کا پورا خاندان پاکستان کے نام پر شہید ہو گیا تھا تو میں سلطانہ کے لئے
بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد ہماری جو زندگی گزری وہ بہت ہی پُرسکون اور بڑی ہی
پیاری زندگی تھی۔ میرے بچّوں نے اس پُرسکون ماحول میں پرورش پائی ہے۔
اسی کا اثر ہے کہ آج وہ بڑی اچھی حیثیت کے مالک ہیں۔

راز اُس رات کا

ہڈیوں کا پنجر تھا جو ساون کی بارشوں نے ننگا کر دیا تھا جہاں سے کسی انسان
کی ہڈیوں کا یہ مکمل ڈھانچہ برآمد ہُوا وہ قبرستان کی جگہ نہیں تھی۔ وہ جگہ میرے
گاؤں سے سوا یا ڈیڑھ میل دُور تھی۔ لوگوں کا یہ خیال درست تھا کہ یہ ہڈیاں
جس کسی کی بھی ہیں وہ قتل ہُوا ہو گا۔ وہ جگہ بہت پرانے قبرستان کی بھی
نہیں تھی۔ قتل کا یقین اس سے بھی ہوتا تھا کہ پاؤں کی ہڈیوں پر زری جُوتی
تھی۔ کپڑوں کے ٹکڑے بھی تھے۔ یہ ٹکڑے کفن کے نہیں تھے لباس کے تھے۔
وہ دو آدمی تھے جن کو یہ ڈھانچہ نظر آیا تھا۔ ہم جو مسلمان ہیں، یہ ہمارا
وطیرہ ہے کہ آدمی زندہ ہو تو اُس کو ایک پیسے جتنی وقعت نہیں دیتے۔ وہی
آدمی میّت بن جاتا ہے تو اُس کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ان دو آدمیوں
نے ہڈیوں کے اس پنجر کو دیکھا تو انہوں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس پر یہیں مٹی
ڈال کر اُوپر قبر بنا دیں پھر نمبردار کو بتائیں اور ہڈیوں کو اُٹھا کر قبرستان میں
لے جائیں اور صحیح قبر بنا کر اس میں دفن کر دیں۔

انہوں نے میرے گاؤں کے نمبردار کو جا کر بتایا۔ نمبردار نے گاؤں
کے ایک خاندان کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہاں چلا گیا جہاں ہڈیوں کا
ڈھانچہ پڑا ہُوا تھا۔ اس خاندان کے دو آدمیوں کو ساتھ لے جانے کی وجہ یہ تھی
کہ پانچ چھ مہینے گزرے ان کا ایک جوان آدمی جس کی عمر اکیس بائیس سال تھی،
لاپتہ ہو گیا تھا۔ نمبردار کو شک ہو گیا تھا کہ یہ ہڈیاں اسی گمشدہ آدمی کی ہو سکتی
ہیں۔ اُس کو شک اس بنا پر ہُوا تھا کہ اُس کو بتایا گیا تھا کہ وہاں زری جُوتی بھی
ہے اور کھوپڑی میں جو دانت ہیں، ان میں ایک دانت سونے کا ہے۔ گمشدہ
آدمی کا بھی ایک دانت سونے کا تھا اور وہ زری جُوتی پہنا کرتا تھا۔

یہ واقعہ میری پیدائش سے بہت پہلے کا ہے، بلکہ پاکستان کی پیدائش سے بھی پہلے کا۔ میں نے جس نمبردار کا اُوپر ذکر کیا ہے وہ میرے بزرگوں میں سے ہیں۔ اب ضعیف العمر ہو گئے ہیں۔ ڈیڑھ دو مہینے پہلے میرے گاؤں کی ایک جوان لڑکی ایک آدمی کے ساتھ نازیبا حالت میں کھیتوں میں پکڑی گئی۔ اُس کا خاوند باہر کے ایک مُلک میں بسلسلۂ روزگار گیا ہُوا ہے۔ اُن کی شادی ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ لڑکی کا خاوند شادی کر کے ایک مہینہ گاؤں میں رہا اور چلا گیا۔ لڑکی پہلے بھی نیک نام نہیں تھی لیکن پہلی بار پکڑی گئی تھی۔

میں شام کو اس بزرگ کے پاس جا بیٹھا جو انگریزوں کے وقتوں میں نمبردار ہُوا کرتے تھے۔ میں اکثر اِن کے پاس بیٹھتا ہوں۔ وہ مجھے جناب صابر حسین راجپوت کی طرح اپنی جوانی کی کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔ ویسے بھی اُن کی باتیں مجھ کو بہت پسند آتی ہیں۔ ایسی باتیں کتابوں میں نہیں ملتیں۔ میں اُس شام کو اُن کے گھر گیا تو اس لڑکی کا ذکر کیا۔ گاؤں میں یہی چرچے تھے۔

”یہ خون کا اثر ہے“ —— نمبردار نے کہا —— ”لڑکی کا قصور نہیں۔ اس کے باپ کو تم جانتے ہو۔ یہ لڑکی اس باپ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔“

نمبردار نے جو کہانی سنائی وہ میں لوگوں کے اصلی نام بدل کر پیش کرتا ہوں۔

پاکستان بننے سے بہت پہلے جب ہڈیوں کا وہ ڈھانچہ جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے، بارشوں نے ننگا کر دیا تو یہ بزرگ گاؤں کے نمبردار تھے۔ میں کہانی میں انہیں کرامت نمبردار لکھوں گا۔ انہوں نے گاؤں کے گمشدہ جوان آدمی کے خاندان کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہاں چلے گئے۔

دونوں آدمیوں نے زری جُوتی، سونے کے دانت کے علاوہ دو اور نشانیاں دیکھ کر کہا کہ یہ اُن کے گمشدہ آدمی کی لاش ہے۔ وہ صرف ہڈیاں تھیں۔ کپڑے بھی کیڑوں نے اس طرح کھائے ہوئے تھے کہ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ایک نشانی یہ تھی کہ گردن کی ہڈی کے ساتھ سونے کا بنا ہُوا پان کا پتا پڑا ہُوا تھا۔ یہ اُس زمانے میں دیہاتیوں میں فیشن تھا۔ جوان آدمی جن کے پاس روپیہ پیسہ ہوتا تھا سونے کا چھوٹا سا پان کا پتا بنوا کر کالے دھاگے سے گلے میں

ڈال لیتے تھے۔

ایک نشانی اور یہ بھی دیکھی کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کے ساتھ ایک گز کے لگ بھگ ڈنڈہ پڑا ہُوا تھا۔ یہ بید کا ڈنڈہ تھا۔ اس کی موٹائی تقریباً ڈیڑھ اِنچ تھی۔ اس کے ایک سِرے پر پیتل کا خول چڑھا ہُوا تھا۔ خول کی لمبائی تقریباً ایک بالشت تھی اور اس میں سیسہ بھرا ہُوا تھا۔ یہ ڈنڈہ گمشدہ آدمی کا تھا۔ وہ جب کبھی کسی میلے پر، کسی دوسرے گاؤں یا شہر جایا کرتا تو یہ ڈنڈہ ہاتھ میں رکھتا تھا۔

ان نشانیوں سے سب نے یقینی سمجھ لیا کہ یہ لاش اسلم کی ہے۔ اُس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ اُس کی عمر اکیس بائیس سال تھی۔ پانچ چھ مہینے پہلے ایک رات وہ کسی کو بتلائے بغیر گھر سے نکلا اور اس کے بعد اُس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ تھانے میں رپورٹ ہوئی۔ تقریباً تین مہینے پولیس اُس کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

نمبرداروں کا میل جول تھانیداروں کے ساتھ رہتا تھا۔ کرامت نمبردار نے مجھ کو یہ واقعہ سناتے ہُوئے بتایا کہ تھانیدار نے تفتیش میں پوری دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ کسی پر شک ہے تو اُس کا نام لکھواؤ۔ لڑکا جوان تھا۔ اُس کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ تین مہینوں بعد تھانیدار نے معاملہ ٹھپ کر دیا۔

اب ہڈیوں کا یہ ڈھانچہ ملا تو اسلم کا باپ اور بڑا بھائی کرامت نمبردار کو ساتھ لے کر تھانے گئے۔ اُنہوں نے رپورٹ لکھوائی کہ یہ ڈھانچہ اسلم کا ہے اور اُس کو کسی دُشمن نے قتل کیا ہے۔ اُس زمانے میں تھانیدار ٹال مٹول نہیں کر سکتے تھے۔ تھانیدار اُس جگہ گیا جہاں ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہُوا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ جگہ گاؤں سے ڈیڑھ میل دُور تھی۔ وہ زمین کٹی پھٹی ہوئی تھی۔ کہیں سے اُونچی اور کہیں سے نیچی تھی۔ جس جگہ ڈھانچہ پڑا ہُوا تھا وہاں زمین زیادہ پھٹی ہوئی تھی۔ یہ لمبوترے گڑھے کی طرح تھی۔ اس طرح پتہ لگتا تھا کہ اسلم کو قتل کر کے لاش اس گڑھے میں اس طرح ڈال دی

گئی جس طرح میت کو قبر میں رکھتے ہیں۔ اُس کا ڈنڈہ بھی قاتل نے لاش کے ساتھ رکھ دیا۔

گڑھا تقریباً ایک گز گہرا تھا۔ وہ ساری زمین گہرائی میں تھی اور کچھ ڈھلانی تھی۔ بارش کا پانی سیلاب کی طرح ادھر سے گزرتا تھا۔ ساون کا موسم آیا تو تیز بارش نے اُوپر سے مٹی بہا دی اور لاش ننگی ہو گئی۔ اُس وقت تک لاش ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔

یہ بات تو تھانیدار نے بھی کہی کہ یہ قتل کی واردات ہے لیکن یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ اسلم کی ہڈیاں ہیں۔ اسلم کے باپ وغیرہ نے تھانیدار پر ایک تو زبانی زور ڈالا کہ وہ اس کو اسلم کا ڈھانچہ سمجھے اور تفتیش کرے، دوسرا دباؤ روپے پیسے کا تھا جو اُنہوں نے تھانیدار کی جھولی میں ڈالا۔ تھانیدار نے ان لوگوں کو کہا کہ وہ کسی پر شک وشُبہ کریں اور قتل کی وجہ بتائیں۔ اب تھانیدار پوری دلچسپی کے ساتھ تفتیش کر رہا تھا۔

تھانیدار کو جو شبے لکھوائے گئے ان میں ایک یہ تھا کہ برادری میں اسلم کی منگنی ایک لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی لیکن شادی کا دن مقرر کرنے لگے تو اُس نے کہہ دیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ اُس نے لڑکی کے چال چلن پر شُبہ کیا حالانکہ چال چلن خود اسلم کا خراب تھا۔ اس پر لڑکی والوں اور اسلم کے گھر کے آدمیوں کی لڑائی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں تک پہنچی تھی۔ اس کے بعد اسلم اور اُس کے گھر کی عورتیں کہتی پھرتی تھیں کہ لڑکی کا چال چلن ٹھیک نہیں۔

گاؤں والے جانتے تھے کہ چال چلن کے لحاظ سے اسلم ٹھیک نہیں تھا۔ دو اڑھائی میل دُور ایک اور گاؤں تھا۔ وہاں کی ایک جوان لڑکی طلاق لے کر گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کو آپ راجو کہہ لیں۔ بہت چلبلی اور تیز لڑکی تھی۔ اُس کا خاوند شریف اور خاموش طبیعت کا آدمی تھا۔ اُس نے یہی بہتر سمجھا کہ راجو کو طلاق دے دے۔

مجھ کو کرامت نمبردار نے بتایا کہ راجو بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس

کی ایک خالہ ہمارے گاؤں میں یعنی اسلم کے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ راجو اس خالہ کے پاس کبھی کبھی آتی تھی اور بہت دن اُس کے پاس رہتی تھی۔ اسلم نے اس لڑکی کے ساتھ نازیبا تعلق پیدا کر لیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ اس کے علاوہ بھی اسلم بد دماغ نوجوان تھا۔

ایک اور خاندان کے ساتھ اسلم کے خاندان کی دشمنی بہت عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ یہ زمین کا کوئی تنازعہ تھا۔ دونوں خاندانوں کی آپس میں لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ ان کے راضی نامے بھی ہوتے تھے اور اس کے بعد لڑائی جھگڑے کے ذریعے راضی نامہ ٹوٹ جاتا تھا۔ اسلم کے متعلق بتایا گیا کہ وہ اس خاندان کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔

تیسری وجہ قتل کی یہ بتائی گئی کہ اسلم دو عورتوں کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ اُن کو تنگ بھی کرتا تھا۔ دونوں عورتوں کے خاندانوں کے آدمیوں نے اسلم کے باپ سے شکایت کی تھی۔ اس پر بھی ہنگامہ ہُوا تھا۔

تھانیدار نے ایک تو اس وجہ سے مجبور ہو کر کہ اُس کو پیسے ملے تھے تفتیش شروع کر دی اور تفتیش کرنے کی دوسری مجبوری یہ تھی کہ یہ ہڈیاں جس کسی کی بھی تھیں وہ ظاہری طور پر قتل ہُوا تھا، اس لئے یہ تھانیدار کا فرض تھا کہ وہ قاتل کو پکڑ سکے یا نہ پکڑ سکے، کم از کم یہ معلوم کرے کہ یہ ہڈیاں کس کی ہیں۔ اُس نے تفتیش کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ جس پر بھی شُبہ ہُوا اُس کو تھانے بلا کر تین چار دن خوب مارا پیٹا اور ہر اُس طریقے سے تنگ کیا جس طرح پولیس ملزم کو اقبال کرانے کے لئے کیا کرتی ہے۔

کرامت نمبردار نے مجھ کو بتایا کہ تھانے والوں نے اس تفتیش میں بہت کما لیا۔ وہ بعض مشتبہوں سے پیسے لے کر ویسے ہی تھانے میں بٹھا لیتے تھے اور اُن کے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔

اسی سلسلے میں تھانیدار نے راجو کے خالو، اُس کے باپ اور دو بھائیوں کو تھانے بلایا۔ اُس کو شک یہ تھا کہ اسلم کے تعلقات راجو کے ساتھ تھے اور اس وجہ سے ان لوگوں نے اُس کو قتل کر دیا ہو گا۔ یہ سب

تھانے میں آئے اور تھانیدار نے ان پر شک کا اظہار کیا تو انہوں نے
بتایا کہ ان کی لڑکی خود ہی خراب تھی۔ اگر ٹھیک ہوتی تو خاوند اُسے کو طلاق
کیوں دیتا۔

انہوں نے تھانیدار کو دوسری چیز یہ بتائی کہ راجو پانچ چھ مہینے سے
لاپتہ ہے اور اُس کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔

"مجھ کو پتہ ہے وہ کہاں ہے" — تھانیدار نے کہا — "اسلم کی
ہڈیاں تو مل گئی ہیں۔ اب تم لوگ راجو کی ہڈیاں برآمد کراؤ۔ تم نے دونوں
کو قتل کیا ہے۔"

اس بات پر سب بہت گھبراتے۔ قسمیں کھانے کے سوا وہ اور کچھ
بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"سرکار!" — راجو کے باپ نے تھانیدار سے کہا — "مجھ کو بات
کرتے شرم آتی ہے لیکن بات کرنی ہی پڑے گی۔ ہمارے گاؤں کا ایک
اور آدمی جس کا نام نذیر ہے اُسی رات سے لاپتہ ہے جس رات راجو لاپتہ
ہوئی تھی۔ وہ نذیر کے ساتھ گئی ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اُن کے آپس میں ایسے ہی تعلقات تھے" — باپ نے کہا اور
وہ رو پڑا۔

"تم نے تھانے رپورٹ لکھوائی تھی؟"

"نہیں سرکار!" — باپ نے جواب دیا — "نہ میں نے رپورٹ
لکھوائی نہ نذیر کے باپ نے۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ راجو اور نذیر اکٹھے
گئے ہیں۔"

تھانیدار نے نذیر کے باپ وغیرہ کو بلایا۔ اُن لوگوں نے تصدیق کر
دی کہ نذیر اُسی رات سے غائب ہے جس رات راجو غائب ہوئی تھی۔ انہوں
نے یہ بھی بتایا کہ نذیر کہتا تھا کہ وہ راجو کے ساتھ شادی کرے گا۔ اگر اُسے
کو اجازت نہ دی گئی تو وہ راجو کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا۔

بھی راجو تھی جس نے اسلم کے ساتھ بھی دوستی لگائی ہوئی تھی اور اسلم
کہتا تھا کہ وہ راجو کے ساتھ شادی کرے گا۔ تھانیدار کے ذہن میں یہ بات
آئی کہ اسلم اور نذیر میں رقابت ہوگی۔ ایسا ہوا ہوگا کہ نذیر نے اسلم کو قتل
کیا اور راجو کو ساتھ لے گیا۔ کرامت نمبردار کی اس تھانیدار سے دوستی تھی۔
اُس نے مجھ کو بتایا کہ تھانیدار شک کا اظہار تو کرتا تھا لیکن وہ تفتیش میں
اتنا گہرا نہیں جاتا تھا۔ پانچ چھ مہینے گزر گئے تھے۔ لاش کی صرف ہڈیاں ملی
تھیں۔ کوئی مشتبہ اقبالی نہیں ہو رہا تھا۔ سراغ کیسے ملتا!

ہو سکتا ہے تھانیدار نے تفتیش کی ہی ہو لیکن یہ خیال رکھیں کہ مجھ کو
یہ کہانی پولیس کے کسی آدمی نے نہیں سنائی اس لئے میں آپ کو جناب
احمد یار خان اور جناب محبوب عالم کی طرح یہ کہانی نہیں سُنا سکتا۔ کرامت
نمبردار نے مجھ کو اُس طرح نہیں سنائی تھی۔

تفتیش کو بہت دن ہو گئے تھے۔ ایک روز نذیر کے گاؤں کا نمبردار
تھانے میں گیا اور تھانیدار کو بتایا کہ اُس کے گاؤں کی ایک عورت نے اُس
کو ایک بات بتائی ہے۔ وہ اس عورت کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا تھا۔

یہ عورت ایک کسان کی بیوی تھی جو دوسروں کی زمینوں میں نصف
بٹائی پہ کاشت کاری کرتا تھا۔ یہ غریب لوگ تھے۔ عورت چالاک تھی۔ بڑی ذاتوں
کے گھروں میں کام کاج کرتی تھی۔ اُس کا در پردہ کام یہ تھا کہ خفیہ پیغام رسانی
کرتی تھی۔ اپنے گاؤں کے نمبردار کی تو وہ بہت خدمت کرتی تھی اور اُسے کو
ہر گھر کی راز کی باتیں بتایا کرتی تھی۔

"مجھ سے پوچھو" — اُس نے ایک روز نمبردار سے کہا — "یہ تو سب
جانتے ہیں کہ نذیر اور راجو کی در پردہ دوستی تھی۔ ان کو کئی بار میں نے اپنے گھر
میں ملوایا تھا۔ راجو نے (دوسرے گاؤں میں) اسلم کے ساتھ یہی سلسلہ چلایا
ہوا تھا۔ اسلم کو راجو کے اور راجو کو اسلم کے پیغام میں ہی پہنچایا کرتی تھی۔ نذیر
نے راجو کے ساتھ گاؤں سے بھاگ جانے کی رات مقرر کر لی۔ ابھی دو دن
باقی تھے۔ میں نے اسلم کو اُس کے گاؤں جا کر بتا دیا کہ نذیر اور راجو ہمیشہ

کے لیے جا رہے ہیں۔"

"تمہیں یہ بھی پتہ ہوگا کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"نہیں" ـــــ اُس عورت نے بتایا ـــــ "میں نے نذیر سے پوچھا تھا۔ اُس نے نہیں بتایا۔ اُن کے جانے کا مجھ کو اس لئے پتہ لگا تھا کہ راجو کو میں نے گھر سے اُس جگہ تک پہنچانا تھا جو نذیر نے بتائی تھی۔ میں یہ بتا سکتی ہوں کہ انہوں نے آدھی رات کی گاڑی سے جانا تھا۔"

ریلوے سٹیشن ہمارے گاؤں سے ڈیڑھ میل دُور ہے۔ اُس زمانے میں آدھی رات کو ایک مسافر گاڑی دو تین منٹ کے لئے اس سٹیشن پر رُکتی تھی۔ اس سے تھانیدار کو صرف یہ اندازہ ہُوا کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔

اس عورت نے تھانیدار کو باقی بات اس طرح سنائی۔ اُس نے اسلم کو نذیر اور راجو کا یہ پروگرام بتایا۔

"وہ سٹیشن تک نہیں پہنچیں گے" ـــــ اسلم نے اُس کو کہا تھا ـــــ "راجو جاتے گی تو میرے ساتھ جاتے گی۔"

اس عورت نے اسلم کو یہ راز اس لئے دیا تھا کہ اسلم اُس کو نذیر سے زیادہ پیسے دیا کرتا تھا۔ یہ اطلاع دینے پر اسلم نے اُس کو بہت انعام دیا تھا۔

وہ رات آگئی۔ اس عورت نے راجو کو نذیر تک پہنچا دیا اور واپس آ گئی۔ راجو گھر سے زیور اور جتنے پیسے اُس کے ہاتھ آتے، ساتھ لے گئی تھی۔

"میں دوسرے دن کسی کام کے بہانے اسلم کے گاؤں گئی" ـــــ اس عورت نے تھانیدار کو سُنایا ـــــ "میں دراصل اسلم کو دیکھنے گئی تھی۔ اُس کے گھر گئی تو اُس کی ماں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے اسلم کو اپنے گاؤں میں تو نہیں دیکھا؟ میں نے کہا کہ مَیں نے تو نہیں دیکھا۔ میں تین چار گھروں میں وقت گزارنے کے لئے گئی اور شام ہونے لگی۔ اسلم مجھ کو نظر نہ آیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اُس کا ہر جگہ پتہ کر چکے ہیں، کچھ پتہ نہیں چلا۔ رات کو وہ گھر میں سویا تھا۔ صبح نہیں تھا۔ وہ اپنا بید کا ڈنڈہ بھی ساتھ لے گیا تھا۔ ان کی دُشمنی بھی چل رہی تھی اس لئے اسلم کے گھر والوں کو ڈر تھا کہ کسی دُشمن کے اڈے نہ چڑھ

گیا ہو۔ میں بعد میں بھی اسلم کے گاؤں جاتی رہی۔ یہی پتہ لگا کہ اسلم نہیں ملا۔۔۔ "میں حیران تھی کہ اسلم کہاں غائب ہو گیا ہے۔ مجھ کو یقین ہو گیا کہ اسلم نے اُس رات نذیر اور راجو کا راستہ روکا ہوگا اور نذیر نے اُس کو قتل کر کے لاش وہاں دبا دی ہو گی۔"

"نذیر کے پاس ہتھیار کیا تھا؟"

"کلہاڑی تھی" ـــــ اِس عورت نے بتایا۔

یہ سُن کر تھانیدار کے ذہن میں ایک بات یہ آئی کہ اسلم کی کوئی ہڈی ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ کھوپڑی بھی کٹی ہوئی نہیں تھی۔ جوان آدمی کا کلہاڑی کا وار جہاں پڑتا ہے وہاں ہڈی ضرور کٹتی ہے۔ اگر بالکل نہ کٹے تو ہڈی پر کچھ نہ کچھ کٹ ضرور ہوتا ہے۔ دوسری بات جو تھانیدار کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ لاش گڑھے میں پھینکی گئی تو گڑھا مٹی سے کس طرح بھر اگیا؟ اگر لاش پر کافی مٹی نہ ڈالی جاتی تو لاش کو گیدڑ وغیرہ نکال کر کھا جاتے اور دن کو گدھ کھاتے۔ اس طرح ہڈیاں بکھری ہوتی ہوتیں۔

اِس عورت کے بیان سے تھانیدار کو یقین ہو گیا کہ اسلم کا قاتل نذیر ہے لیکن نذیر ہے کہاں؟ تھانیدار نے نذیر کے دوستوں، قریبی رشتہ داروں، باپ، بھائیوں، ماں، بہنوں وغیرہ سے پوچھ گچھ شروع کر دی اور اس میں پندرہ بیس دن گزر گئے۔ پندرہ بیس دن پہلے ہی گزر چکے تھے۔ تھانیدار اب یہ معلوم کرنے کی کوشش میں تھا کہ نذیر کہاں گیا ہو گا۔

یہ معمولی واقعہ نہیں تھا۔ دیہاتی علاقے میں اس کی خبریں پھیل گئیں۔ لوگوں نے سُنی سنائی میں زیبِ داستان کے لئے بہت سی فرضی باتیں شامل کر دیں۔ علاقے میں یہ خبر پھیلنے کا ایک فائدہ بھی ہُوا۔ ایک روز اسلم کے گاؤں سے تین چار میل دُور کے ایک گاؤں کا ایک آدمی اسلم کے گاؤں میں آیا۔ اُس کے پاس ایک خط تھا۔ اُس نے خط کرامت نمبردار کو دکھایا۔

یہ خط بنگال سے آیا تھا۔ لکھنے والا اِس آدمی کا قریبی رشتہ دار اور دوست تھا۔ اُس زمانے میں انگریزوں نے بنگال پولیس اور برما پولیس میں

پنجابیوں اور پٹھانوں کو بھرتی کیا تھا۔ انگریز بنگالیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی اور بھی کوئی وجہ ہوگی۔ بہرحال بنگالی پولیس پنجابیوں اور پٹھانوں کی پولیس بن گئی تھی۔

خط لکھنے والا بنگال پولیس میں تھا۔ اُس نے اپنے اس عزیز کو لکھا تھا کہ اُس کو ایک اور تھانے میں تعینات کر دیا گیا ہے۔ وہاں اُس کے اپنے علاقے کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ پنجاب کے دوسرے علاقوں کے آدمی تھے یا تین چار پٹھان۔ اُس نے لکھا کہ اب ایک سپاہی ٹریننگ کر کے آگیا ہے۔ اُس نے اس کا نام اسلم لکھا تھا اور گاؤں بھی یہی لکھا تھا جو اسلم کا تھا۔ ذات بھی یہی لکھی تھی۔

خط میں اُس نے ایک اہم بات یہ لکھی تھی کہ اسلم ایک لڑکی کو گاؤں سے ساتھ لایا تھا اور سُنا ہے کہ اُس نے اس لڑکی کے ساتھ نکاح یہاں آکر کیا ہے۔ خط لکھنے والے نے خوشی کا اظہار کیا تھا کہ اُس کو اپنا ایک "گرائیں" مل گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اسلم بہت اچھا دوست ہے۔

کرامت نمبردار نے یہ خط اسلم کے باپ کو دکھایا۔ باپ کو تو خوشی ہوئی تھی کہ اُس کا بیٹا زندہ ہے لیکن لڑکی والا معاملہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ نمبردار خط لانے والے کو، اسلم کے باپ کو اور یہ خط تھانے لے گیا۔

خط والے آدمی نے تھانیدار کو بتایا کو وہ خط اسلم کے گاؤں میں دکھانے کے لئے اس لئے لایا ہے کہ اُس نے سُنا تھا کہ اسلم کی لاش برآمد ہوئی ہے مگر خط میں لکھا ہے کہ وہ زندہ ہے اور بنگال پولیس میں ہے۔

یہ معلوم کرایا گیا کہ اس گاؤں کا کوئی اور اسلم بنگال پولیس میں نہ ہو۔ پتہ لگا کہ اس گاؤں کا کوئی اور آدمی بنگال پولیس میں نہیں۔

میرے بزرگ نمبردار کو جن کو میں کرامت نمبردار لکھ رہا ہوں، پولیس کے محکمے کی اندرونی کارروائیوں اور قاعدے قانون کا پتہ نہیں تھا۔ انہیں جو پتہ لگا وہی انہوں نے مجھ کو سُنایا۔ ان کو خیال آیا کہ تھانیدار تفتیش ختم کر دے گا اور اس سے پہلے وہ بنگال پولیس سے تصدیق کرائے گا کہ اسلم زندہ

ہے لیکن تھانیدار نے ایسا نہ کیا۔ اُس نے نذیر کے باپ اور گاؤں کے نمبردار کو بُلایا۔

وہ آئے تو تھانیدار اُن سے معلوم کرنے لگا کہ نذیر کی نشانیاں کیا تھیں۔ اُس نے کرامت نمبردار کے سامنے اُن سے سوال کئے۔

"نذیر کے پاؤں میں جُوتی کیسی تھی؟"

"زری" — نذیر کے باپ نے جواب دیا — "وہ جب بھی باہر جاتا تھا تو زری جُوتی پہنتا تھا۔"

"گلے میں تعویذ تھا؟"

"سونے کا بنا ہُوا پان کا پتّا تھا" — اُس کو جواب ملا۔

"اُس کا ایک دانت سونے کا تھا؟"

"ہاں جی!" — نذیر کے باپ نے جواب دیا — "دائیں طرف والے دانت پر سونے کا خول چڑھا ہُوا تھا۔"

"اُس کا بید کا ڈنڈہ تھا؟"

"نہیں جی!" — باپ نے جواب دیا۔

دو تین اور نشانیاں پُوچھ کر تھانیدار نے سب کو کہہ دیا کہ ہڈیاں جو برآمد ہوئی ہیں یہ نذیر کی ہیں۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ قاتل اسلم ہے۔ اُس نے یہ فیصلہ اُس عورت کے بیان پر سنایا تھا جو راجو کو نذیر اور اسلم کے پیغام دیا کرتی تھی۔ تھانیدار ۳۰۲ (قتل) کا پرچہ لکھ چکا تھا اس لئے وہ تفتیش پوری کرنے پر مجبور تھا۔

آٹھ دس دنوں تک تھانے میں کسی کو بھی نہ بُلایا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے تفتیش ختم ہو گئی ہو۔ ایک روز کرامت نمبردار ویسے ہی تھانے گیا تو وہ اسلم اور راجو کو تھانے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسلم کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ برآمدے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ کرامت نمبردار کو اُس کے ساتھ ہاتھ ملانے کی اجازت نہ ملی۔

تھوڑی دیر بعد راجو سپاہیوں کی بارک میں سے نکلی۔ اُس کے ساتھ چھوٹا تھانیدار تھا۔ وہ راجو کو تھانیدار کے کمرے میں لے گیا اور دروازہ

بند کر دیا۔

کرامت نمبردار کو تین چار دنوں بعد پوری بات معلوم ہوگئی۔ اس کے بعد جب کیس عدالت اور وکیلوں کے سامنے آیا تو ساری واردات سب کے سامنے آگئی جو اس طرح ہوتی تھی کہ تھانیدار نے اپنے علاقے کے ڈی ایس پی کو جو انگریز تھا، یہ رپورٹ بھیجی کہ جس اسلم کے قتل کی تفتیش ہو رہی ہے وہ بذریعہ ایک خط بنگال پولیس میں زندہ بیان کیا گیا ہے۔ تھانیدار نے رپورٹ ہذا میں یہ بھی لکھا کہ یہ لاش نذیر کی ہو سکتی ہے۔ اُس نے اپنے شک کے حق میں شہادت لکھی تھی۔

بحکم ڈی ایس پی تھانے کے چھوٹے تھانیدار (اے۔ایس۔آئی) کو اسلم کے بڑے بھائی کے ہمراہ بنگال بھیجا گیا کہ وہ اسلم کی شناخت کرے اور اگر شک پختہ ہو کہ اُس نے نذیر کو قتل کیا ہے، اُسے ساتھ لے آئے چھوٹے تھانیدار کو سرکاری چٹھی بنام ہیڈ کوارٹر بنگال پولیس دی گئی تھی۔

چھوٹا تھانیدار بنگال چلا گیا۔ اُس کو متعلقہ تھانے تک پہنچا دیا گیا۔ اسلم وہیں تھا۔ اُس کو اُس کے بھائی نے شناخت کیا۔ چھوٹے تھانیدار کو اس شک پر کام کرنے کو کہا گیا تھا کہ خط میں اسلم کے ساتھ جو عورت بیان کی گئی ہے وہ راجو ہو سکتی ہے۔ بہرحال چھوٹا تھانیدار سارے معاملے کو اور اس کے پس منظر کو جانتا تھا۔ اُس نے اسلم سے کہا کہ وہ اُس کو اپنے گھر لے چلے کیونکہ وہ اُس کی بیوی کو دیکھنا چاہتا ہے۔

اسلم نے اُس کو اپنی بیوی دکھانے سے انکار کر دیا۔ چھوٹے تھانیدار نے اُس کے تھانے کے تھانیدار (سب انسپکٹر) کو کہا کہ وہ اسلم کو سمجھائے کہ شرافت سے بات مان لے ورنہ اُس کے گھر پر چھاپہ مارا جائے گا۔ اسلم سپاہی (کانسٹیبل) تھا۔ آخر وہ مان گیا اور چھوٹے تھانیدار کو اپنے گھر لے گیا۔

وہ ایک جھونپڑا تھا جیسے بنگال کے دیہاتی علاقے میں ہوتے ہیں چھوٹے تھانیدار نے اندر جا کر دیکھا۔ وہاں ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" — چھوٹے تھانیدار نے پوچھا۔

"راجو!" — لڑکی نے جواب دیا — "پورا نام راج بی بی ہے۔"

چھوٹے تھانیدار کے پوچھنے پر راجو نے اپنے باپ کا اور اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ یہ وہی راجو تھی۔ اُس کا بیان لینا تھا۔ اسلم اور اُس کے بھائی نے چھوٹے تھانیدار کو رشوت پیش کی کہ وہ راجو کا بیان نہ لے اور یہ ظاہر کرے کہ راجو یہاں ہے ہی نہیں۔ اس سے اور زیادہ شک ہوا۔ چھوٹے تھانیدار کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ اسلم اور اُس کے بھائی کو ان سپاہیوں کی تحویل میں باہر بٹھا دیا گیا۔

"راجو!" — چھوٹے تھانیدار نے اُس کو کہا — "تمہارے گاؤں کی ایک عورت نے بیان دیا ہے کہ تم نذیر کے ساتھ گھر سے نکلی تھیں پھر اسلم کے پاس کس طرح آگئیں؟ ..... نذیر کہاں ہے؟"

"سچ بتاؤں گی" — راجو نے کہا — "لیکن آپ نے سچ بات سن کر مجھ کو اسلم کے حوالے کر دیا تو یہ مجھ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

چھوٹے تھانیدار نے اُس کو سمجھایا کہ وہ اس کو اسلم کے حوالے نہیں کرے گا، وہ نڈر ہو کر سچ بات بتا دے۔

"میں تو دعائیں کرتی تھی کہ کوئی آجائے اور میں اُس کو یہ بات سناؤں" — راجو نے کہا — "لیکن میری شرط یہ ہے کہ مجھ کو یہاں سے نکالا جائے ..... میں ناچنے کودنے والی زندہ دل لڑکی تھی۔ مجھ کو ایسے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا گیا جو میرے اُلٹ تھا۔ میں اُس کی بدصورتی کو بھی قبول کر لیتی لیکن اُس کا دل بھی مُردہ تھا اور جسم بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھ پر بدچلنی کا الزام لگاتا تھا۔ میں بدچلن تو نہیں تھی لیکن بدنیت لوگوں کو ہی شک ہوتا تھا۔ میری یہ عادت بڑی خراب تھی کہ میں گھر میں ٹک کر نہیں بیٹھتی تھی .....

"خاوند کو میری یہ عادتیں پسند نہیں تھیں اور مجھ کو یہ خاوند پسند نہیں تھا۔ وہ تو بالکل ہی بے کار آدمی تھا۔ اُس کی ماں بھی ایسی تھی اور اُس کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ ہر بات میں اپنے بیٹے کی طرفداری کرتے تھے۔ میں نے اُن کے آگے بولنا شروع کر دیا پھر خاوند کو بھی کھری کھری سنائیں۔ ان لوگوں نے مجھ کو سارے

گاؤں میں بدنام کر دیا۔ میں نے خاوند کو اتنا تنگ کیا کہ وہ مجھ کو طلاق دینے پر مجبور ہو گیا....

"سچی بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے میرا دل نذیر کے ساتھ تھا۔ ہمارا تعلق ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی لیکن شادی کے بعد جب خاوند نے اور میرے سسرال نے مجھ کو بدنام کر دیا تو میں نے سوچا کہ میں خواہ مخواہ نیک اور پاک بنی ہوتی ہوں۔ میں نے غصے میں آکر نذیر کے ساتھ اُس قسم کا تعلق پیدا کر لیا جس کا الزام پہلے ہی لوگوں نے مجھ پر لگایا ہُوا تھا....

"طلاق کے بعد میں نے اپنی خالہ کے پاس زیادہ جانا شروع کر دیا۔ میری خالہ اسلم کے گاؤں میں بیاہی ہوتی ہے۔ وہاں اسلم سے آمنا سامنا ہو گیا۔ یہ مجھ کو اچھا لگا.... بس آپ یہ سمجھیں کہ اس کے ساتھ بھی نذیر کی طرح کی دوستی شروع ہو گئی۔ دونوں مجھ کو شادی پر مجبور کرتے تھے لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ بھی میری شادی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ مجھ کو طلاق ہو گئی تھی اور میں بدنام بھی تھی۔ ان میں سے کسی کے ماں باپ بھی مجھ کو اپنے گھر میں قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ نذیر بھی مجھ کو کہتا تھا کہ میرے ساتھ گھر سے بھاگ چلو اور اسلم بھی یہی کہتا تھا....

"میں نے شادی تو کرنی ہی تھی۔ یہ اس طرح ہو سکتی تھی کہ میں ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ گھر سے نکل جاتی لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ میں جس کسی کے ساتھ بھی گئی وہ باہر جا کر کیا کرے گا۔ گاؤں میں تو ہم لوگ بادشاہی کرتے ہیں۔ کہیں اور جا کر محنت مزدوری کرنی تھی۔"

"تم نذیر کے ساتھ جا رہی تھیں" — چھوٹے تھانیدار نے پوچھا — "وہ تمہیں کہاں لے جا رہا تھا؟"

"لاہور" — راجو نے جواب دیا — "ہمارے گاؤں کا ایک آدمی وہاں فوج میں حوالدار ہے۔ نذیر کے ساتھ اُس کا گہرا دوستانہ ہے۔ وہ چھٹی آیا ہُوا تھا۔ نذیر نے اُس کے ساتھ یہ معاملہ طے کر لیا تھا۔ اُس نے نذیر کو کہا تھا کہ تم راجو کو لے کر میرے پاس پہنچ جانا۔ وہاں تمہیں نوکر بھی کرا دوں گا اور

نکاح بھی ہو جائے گا۔ اُس نے نذیر کو یہ بھی کہا تھا کہ تم جب کچھ عرصے بعد راجو کو ساتھ لے کر گاؤں میں آ ؤ گے تو تمہارے ماں باپ تم دونوں کو قبول کر لیں گے۔ میں بھی اُن کو سمجھاؤں گا اور اپنے باپ کو بھی کہوں گا کہ وہ اُن کو سمجھائیں۔"

"پھر تم اسلم کے ساتھ کس طرح آ گئیں؟"

"یہی بات تو میں آپ کو سنا رہی ہوں" — راجو نے جواب دیا — "مجھ کو اپنی غلطی کی سزا ملی ہے۔ اسلم بھی مجھ کو مجبور کرتا تھا کہ میں اُس کے ساتھ گھر سے بھاگ چلوں۔ میں نے اس کو کہا تھا کہ باہر جا کر خراب ہوں گی۔ یہ کہتا تھا کہ یہ مجھ کو بنگال لے آئے گا۔ یہاں ایک چھوٹا تھانیدار اس کا دوست تھا۔ یہ تھانیدار اسلم کے گاؤں سے تھوڑی دُور کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نذیر کے ساتھ جانا چاہتی تھی کیونکہ میری دلی محبت اُسی کے ساتھ تھی۔ یہ شادی سے پہلے کی پاک محبت تھی۔ اسلم کے ساتھ اِس قسم کی محبت نہیں تھی....

"میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی کہ جس رات میں نذیر کے ساتھ گھر سے نکلی اُس رات اسلم ہمارے راستے میں کس کے بتانے پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ نذیر کی غلطی تھی۔ ہمارے گاؤں کی ایک عورت ہے جو ہمارے گھروں میں کام کرتی ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ گھر سے نکلنا تھا۔ نذیر نے اس پر اعتبار کیا اور پہلے ہی اُس کو بتا دیا کہ ہم فلاں رات گھر سے جا رہے ہیں۔ مجھ کو شک ہے کہ اس عورت نے اسلم کو بتا دیا تھا....

"ہم دونوں جب اپنے گاؤں سے دُور نکل گئے تو اچانک ایک آدمی ہمارے راستے میں آ گیا۔ اُس نے نذیر کے سر پر ڈنڈہ یا لاٹھی ماری۔ نذیر کی پگڑی جو اُس نے گلے پر باندھی ہوتی تھی، اگر پڑی۔ نذیر کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ ابھی اُس نے کلہاڑی سیدھی کی ہی تھی کہ اُس آدمی نے نذیر کے سر پر دو تین لاٹھیاں ماریں۔ نذیر گر پڑا۔ اندھیرا تھا۔ اُس آدمی نے کہا، راجو، میں اسلم ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔ نذیر سر پر لاٹھیاں لگنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"وہ لاٹھی نہیں تھی راجو!" — چھوٹے تھانیدار نے کہا — "وہ بید کا ڈنڈہ تھا۔ اُس کے آگے خول تھا اور خول کے اندر سیسہ بھرا ہُوا تھا۔ ننگے سر پر اس کی ضرب گھوڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نذیر تو دو تین ضربوں سے ہی مر گیا ہو گا۔"

"یہ پتہ نہیں چلا کہ ابھی وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا" — راجو نے کہا — "بالکل قریب ایک لمبوترا اور تنگ گڑھا تھا۔ اسلم نے شاید یہ گڑھا پہلے سے دیکھا ہُوا تھا۔ اُس نے نذیر کو گھسیٹ کر اس گڑھے میں پھینک دیا اور اُوپر مٹی ڈال دی۔"

"اُس نے مٹی کس طرح کھودی تھی؟"

"میں پاس ہی کھڑی تھی" — راجو نے کہا — "دل میں آئی تھی کہ بھاگ جاؤں لیکن اسلم نے مجھ کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہاں سے ہلنا مت ورنہ تمہاری لاش بھی اسی کے ساتھ دفن کر دوں گا۔ گڑھے کے ساتھ ہی مٹی کی ایک پکّی ڈھیری سی تھی اور وہاں مٹی کچی کچی سی تھی۔ اسلم نے اس ڈھیری پر کلہاڑیاں ماریں تو ڈھیری کٹ کر الگ ہو گئی۔ اسلم نے اس کو گڑھے میں دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنا ڈنڈہ گڑھے میں پھینک دیا اور کلہاڑی سے زمین کھود کھود کر پاؤں سے مٹی گڑھے میں پھینکتا رہا۔ پھر اس نے گڑھے کے کناروں پر کلہاڑیاں ماریں تو مٹی گڑھے میں گرنے لگی۔ اُس نے بڑی تیزی سے یہ کام کیا۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ تمہاری کیا مرضی ہے، میں گھر سے ہمیشہ کے لئے نکل آیا ہوں اور تمہاری خاطر آیا ہوں ....

"میرا اَب کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ واپس تو جا نہیں سکتی تھی۔ ضد کرتی تو اسلم مجھ کو بھی مار ڈالتا۔ اگر اپنے گھر پہنچ ہی جاتی تو پکڑی جاتی۔ میں چُپ کر کے اُس کے ساتھ چل پڑی۔ میرے پاس جو زیور اور پیسے تھے وہ اسلم نے لے لئے۔ سٹیشن پر گئے تو گاڑی آنے ہی والی تھی۔ گاڑی آئی۔ اسلم ٹکٹ لے آیا تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور صبح ہونے تک گاڑی ہمیں بہت دُور لے آئی۔ اس طرح ہم یہاں پہنچ گئے۔ ہمارا نکاح بھی ہو گیا اور اسلم کو پولیس میں نوکری مل گئی۔"

"کیا تم نے اسلم کو دل سے قبول کر لیا تھا؟"

"نہیں" — راجو نے جواب دیا — "اگر یہ شخص مجھ کو عزت اور محبت دیتا تو میں اس کی غلام بن جاتی لیکن یہ مجھ کو بدچلن عورت سمجھتا رہا۔ جب یہ ٹریننگ کر رہا تھا، اُس وقت یہ مجھ کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھ کو اس نے اُس چھوٹے تھانیدار کے پاس چھوڑ دیا جس نے اس کو نوکری دلائی اور ہمارا نکاح کرایا تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ میرے سر پر قرآن رکھ دو۔ میں قسم کھاؤں گی کہ اس چھوٹے تھانیدار نے مجھ کو اپنی سگی بہنوں کی طرح رکھا۔ میں نے آپ کو صاف بتا دیا ہے کہ نذیر اور اسلم کے ساتھ میرے تعلقات کس قسم کے تھے۔ اگر اس چھوٹے تھانیدار کے ساتھ بھی ایسا ہی تعلق ہوتا تو میں وہ بھی بتا دیتی....

"اسلم جب ٹریننگ کر کے آگیا تو اس نے سب سے پہلا الزام مجھ پر یہ لگایا کہ تم نے اس شخص کو اپنا خاوند بنا لیا تھا۔ میں قسمیں کھاتی تھی پھر بھی یہ نہیں مانتا تھا۔ کہتا تھا کہ تم نے نذیر کے ساتھ بھی ایسا ہی تعلق جوڑا ہُوا تھا۔ دو تین دفعہ میں نے اس کو تُرشی سے کہا کہ میرے ساتھ ایسی بکواس نہ کیا کرے۔ اس پر اس نے مجھ کو مارا پیٹا۔ آج تک یہ میرے ساتھ یہی سلوک کرتا رہا ہے۔ مجھ کو نذیر کے قتل کا بہت غم تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اس نے اپنا رویّہ نہ بدلا تو میں کسی نہ کسی طریقے سے اس کو مار ڈالوں گی اور تھانے چلی جاؤں گی۔ آپ کو دیکھ کر مجھ کو بہت خوشی ہوئی کہ خدا نے مجھ کو قتل کے جرم سے بچا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو ہر ایک بات ٹھیک ٹھیک بتا رہی ہوں۔"

چھوٹے تھانیدار نے وہیں اسلم کو ہتھکڑی لگائی اور تھانے لے گیا۔ تھانے کے بڑے تھانیدار کو یہ خیال آیا کہ اسلم بھرتی کس طرح ہو گیا تھا۔ بھرتی کر کے ہر رنگروٹ کے کاغذات تصدیق کے لئے اُس کے علاقے کے تھانے میں بھیجے جاتے ہیں جہاں سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ یہ شخص اسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور اسی باپ کا بیٹا ہے اور اس کی ذات یہی ہے جو اس نے لکھوائی ہے پھر پولیس متعلقہ نمبردار کی گواہی ڈالتی ہے کہ اس شخص کا چال چلن صحیح ہے اور یہ کسی جرم میں سزا یافتہ نہیں۔ جب تک تھانے سے یہ کاغذات تصدیق

ہو کر نہیں آتے اُس وقت تک ریکروٹ کی ٹریننگ شروع نہیں ہوتی۔

وہاں کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں گئے۔ وہاں تو ویسے بھی جانا تھا کیونکہ پولیس کے حاضر نوکری کے آدمی کو گرفتار کر کے پنجاب میں لانے کے لئے کچھ کاغذی کارروائی کی ضرورت تھی۔ وہاں بھی یہ سوال اُٹھا کہ اسلم کی تصدیق اس کے تھانے سے ہوتی تھی یا نہیں۔ چھوٹے تھانیدار نے بتایا کہ وہ ایک سال سے اس تھانے میں تعینات ہے۔ اُس کو اچھی طرح پتہ ہے کہ اسلم کے کاغذات برائے تصدیق تھانے میں نہیں گئے تھے۔

اسلم کے کاغذات متعلقہ دفتر سے نکلوائے گئے تو دیکھا کہ وہاں تصدیق کا کاغذ تو لگا ہوا تھا لیکن صاف پتہ لگتا تھا کہ یہ جعلی کاغذ ہے۔ وہاں ایک اور مقدمہ کھڑا ہو گیا جو اُس چھوٹے تھانیدار کے خلاف تھا جس نے اسلم کو بھرتی کرایا تھا۔ تصدیق کی جعلسازی اُس نے کرائی تھی۔ جعلسازی کرانے کا باعث یہ تھا کہ پیچھے گاؤں میں اگر نذیر کا قتل ظاہر ہو گیا تو اسلم پکڑا جائے گا۔

میرے بزرگ نے جنہیں میں کرامت نمبردار لکھ رہا ہوں، بتایا کہ اسلم اور راجو تو آ ہی گئے تھے، ایک مہینے بعد وہ چھوٹا تھانیدار جس نے اسلم کو بھرتی کرایا تھا گاؤں میں آ گیا۔ اُس کو نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ اُس کو وفت ہوتے آٹھ دس سال گزر گئے ہیں۔ اس ایک مہینے میں اسلم کا مقدمہ سیشن میں چلا گیا تھا۔ گواہیاں بڑی پکی تھیں۔ سب سے پہلی گواہی راجو کی تھی۔ اُس عورت کو بھی پیش کیا گیا تھا جس نے اسلم کو خبر دی تھی کہ فلاں رات نذیر اور راجو جا رہے ہیں۔ آخر اسلم کو عمر قید ہوتی اور وہ گیارہ یا بارہ سال قید کاٹ کر گھر آیا۔

اُس کے آنے سے چار یا پانچ سال پہلے راجو گھر سے غائب ہو گئی تھی پھر اُس کا کبھی بھی پتہ نہ چلا کہ کہاں گئی۔ اسلم قید کاٹ کر آیا تو برادری کے ایک کمزور سے گھرانے کی لڑکی کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی لیکن اس شخص نے بدمعاشی پھر بھی نہ چھوڑی۔ اس کے گھر اولاد بھی ہونے لگی۔ یہ لڑکی جو اب

ایک آدمی کے ساتھ کھیتوں میں پکڑی گئی تھی اس کی آخری اولاد تھی۔ اسلم چند سال پہلے مر گیا تھا۔ یہ خاندان کسی کا محتاج نہیں بلکہ کچھ لوگ ان کے محتاج ہیں کیونکہ ان کی زمینوں کا ہی کوئی حساب نہیں۔ دولت ہے لیکن عزت نہیں۔

ایک چہرہ دو کردار

باوا انور ہمارے محلے کی مقبول اور دلچسپ شخصیت ہے۔ شخصیت سے مراد یہ نہیں کہ وہ صوبائی یا قومی اسمبلی کا ممبر ہے یا کارپوریشن میں میئر یا کونسلر ہے۔ وہ تو عام سا ایک آدمی ہے۔ اُس کے دو بیٹے پاکستان میں اور ایک کویت میں ملازم ہے۔ ان کی وجہ سے باوا انور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے اور اپنے آپ کو غریب اور مسکین آدمی سمجھتا ہے۔ اُس کی عمر پچھتر برس کے لگ بھگ ہے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں وہ پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا، لیکن وہ ڈائریکٹ حوالدار نہیں تھا۔ اُس نے سپاہی رینک میں بڑی لمبی سروس کی تھی۔ پاکستان میں وہ اے ایس آئی ہو گیا تھا اور اسی رینک میں اُس کو پنشن ملی۔

جناب احمد یار خان، جناب محبوب عالم اور دوسرے پولیس افسروں کی کہانیاں پڑھ کر باوا انور بہت دیر تک تبصرے کرتا ہے اور آج کل کی پولیس کے بارے میں بھی اپنی رائے دیتا ہے۔ اُس کے یہ تبصرے اور آراء بڑی دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ اگر اُس کی یہی باتیں قلمبند کی جائیں تو ایک دلچسپ اور فکر انگیز مضمون بن جاتے، لیکن اس وقت میں اُس کی سناتی ہوئی ایک کہانی سناؤں گا۔

یہ دوسری عالمی جنگ کے دوران کا واقعہ ہے۔ اُس وقت باوا انور پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل نور حسین ہوا کرتا تھا اور تھانہ مری میں تعنیات تھا۔ اُس وقت اس علاقے میں ایک ڈاکو مشہور ہو گیا تھا جس کا نام احمد خان عرف خانو تھا۔ وہ زیادہ تر رہزنی کی وارداتیں کرتا تھا۔ پبلک میں وہ زیادہ مشہور نہیں تھا۔ اُس کی شہرت راولپنڈی اور مری کے تھانوں میں زیادہ تھی۔

اُس وقت مری امیر کبیر لوگ جایا کرتے تھے اور گرمیوں کے موسم میں وہاں
اُن کی رہائش ہوتی تھی۔ مری میں گورا پلٹنیں رہتی تھیں۔ انگریز افسر بھی گرمیوں
میں وہاں جاتے تھے۔

خانو کو اس وجہ سے شہرت حاصل ہو گئی کہ اُس کو ایک بار پولیس نے
راولپنڈی میں ڈکیتی کی ایک واردات میں پکڑ لیا تھا۔ تھانے میں اُس کی
شناخت رہزنی کی ایک واردات کے سلسلے میں بھی ہو گئی۔ وہ اس طرح
ہوئی کہ جس آدمی کو اس نے روک کر لُوٹا تھا وہ اتفاق سے تھانے میں
موجود تھا۔ اُس نے خانو کو پہچان لیا۔ اُس وقت انگریزوں کی بادشاہی تھی
جس میں پولیس کو اپنی صحیح ڈیوٹی دینی پڑتی تھی۔ راولپنڈی کے جس تھانے
میں خانو گرفتار تھا اُس علاقے میں رہزنی کی ایک اور واردات کچھ دن
پہلے ہوئی تھی جس کی رپورٹ تھانے میں موجود تھی اور اس آدمی کا ایڈریس
بھی موجود تھا جس کو لُوٹا گیا تھا۔ تھانیدار نے اُس آدمی کو تھانے میں طلب
کیا اور خانو کو اُس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس آدمی نے خانو کو دیکھتے ہی
شناخت کر لیا۔

اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ خانُو اتنا دلیر تھا کہ وہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر رہزنی
کی وارداتیں نہیں کرتا تھا۔ تھانیدار نے اُس کو کہا کہ اُس نے جو اور وارداتیں
کی ہیں ان کا اقبال خود ہی کر لے۔ اُس نے کسی اور واردات کا اقبال نہ کیا۔
تھانیدار نے حوالدار نُور حسین (باوا نُور) کو حکم دیا کہ اس سے سچّی بات کہلواؤ۔

باوا نُور اس کام کا ماہر تھا۔ وہ ایذا رسانی کے ایسے طریقے اختیار کرتا
تھا کہ پتھر کے بُت بھی جھوٹا سچا اقبالی بیان دے دیتے تھے۔ باوا نُور نے
اُس کے ساتھ ایک رات جاگ کر اپنے ہاتھ آزمائے تو صبح تک خانُو نے
ڈکیتی کی دو وارداتوں کا اقبال کر لیا۔ ان میں ایک واردات مری تھانے کی
تھی اور ایک کسی اور تھانے کی۔ اُس کے اس اقبالی بیان سے اور رہزنی کی
دو اور وارداتوں کی تفتیش میں شناخت ہو جانے سے اور ڈکیتی کی واردات
میں پکڑے جانے سے پولیس کو پہلی مرتبہ معلوم ہُوا کہ یہ تو پکا ڈکیت اور رہزن

ہے۔ تھانے سے یہ رپورٹ جب پولیس کپتان تک پہنچی تو حکم آیا کہ خانُو کی
اُنگلیوں کے نشان لے لئے جائیں۔ اس کو پنجہ لگوانا کہتے تھے۔ اس میں صرف
نشانِ انگوٹھا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کے ساتھ باقی چار اُنگلیوں کے نشانات
بھی لگوائے جاتے تھے۔ پھر یہ نشانات فنگر پرنٹ بیورو کو بھیج دیئے جاتے
تھے جہاں ان کو متعلقہ ملزم کے نام پتے وغیرہ کے ساتھ ریکارڈ میں رکھا جاتا تھا۔

خانُو کا مزید ریمانڈ لینا تھا۔ اُس کو مجسٹریٹ کی عدالت میں لے گئے۔
اُس کی ہتھکڑی کے ساتھ ایک مُلزم اور بندھا ہُوا تھا۔ دونوں کا ریمانڈ لینا تھا۔
معلوم نہیں کانسٹیبل کو ایک ملزم کو دوسری ہتھکڑی میں باندھنے کی ضرورت
کیوں پڑ گئی۔ اُس نے اُس ملزم کا ہاتھ کھولنے کی بجائے ہتھکڑی کا وہ کڑا کھول
دیا جو خانُو کی کلائی میں لگا ہُوا تھا۔ خانُو پھرتیلے جسم کا جوان آدمی تھا۔ اُس نے
ایک سیکنڈ بھی نہ لگایا اور فرار ہو گیا۔

راولپنڈی کی ضلع کچہری آج کل بھی وہیں ہے جہاں اُس وقت ہُوا کرتی
تھی۔ اس کے ساتھ جیل تھی جو آج کل گرا دی گئی ہے۔ یہ شہر کے باہر کا علاقہ
تھا۔ آج کل جہاں اتنی آبادی نظر آتی ہے اُس وقت وہاں کھڈ اور نالے
تھے۔ کانسٹیبل نے "پکڑو پکڑو" کا شور مچایا۔ اتنے سے وقت میں خانُو قریبی
نالے میں اُتر گیا اور جب اُس کے تعاقب میں پولیس گئی تو وہ غائب ہو چکا تھا۔
اُس وقت جیپیں اور ہیلی کاپٹر تو ہوتے نہیں تھے کہ دُور تک مفرور کا تعاقب
کیا جا سکتا پھر بھی پولیس کے کچھ آدمی دُور تک گئے لیکن خانُو اس طرح غائب
ہو گیا جیسے اُس کو زمین نے نگل لیا ہو۔ آگے جنگل تھا۔ زمین کٹی پھٹی تھی اور وہ
علاقہ بھاگنے اور چھپنے کے لئے نہایت اچھا تھا۔

سورج غروب ہو گیا تو اُس کے پیچھے گئے ہوئے آدمی واپس آ گئے۔
جس کانسٹیبل سے وہ فرار ہُوا تھا اُس کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اُس کو چھ مہینے
سزائے قید دی گئی تھی۔

تین چار روز کی تلاش کے بعد جب یقین ہو گیا کہ مفرور ملزم کے ملنے
کا کوئی امکان نہیں رہا تو اُس کو عدالت کے ذریعے اشتہاری ملزم قرار دے

دیا گیا۔ اُس کی اُنگلیوں کے نشان لینے کے علاوہ اُس کا فوٹو بھی لے لیا گیا تھا جو ضلع راولپنڈی کے ہر تھانے میں بھیج دیا گیا۔

چھ سات مہینوں کے بعد باوا انُور کا تبادلہ مری تھانے میں ہو گیا۔ اس کے چار پانچ مہینے بعد کا واقعہ ہے کہ کسی دیہاتی مُخبر نے تھانے میں اطلاع دی کہ ایک جوان آدمی جس کی عمر اٹھائیس انتیس سال ہے، مری کے اِردگرد کہیں مشکوک حالت میں دیکھا گیا ہے۔ اس مُخبر کو دو تین آدمیوں نے بتایا تھا کہ یہ آدمی دو دنوں سے اسی علاقے میں دیکھا گیا ہے۔

تھانیدار نے اس مُخبر کو اُس بورڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جس پر سات آٹھ اشتہاری ملزموں کے فوٹو چسپاں تھے۔ اُس سے پوچھا گیا کہ جس شخص کو اس نے دیکھا ہے، کیا اُس کا فوٹو یہاں موجود ہے؟ مُخبر نے بورڈ پر نظریں دوڑا کر ایک فوٹو پر انگلی رکھ دی۔ یہ خانُو کا فوٹو تھا۔ تھانیدار نے کہا کہ پھر غور سے دیکھو۔

"صاحب جی!" — مُخبر نے خانُو کا فوٹو غور سے دیکھتے ہوئے کہا — "یہ تصویر ہے۔ اس میں اور اصلی چہرے میں تھوڑا بہت فرق تو ضرور ہو گا۔ ویسے یہ تصویر مجھ کو اُسی کی لگتی ہے۔"

باوا انُور خانُو کو اتنی اچھی طرح پہچانتا تھا جس طرح ایک گھر کے لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ راولپنڈی میں خانُو باوا انُور کے تھانے کی حوالات میں رہا تھا اور باوا انُور نے پوری ایک رات اُس کو اقبالی بیان حاصل کرنے کے لئے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ مری کے تھانے کے اِس مُخبر کی اطلاع پر اور فوٹو کی شناخت پر باوا انُور نے کہا کہ وہ جا کر اِس مشکوک شخص کو دیکھے گا۔

"نہیں نُور حسین!" — تھانیدار نے باوا انُور کو کہا — "جس طرح تم اُس کو پہچانتے ہو اسی طرح وہ تم کو پہچانتا ہے۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر ہی وہ پھر رُوپوش ہو جائے گا۔"

باوا انُور نے کہا کہ وہ اپنا چہرہ چھُپا کر اُس کو دیکھے گا۔ تھانیدار نے

اُس کو کہا کہ اپنا چہرہ چھپا کر دکھاؤ۔ باوا انُور نے مصنوعی داڑھی مونچھ نہیں لگائی۔ اُس کی مونچھیں بڑی اور گھنی تھیں جن کے سروں کو وہ مروڑ کر اوپر کو رکھتا تھا۔ اُس نے مونچھوں کو نیچے کر کے ہونٹوں پر پھیلا دیا۔ یہ اُن دِنوں میں ہندوؤں کی مونچھوں کا سٹائل ہوتا تھا۔ پھر اُس نے سر پہ پگڑی اس طرح باندھی جس طرح دیہات میں ہندو باندھا کرتے تھے۔ راولپنڈی کے ضلعے میں جس میں مری کی تحصیل بھی آتی تھی، دیہاتی لوگ کسی اور سٹائل سے بغیر کُلّے کے پگڑی باندھا کرتے تھے۔ باوا انُور نے ایک بہروپ یہ بنایا کہ ایک آنکھ اور اُس طرف کے آدھے چہرے پر عام سا کپڑا لے کر پٹی باندھ دی جیسے وہ اِدھر سے زخمی ہو۔ پھر اُس نے ایک ہندو کانسٹیبل کے پرائیویٹ کپڑے پہن لئے۔ اُن دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں فرق ہوتا تھا۔

تھانیدار نے اس بہروپ کو دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا پھر اس کو اس طرح ٹسٹ کیا کہ باوا انُور کو دوسرے دروازے سے باہر نکال کر ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ اُس کو کہا کہ ادھر باہر کوئی آدمی کھڑا ہے۔ اُس سے پوچھنا نہیں کہ وہ کون ہے۔ صرف یہ دیکھ کر بتانا کہ تم نے اس کو پہلے کبھی دیکھا ہے!

کانسٹیبل باہر جا کر واپس آ گیا اور اُس نے کہا کہ شاہ جی، میں نے تو اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ آپ کہیں تو میں اس سے پوچھ لیتا ہوں کہ کون ہے اور یہاں کیوں کھڑا ہے۔ تھانیدار نے کہا کہ اس کو اندر بھیج دو اور تم جاؤ۔

کانسٹیبل نے باوا انُور کو تھانیدار کے پاس بھیج دیا۔ اب دونوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ بہروپ ٹھیک ہے۔ ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں تھا مفرور اور اشتہاری ملزم ایک جگہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرا کرتے۔ باوا انُور نے دو گھنٹے لگا کر اپنا حُلیہ جو بگاڑا تھا اس کو اتارنے کی بجائے اُسی وقت مُخبر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مُخبر کمزور سی ایک گھوڑی پر آیا تھا۔ ایسی ہی ایک اور گھوڑی تھانے کے خرچ پر باوا انُور نے کرائے پر لے لی تھی۔ باوا انُور کے پاس ریوالور اور چوبیس گولیاں تھیں۔

مری سے نیچے اُتر کر وہ چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے اردگرد مشکوک

آدمی کو دیکھا گیا تھا۔ یہ گاؤں بہت زیادہ نیچے نہیں تھا لیکن علاقہ دشوار گزار پہاڑی ہونے کے باعث یہ گاؤں مری سے بہت ہی دُور لگتا تھا۔ اشتہاری ملزموں کے چھپنے کے لئے یہ علاقہ بہت ہی محفوظ تھا۔

باوا نُور اُس گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ گاؤں کے تین چار مکان نیچے، تین چار اُوپر اور پانچ مکان اور اُوپر تھے۔ یہ گاؤں ڈھلوان پہ آباد تھا۔ باوا نُور گاؤں میں اس طرح داخل ہو رہا تھا کہ ڈھلوان پر چڑھ رہا تھا۔ وقت شام کے تین چار بجے کے درمیان تھا۔ ایک آدمی گاؤں سے اُترتا آ رہا تھا۔ اُس نے چادر اس طرح اوڑھی ہوئی تھی کہ کندھوں پر تھی سر پر نہیں تھی۔ اُس نے دو گھوڑیوں کے سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو تیزی سے چادر اپنے سر پر ڈال لی اور بُکل اس طرح ماری کہ اُس کا آدھا چہرہ چھُپ گیا لیکن اتنی دیر میں باوا نُور دیکھ چکا تھا کہ یہ چہرہ اور یہ جسم خانو کا ہے۔ خانُو باوا نُور سے تقریباً تیس گز دُور تھا۔ مُخبر نے باوا نُور کو بتایا کہ یہی ہے وہ آدمی۔

باوا نُور نے یہ غلطی کی کہ جہاں تھا وہیں رُک گیا اور خانو کو دیکھنے لگا۔ خانو جیسے اشتہاری اور تجربہ کار ملزم ہر کسی کو شک کی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ خانو نے وہیں سے رُخ بدل لیا اور ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ باوا نُور نے اُس کو اس طرح آواز دی — "اے بھائی! ذرا رُکنا۔ ایک گھر پوچھنا ہے" — اتنی سی دیر میں خانو ایک ایسی ڈھلوان اُتر گیا جیسی کھائی کی ہوتی ہے۔ باوا نُور نے مُخبر کو اتنا ہی کہا کہ گاؤں میں جا کر لوگوں کو بتاؤ کہ ایک خطرناک مفرور ملزم کو پکڑنے کے لئے باہر نکلو، اور وہ خود خانو کے پیچھے گیا۔

باوا نُور نے ایک دو منٹ کے لئے خانو کو دیکھا۔ ریوالور نکالا جس میں چھ گولیاں بھری ہوتی تھیں۔ اُس نے خانو کو للکارا کہ رُک جاؤ ورنہ گولی چلا دوں گا۔ خانو دوڑا اور غائب ہو گیا۔ باوا نُور گھوڑی پر تھا۔ یہ اُس کو فائدہ تھا۔ اُس نے گھوڑی کا رُخ اُس طرف کیا اور خانو کو دیکھنے کے لئے ذرا بلند جگہ پر چڑھ گیا۔ اُس کو خانو ایک بار پھر نظر آیا۔ باوا نُور نے اُس پر ریوالور کی گولی فائر کی اور گھوڑی کو اُدھر لے گیا لیکن گھوڑی گولی چلنے کے دھماکے کی عادی

نہیں تھی۔ وہ بدک گئی اور باوا نُور کے قابو میں آنے سے انکار کر دیا۔

باوا نُور کی بہت ہی لمبی سناتی ہوئی کہانی کو میں مختصر کر کے اِسی طرح سناؤں گا کہ کچھ وقت بعد یہ صورت بن گئی کہ گاؤں کے چھ سات آدمیوں اور باوا نُور نے گھیرے کی شکل اختیار کر لی۔ یہ سب غریب اور سادے سادے سے لوگ تھے۔ ان میں ایک آدمی فوج میں صوبیدار تھا۔ وہ چھُٹی آیا ہُوا تھا۔ اُس کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ باوا نُور نے اُس کو کہا تھا کہ مشکوک آدمی اُس کو دکھائی دے تو وہ اُس پر کارتوس فائر کر دے لیکن نشانہ اُس کی ٹانگوں کا لے تا کہ یہ شخص مرے نہیں، صرف زخمی ہو اور بھاگنے کے قابل نہ رہے۔ صوبیدار نے ایک کارتوس فائر کیا تھا اور ایک گولی باوا نُور نے ریوالور کی چلائی تھی۔ باقی آدمی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔ وہ سب بھاگتے دوڑتے رہے۔ مری کا علاقہ جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جان سکتے ہیں کہ وہاں چھُپنے اور بھاگ نکلنے کے چانس کتنے زیادہ ہیں۔ سورج بڑے پہاڑ کے پیچھے چلا گیا۔ کسی نے بڑے زور سے کہا کہ صوبیدار صاحب بے ہوش پڑے ہوتے ہیں۔

سب اُدھر دوڑے گئے۔ صوبیدار ایک ٹیکری پر مُنہ کے بل پڑا ہُوا تھا اور اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کی دو نالی بندوق بمع کارتوسوں کی بیلٹ کے غائب تھی۔ خانو گھیرا توڑ کر نکل گیا تھا اور سورج بھی غروب ہو گیا تھا۔ صوبیدار کو مری کے ایک ہسپتال میں لے گئے جہاں وہ ہوش میں آ گیا۔ اُس نے بیان دیا کہ اُس نے صرف ایک بار مفرور کو دیکھا اور اُس پر کارتوس فائر کیا تھا۔ اس کے تقریباً آدھا گھنٹہ بعد وہ ایک جگہ بیٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر اُس کی پگڑی اُتار دی اور سر پر کسی وزنی چیز سے ضرب لگائی، پھر وہ بیہوش ہو گیا۔

وہ خانو ہی ہو سکتا تھا جو گھوم پھر کر صوبیدار کے اُوپر آ پڑا تھا۔ اُس کی اس کارروائی سے پتہ چلا کہ وہ بہت ہی خطرناک ملزم ہے۔ البتہ یہ بات حیرت ناک تھی کہ اُس نے صوبیدار کو قتل نہیں کیا تھا۔ اُس نے جو ضرب لگائی

تھی وہ مہلک نہیں تھی۔ اس سے صوبیدار صرف بیہوش ہُوا تھا۔

باوا انُور نے تصدیق کردی کہ وہ خانُو ہی تھا جس گاؤں سے وہ آرہا تھا اور باوا انُور سے اُس کا آمنا سامنا ہُوا تھا، وہاں کے ہر فرد سے خانو کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ اُس روز خانو گاؤں کے تنور سے روٹی کھا کر نکلا تھا۔ مری کے دُور دُور تک کے علاقے میں لوگوں کو خانو کے بارے میں بتا دیا گیا۔ دو تھانوں نے خانو کی تلاش کے انتظامات کر دیئے۔

ایک مہینے کے قریب دن گزر رہے ہوں گے کہ ایک روز مری کے فوجی ہسپتال میں تین زخمی داخل کئے گئے اور ان کی اطلاع تھانے میں دی گئی۔ ان پر پولیس کا پہرہ لگانا تھا۔ ان کے بیان بھی لینے تھے۔ تھانیدار نے جو سب انسپکٹر تھا، باوا انُور اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر فوجی ہسپتال چلا گیا۔ وہاں اُس کو پتہ لگا کہ ان میں ایک زخمی اشتہاری ملزم خانو ہے۔ دوسرا اُس کا ساتھی تھا اور تیسرا خانو کی عمر کا آدمی تھا جس کا چہرہ خانو کے چہرے سے اتنا ملتا تھا کہ اُس کا جُڑواں بھائی لگتا تھا۔ ذرا غور سے دیکھنے سے دونوں کے چہروں کا فرق نظر آتا تھا۔

ان تینوں کو ریاست جموں وکشمیر کے علاقے سے پکڑا گیا تھا۔ اُس وقت جموں وکشمیر ڈوگرا مہاراجے کی ریاست تھی۔ ان زخمیوں کو مری لانے والے ڈوگرے پولیس والے تھے۔ خانو اور اُس کے ساتھی کو چاقو لگے تھے اور جو آدمی خانو کے مشابہ تھا، اُس کو ریوالور کی گولی بائیں بازو میں لگی تھی۔ اُس کا نام فقیر محمد تھا۔

ان کو گڑھی دوپٹہ کے تھانے کے علاقے سے آپس میں لڑتے ہوتے پکڑا گیا تھا۔ یہ علاقہ اب آزاد کشمیر میں ہے۔ دو میل سے ایک سڑک مظفر آباد کی طرف اور دوسری گڑھی دوپٹہ کی طرف جاتی ہے۔ یہی سڑک لیپا وادی تک چلی جاتی ہے۔ ان تینوں کی گرفتاری اس طرح عمل میں آئی کہ مہاراجہ کشمیر کی فوج کی ایک گاڑی اُس سڑک پر ایک جگہ رُکی جو لیپا وادی کی طرف جاتی ہے۔ اس میں سے چار فوجی اُترے اور قریبی پہاڑی کے دامن میں دو ٹیکریوں کے

درمیان سے اندر چلے گئے۔ وہ اپنے کسی فوجی کام کے لئے وہاں جا رہے تھے۔ ان میں دو افسر اور دو سپاہی تھے۔

ان ٹیکریوں کے پیچھے پیدل چلنے والوں کا راستہ تھا جو پہاڑیوں کے اندرونی علاقے میں اور ڈھلوانوں پر رہنے والوں کے لئے تھا۔ ان فوجیوں کو اندرونی راستے پر یہ منظر دکھائی دیا کہ چار پانچ آدمی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان کے کپڑے خون سے سُرخ تھے۔ دو گھوڑیاں فوجیوں کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔ ان پر دو سوار تھے۔ لڑنے والوں میں سے ایک نے ریوالور فائر کیا۔ گھوڑیوں کے سواروں نے فوجیوں کو بتایا کہ دو آدمیوں نے ان کو لُوٹنے کے ارادے سے روک لیا تھا اور ایک آدمی نے اُن کو رہزنوں سے بچایا ہے۔ فوجی افسروں کے پاس ریوالور اور سپاہیوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ انہوں نے لڑنے والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ گھوڑیوں کے سواروں کو بھی انہوں نے روک لیا تھا۔ ان میں ایک ہندو تاجر تھا۔ اُس کے پاس خاصی رقم تھی۔ گڑھی دوپٹہ کا تھانہ قریب تھا۔ ان سب کو وہاں لے گئے۔

اس تھانے میں بھی خانو کا فوٹو موجود تھا۔ ریاست کشمیر کا پولیس کا انتظام اور دیگر تمام نظام الگ تھا پھر بھی خانو کا فوٹو ریاست میں بھی بھیج دیا گیا تھا کیونکہ یہ شک تھا کہ وہ ان علاقوں میں بھی وارداتیں کرتا ہوگا۔ باوا انُور کو اچھی طرح یاد نہیں کہ خانو وہاں فوٹو سے پہچانا گیا تھا یا کسی اور طریقے سے پتہ لگا تھا۔ اسی وجہ سے ان کو فسٹ ایڈ دے کر مری بھیج دیا گیا تھا۔ ان میں سے کسی کے بھی زخم اتنے گہرے نہیں تھے کہ موت کا خطرہ ہوتا۔ ریاستی پولیس ویسے بھی اپنے کام سے جان چھڑانے والی پولیس تھی۔ اس پولیس کا ایک ہی کام تھا کہ مسلمان رعایا کو دبا کر رکھا جائے اور ان سے بیگار لی جاتے۔

مری میں راز کھُل گیا کہ جس نے ریوالور فائر کیا تھا وہ خانو ہے۔ اُس کا ریوالور قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ اُس کی چلائی ہوتی گولی فقیر محمد کو لگی تھی۔ مری کے فوجی ہسپتال میں انگریز فوجی ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے بڑی توجہ سے سب کی مرہم پٹی کر دی۔ سب زخمی بیان دینے کے قابل تھے۔ اگلے

روز بیان لینے کا سلسلہ شروع ہُوا۔ سب سے پہلے خانو سے تفتیش شروع ہوئی۔ اُس کو تھانیدار نے کہا کہ وہ تمام وارداتوں کا جو اُس نے کی ہیں اقبال کرے اور یہ بھی بتائے کہ وہ دو نالی بندوق کہاں ہے جو اُس نے صوبیدار کے سر پر ضرب لگا کر چھینی تھی۔

"مَیں نے؟" — خانو نے حیران ہو کر کہا — "میں نے کسی صوبیدار سے بندوق نہیں چھینی تھی ....کہاں کی بات کر رہے ہو؟"

بادا اُنور نے راولپنڈی میں خانو سے اقبالِ جُرم کرایا تھا۔ یہ مری تھانے کے سب انسپکٹر کو معلوم تھا اسی وجہ سے اُس نے بادا اُنور کو ساتھ بٹھا لیا تھا۔

"خانو!" — بادا انور نے اُس کو مری کے اُس گاؤں کا نام لے کر کہا — "گھوڑی پر مَیں سوار تھا جس کو دیکھ کر تم گاؤں سے نکل کر دوسری طرف اُتر گئے تھے تم نے مجھ کو نہیں پہچانا تھا، میں نے تم کو پہچان لیا تھا .... انکار کرنے سے پہلے وہ رات یاد کر لو جو تم نے میرے ساتھ گزاری تھی۔"

"اور مَیں تم کو یہ بھی بتا دیتا ہوں خانو!" — تھانیدار نے کہا — "کہ تم کو ہسپتال سے تھانے میں لے جاؤں گا اور تمہارے زخموں پر نمک چھڑک دوں گا۔ تم اشتہاری ملزم ہو اور بہت سی وارداتوں میں مطلوب ہو۔ اگر تم ہمارے ہاتھوں مر جاؤ گے تو بھی ہم سے باز پُرس نہیں ہو گی۔"

"میں اقبالی بیان ضرور دوں گا" — خانو نے کہا — "میں پکڑا گیا ہوں۔ میری شناخت ہو گئی ہے۔ میں تو بچ ہی نہیں سکتا لیکن میری یہ بات مان لو کہ میں اس گاؤں میں نہیں آیا اور میں نے کسی سے دو نالی بندوق نہیں چھینی۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ میں نے دو نالی بندوق کو کیا کرنا تھا۔ اتنی بڑی بندوق کو چُھپا کر چلنا پھرنا بہت مشکل اور مفرور کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔"

بادا اُنور نے بتایا کہ اُس کو گھیرے میں لے لیا گیا تھا اور اُس پر بندوق اور ریوالور سے فائر کیا گیا تھا۔ اُس نے یہ سُن کر کہا کہ اُس پر فائر ہوتا تو وہ ریوالور سے جوابی فائر کرتا۔

تھانیدار اور بادا اُنور نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے خانو سے دوسری وارداتوں کا اقبالی بیان لے لیا جائے پھر بندوق کا معاملہ چھیڑیں گے۔ انہوں نے خانو کو کہا کہ وہ اپنی وارداتیں پہلی سے آخری واردات تک سنانا شروع کرے۔ اُس نے ذرا دیر نہ لگائی اور ڈکیتی اور رہزنی کی سات وارداتیں سنا دیں۔ اُس نے یہ بھی بیان کیا کہ فرار ہو کر کہاں کہاں پھرتا اور رہتا رہا۔ میں تفصیل سے ہر واردات نہیں سنا رہا۔ میں آپ کو ایک اور کہانی سنا رہا ہوں جس کا تعلق فقیر محمد کے ساتھ ہے۔ فقیر محمد کو خانو کے ریوالور کی گولی لگ گئی تھی۔

خانو راولپنڈی سے فرار ہو کر مری کے علاقے میں آیا۔ دو تین وارداتیں یہاں کیں۔ اس نے ڈکیتی کی ایک واردات مری میں ایک انگریز افسر کے گھر کی تھی۔ یہ افسر سول کا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مری گیا تھا۔ خانو نے سُنا تھا کہ یہ انگریز ایسے محکمے میں تھا جہاں رشوت چلتی تھی اور یہ انگریز اپنے ایک ہندوستانی ماتحت کے ذریعے رشوت لیتا تھا۔ خانو نے اس کے خانسامے کو گھر بھیدی بنا لیا تھا۔ خانسامے نے اُس کو بتایا تھا کہ آج انگریز افسر کے گھر میں بہت رقم آئی ہے۔ دو ہندو اُس کو یہ رقم دے گئے تھے۔ انگریزوں کے گھروں میں سونے کے زیورات نہیں ہوتے تھے جس طرح ہمارے گھروں میں ہوتے ہیں۔ ان کے گھروں سے رقم ہی مل سکتی تھی۔

خانو نے خانسامے سے وہ الماری معلوم کر لی جس میں رقم رکھی تھی۔ وہ رات کو ایک کھڑکی کے راستے اندر گیا۔ خانسامے نے کھڑکی کی چٹخنیاں کھول کر آگے پردہ کر دیا تھا۔ خانو نے رقم والی الماری کا تالا توڑا تھا۔ وہ رقم نکال رہا تھا جب انگریز کی آنکھ کھُل گئی اور وہ اُٹھا۔ خانو نے ریوالور دکھا کر اُس کو فرش پر بٹھا دیا اور رقم لے کر چلا گیا اور پیچھے پولیس کو مصیبت میں ڈال گیا کیونکہ واردات ایک انگریز افسر کے گھر ہوئی تھی۔

وہ انگریزوں کی بادشاہی سے نکل کر کشمیر کی ریاست میں چلا گیا۔ اُس نے اسی علاقے میں رہزنی شروع کر دی جہاں سے پکڑا گیا تھا۔ اُس نے یہ واردات اس طرح بیان کی کہ وہ اپنے ساتھی کو لے کر اس ہندو تاجر کے

پیچھے چل پڑا جس کو اُس نے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ اس ہندو کو اُس نے ایک جگہ وصولی کرتے اور رقم گنتے کے اندر پہنی ہوئی واسکٹ کی جیب میں ڈالتے دیکھا تھا۔ ہندو کے ساتھ اُس کا نوکر دوسری گھوڑی پر سوار تھا۔

ایک جگہ خانو نے ہندو کو روکا اور ریوالور دکھا کر اُس سے رقم مانگی۔ ہندو گھوڑی سے اُتر آیا اور اُس کی منت کرنے لگا کہ اُس کو نہ لوٹے۔ اُس کا نوکر گھوڑی سے اُترا اور اُس نے خانو کا ریوالور والا ہاتھ پکڑ لیا۔ خانو کے ساتھی نے نوکر کے بازو پر چاقو مارا۔ نوکر زخم کھا کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ خانو کی پیٹھ پر پہلے ایک پتھر لگا۔ وہ گھوما تو ایک آدمی نے پیچھے سے آکر اُس کو چاقو مارا جو اُس کے ریوالور والے بازو پر لگا۔ اس آدمی نے اُس کا ریوالور والا بازو پکڑ کر اُوپر کر دیا۔ یہ آدمی فقیر محمد تھا۔ فقیر محمد کو خانو کے ساتھی نے تین بار چاقو مارا۔ فقیر محمد کو زخم آئے لیکن وہ پھرتیلا تھا اس لئے وار بچاتا رہا اور زخم گہرے نہ آئے۔

ریوالور اُوپر تھا لیکن نالی نیچے تھی۔ فقیر محمد نے خانو کا ریوالور والا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ خانو کی اُنگلی ٹریگر میں تھی جو دب گئی۔ گولی فقیر محمد کے بازو کے پٹھے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تاجر کے نوکر نے خانو کے ساتھی کو چاقو مارے۔ اتنے میں فوجی آگئے اور سب کو تھانے لے گئے۔

خانو کی وارداتوں کا حساب لگایا گیا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ خانو اُن دنوں مری کے علاقے میں نہیں تھا جہاں اس کو مشکوک حالت میں دیکھا گیا تھا۔

تھانیدار نے خانو کا بیان یہیں پر روک دیا اور باوا انور سے کہا کہ خانو نے اگر ساری وارداتیں مان لی ہیں تو اس کا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ مری کے اُس گاؤں میں نہیں آیا تھا جہاں اس کو گھیرے میں لیا گیا تھا۔ باوا انور کہتا تھا کہ اُس نے خانو کو ہی دیکھا تھا۔ تھانیدار کو خیال آگیا کہ فقیر محمد کا چہرہ خانو سے ملتا جلتا ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں جڑواں بھائی ہوں اور اکٹھے واردات کرتے وقت کسی وجہ سے آپس میں لڑ پڑے ہوں۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے خانو سے ہٹ کر فقیر محمد سے ہسپتال میں ہی پوچھ گچھ شروع کر دی گئی۔ پہلے تو اُس کو ایذا رسانی کی دھمکیاں دی

گئیں پھر اُس کو کہا گیا کہ وہ بالکل سچا بیان دے۔

"میں بالکل سچا بیان دوں گا جناب!" — فقیر محمد نے کہا — "میں چور یا رہزن نہیں ہوں۔ میں نے تو خود زخمی ہو کر ایک آدمی کو ان رہزنوں سے بچایا ہے۔ میں بھگوڑا فوجی ہوں اور میں ریاست کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں بزدل ہوں اور موت کے ڈر سے فوج سے بھگوڑا ہوا ہوں۔ بھگوڑا ہونے کی وجہ کوئی اور تھی جو میں آپ کو بتاؤں گا۔ اگر میں بزدل ہوتا تو ایک ڈاکو کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اُس پر چاقو سے حملہ نہ کرتا۔ میں نے ایک جرم ضرور کیا ہے۔ میں آپ سے وہ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ وہ یہ ہے کہ میرے پاس ایک دو نالی بندوق ہے جو میں نے ایک آدمی سے چھینی تھی۔"

تھانیدار نے مری کے اُس گاؤں کا نام لے کر پوچھا کہ یہ وہاں سے تو نہیں چھینی تھی؟

"جی ہاں" — فقیر محمد نے جواب دیا — "اُسی گاؤں سے۔ معلوم نہیں اُن لوگوں نے مجھ پر کیا شبہ کیا کہ مجھ کو پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے۔ ان لوگوں نے مجھ پر گولیاں بھی فائر کی تھیں۔ میں چھپتے چھپتے ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک آدمی نیلنگ پوزیشن میں ایک درخت کی آڑ لے کر بیٹھا ہوا تھا اور اُس کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ میں نے پیچھے سے جا کر اُس کی پگڑی اُتاری اور سر پر اس وجہ سے پتھر مارا کہ یہ بے ہوش ہو جائے گا۔ میں نے اُس کو قتل نہیں کرنا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تو میں نے یہ سوچ کر بندوق اور کارتوسوں کی بیلٹ اُٹھا لی کہ ہوائی فائر کر کے سب کو ڈراؤں گا اور بھاگ جاؤں گا۔ خدا نے میری مدد کی کہ میں وہاں سے نکل گیا۔"

فقیر محمد کے اس بیان سے یہ معمہ حل ہو گیا کہ گھیرے میں کون آیا تھا۔ باوا انور نے فقیر محمد کو کھڑا کر کے غور سے دیکھا تو اُس نے بھی مان لیا کہ وہ فقیر محمد ہی تھا۔ فقیر محمد نے اپنے بیان میں بتایا کہ پیچھے اس کے گھر میں ایک جوان بہن، ایک چھوٹا بھائی اور بوڑھے ماں باپ ہیں۔ بہن کے رشتے کے معاملے میں ایک گھر کے لوگ اُس کے والدین کو بہت بڑی دھمکیاں دیتے

تھے جن میں ایک یہ بھی کہ وہ اس کی بہن کو اغوا کر لیں گے۔ فقیر محمد نے اپنی پلٹن کے کمانڈنگ آفیسر کو اپنے باپ کے خط دکھاتے اور درخواست کی کہ اُس کے گھر کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ یہ ریاست کا معاملہ تھا اور اس ریاست میں مسلمانوں کو ڈوگرے کیڑے کوڑے سمجھتے تھے۔ فقیر محمد کی درخواست آئی تو کسی نے پرواہ ہی نہ کی۔ فقیر محمد کو باپ کے خط ملتے رہتے تھے۔ وہ تنگ آ کر فوج سے بھاگ آیا۔ اُس نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ بندوق چھین کر اپنے ساتھ لے جانے کا اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے گھر کے دشمنوں کو ڈرائے گا۔

فقیر محمد نے اپنے لمبے بیان میں کہا کہ وہ موت سے اور زخمی ہونے سے نہیں ڈرتا تھا، لیکن گرفتاری کا ڈر اُس کے دل پر بیٹھ گیا تھا۔ مری کے پیچھے والے گاؤں میں وہ گھیرے میں آیا تو گرفتاری کا ڈر اور زیادہ ہو گیا۔ وہ مری سے کشمیر کی طرف چل پڑا۔ وہ زیادہ تر سفر رات کو کرتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ دن کے وقت چھُپ چھُپ کر چلتا تھا۔ اُس نے دو تین مرتبہ گھوڑی پر سوار کسی نہ کسی آدمی کو اکیلے جاتے دیکھا۔ وہ بندوق دکھا کر ان میں سے کسی ایک سے گھوڑی چھین سکتا تھا لیکن اُس کا دل ایسا کوئی جُرم کرنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ وہ پیدل ہی چلتا گیا جس طرح وہ مری کے اس گاؤں کے اِردگرد رُکا تھا اس طرح وہ راستے میں ایک اور گاؤں کے اردگرد رُک گیا۔

اُس نے مری کے اُس گاؤں کے اردگرد تین چار دن رُکنے کا کوئی ٹھوس جواز نہ بتایا سوائے اس کے کہ وہ احتیاط کرتا تھا۔ آگے بھی وہ جہاں کہیں رُکا، احتیاط کی خاطر رُکا۔ تقریباً بیس دنوں بعد وہ گڑھی دوپٹہ کے تھانے کے علاقے میں پہنچ گیا جو ریاست کشمیر کا علاقہ تھا۔ فقیر محمد پہاڑیوں کے اندر اندر جا رہا تھا۔ اُس علاقے میں آج کل بھی جا کر دیکھیں تو پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر کہیں کہیں ایک ایک دو دو کچے کچے جھونپڑے نظر آئیں گے۔ اُس دَور میں بھی یہ جھونپڑے اسی طرح موجود تھے۔

فقیر محمد نے دیکھا کہ سورج غروب ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی بڑی تیز بارش شروع ہو گئی۔ اُس نے ایک پہاڑی کی ڈھلوان پر کچھ بلندی پر ایک مکان

دیکھا اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اتنی تیز بارش میں بندوق اور درختوں کا سہارا لے لے کر وہ اُس مکان تک پہنچ گیا۔ اُس وقت شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ فقیر محمد نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک جوان عورت تھی۔ فقیر محمد کی عمر خانو کی طرح تیس سال سے کچھ کم تھی۔ جس عورت نے دروازہ کھولا تھا وہ بھی تقریباً اسی عمر کی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ فقیر محمد کو دیکھ کر وہ عورت ڈر گئی۔ فقیر محمد دروازہ کھول کر عورت کی اجازت کے بغیر اندر چلا گیا۔

اندر جا کر اس عورت نے اُس کو کہا کہ میں اکیلی ہوں، صرف یہ ایک دودھ پیتا بچہ ہے۔ تم کس نیت سے آئے ہو؟

"ڈرو نہیں میری بہن!" — فقیر محمد نے اُس کو کہا — "مَیں کسی بُری نیت سے نہیں آیا۔ مجھ کو بھائی سمجھو اور یہاں پناہ دے دو۔ میں اپنے اور تمہارے درمیان خدا کی ذات کو رکھوں گا۔"

یہ عورت جس کو بعد میں باوا نُور نے دیکھا بھی تھا، کشمیر کے حُسن کا نمونہ تھی اور جوان بھی تھی۔ اُس کا ڈر بجا تھا، لیکن وہ فقیر محمد کو زبردستی گھر سے نہیں نکال سکتی تھی۔ اُس کی بندوق سے ڈرتی بھی تھی۔ وہ چُپ ہو گئی۔ فقیر محمد نے اُس سے پوچھا کہ اس گھر میں کوئی مرد ہے یا نہیں؟

"میرا مرد ہے" — عورت نے جواب دیا — "وہ فوج میں نائیک ہے۔ آج کل برما فرنٹ پر ہے۔"

"کیا وہ مہاراجے کی فوج میں ہے؟"

"نہیں" — عورت نے جواب دیا — "وہ انگریزوں کی فوج میں ہے۔ اگر تم کو یقین نہ ہو تو مَیں تم کو اُس کا خط بھی دکھا دیتی ہوں۔"

فقیر محمد کے کہنے پر اس عورت نے تین چار خط ایک سوٹ کیس میں سے نکال کر دکھا دیئے۔ ان میں دو خط جبل پور چھاؤنی سے لکھے گئے تھے۔ ان سے یہ پتہ چل گیا کہ اس عورت کا خاوند کون سی یونٹ میں ہے۔

"اس پلٹن کو مَیں جانتا ہوں" — فقیر محمد نے کہا — "مَیں نے تم کو

بہن کہا تھا لیکن اب بھابی کہوں گا کیونکہ فوجی آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ میں بھی فوجی ہوں اور میں جبل پور چھاؤنی سے ہی بھگوڑا ہو کر آیا ہوں۔ تمہارے خاوند کی پلٹن میری پلٹن کے ساتھ والی بارکوں میں تھی۔ میری جبل پور میں موجودگی میں ہی تمہارے خاوند کی پلٹن آگے چلی گئی تھی۔ میں نے تم کو اپنا راز دے دیا ہے۔ اگر یہ چاہتی ہو کہ میں تم کو اپنی بہن سمجھتا رہوں تو یہ راز اپنے دل میں رکھنا۔ یہ میری بندوق ہے، یہ اس کے کارتوس ہیں۔ یہ اپنے بستر کے نیچے رکھو۔ میں تم کو یہ بھی بتا دوں گا کہ اس میں کارتوس کس طرح ڈالا جاتا ہے اور یہ چلتی کیسے ہے۔ جب تم کو یہ خیال آئے کہ اس آدمی کو گولی مارنی ہے تو گولی مار دینا۔"

عورت چپ ہو گئی۔ اُس نے ایک دو کھیس اور چادریں نکال کر فقیر محمد کے لئے الگ چارپائی پر بستر بچھا دیا۔ عورت نے اُس کو ایک چادر بھی دی جو فقیر محمد نے بھیگے ہوئے کپڑے اُتار کر باندھ لی۔ عورت نے آگ جلائی پھر دونوں نے مل کر کپڑے خشک کئے جو فقیر محمد نے پہن لئے۔ عورت نے اُس کو مکئی کی روٹی ساگ کے ساتھ کھلائی۔ فقیر محمد بہت تھکا ہُوا تھا۔ وہ اس طرح سو گیا جیسے بیہوش ہو گیا ہو۔

اگلے دن اُس کی آنکھ کھلی تو وہ سخت گھبراہٹ کے عالم میں اُٹھا۔ دروازہ بند تھا۔ اُس نے باہر دیکھا۔ وہ عورت جس نے اپنا نام ہاشماں بتایا تھا، بچے کو گود میں لئے ہوئے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ فقیر محمد کا ارادہ یہ تھا کہ اُسی وقت اپنے گاؤں کو روانہ ہو جائے۔ اُس کا گاؤں ابھی پچاس ساٹھ میل دُور تھا۔ ہاشماں نے اُس کو بکریوں کے دُودھ کے ساتھ گھی میں پکی ہوئی مکئی کی روٹی کھلائی۔

جنگ کے زمانے میں جو فوجی محاذوں پر چلے جاتے تھے، ان کو آگے روپے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ فوجی اپنی تنخواہیں اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے کسی کے نام لکھوا دیتے تھے جو ہر مہینے گھر پہنچ جاتی تھیں۔ یہ فوج کا بڑا پکا انتظام تھا۔ سرکاری منی آرڈر ڈاکیے لے کر آتے تھے۔ ہاشماں کے خاوند نے اپنی تنخواہ اُسی کے نام لکھوائی تھی۔ فقیر محمد فوجی تھا، اس وجہ سے اُس کو اس سسٹم کا علم تھا۔ اُس نے کھانے کے دوران ہاشماں سے پوچھا

کہ اُس کو خاوند کی تنخواہ مل رہی ہے یا نہیں۔

"نہیں" — ہاشماں نے جواب دیا — "پہلے ٹھیک ملتی رہی ہے پھر ڈاکیے نے کہا کہ تم ڈاک خانے میں خود جا کر پیسے لے لیا کرو۔ میں چلی گئی۔ اُس ڈاک خانے میں صرف دو بابو ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک نے میرے ساتھ بڑی بُری باتیں کیں جن سے میں اُن کی نیت سمجھ گئی۔ وہ کہتے تھے کہ کبھی کبھی خود ہی یہاں آجایا کرو لیکن میں دوبارہ وہاں نہیں گئی۔ یہ چوتھا مہینہ ہے کہ میں اپنی عزت بچانے کی خاطر تنخواہ لینے نہیں گئی۔ ڈاکیا کبھی کبھی آتا ہے اور مجھ کو کہتا ہے کہ بابوؤں کا دل خوش رکھو تو تم کو منی آرڈر بھی جلدی ملے گا اور دو چار روپے فالتو بھی مل جایا کریں گے۔"

فقیر محمد اصل بات سمجھ گیا۔ ریاستی نظام میں ان بے کس لوگوں کا اور خاص کر مسلمان رعایا کا کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ فقیر محمد کو طیش آگیا۔ ہاشماں نے اُس کو رات ایک ہی کمرے کے گھر میں رکھ کر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ صبح کے وقت جب فقیر محمد گہری نیند سویا ہُوا تھا، ہاشماں باہر جا کر کسی بھی راہ جاتے آدمی کو بتا سکتی تھی کہ اُس کے گھر میں ایک بھگوڑا فوجی زبردستی چھپا ہُوا ہے لیکن اُس نے فقیر محمد کے لئے ایسا کوئی خطرہ پیدا نہ کیا۔ یہ فقیر محمد پر بہت ہی بڑا احسان تھا۔ فقیر محمد نے اپنے گاؤں جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اُس نے ہاشماں کو کہا کہ وہ اس کی تنخواہ کا انتظام کر کے جائے گا۔

اُس نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ اُسی دن ڈاکخانے چلا گیا۔ یہ بہت ہی چھوٹا سا ڈاکخانہ تھا جس میں صرف دو بابو اور دو ڈاکیے تھے۔ فقیر محمد نے معلوم کر لیا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دونوں ہندو تھے اور ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ اسی مکان کے ایک کمرے میں ڈاکخانہ بنا ہُوا تھا۔ چھوٹا بابو ڈاکخانے کے ساتھ والے کمرے میں رہتا تھا اور بڑے بابو کی رہائش بالکل ساتھ تھی۔ بیوی اور دو بچے اُس کے ساتھ تھے۔

رات کو فقیر محمد دونالی بندوق لے کر ڈاک خانے چلا گیا اور چھوٹے بابو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بابو نے جاگ کر دروازہ کھولا تو دونالی بندوق کی

نالی اُس کے سینے سے لگ گئی۔ فقیر محمد نے اُس کو کہا کہ میرے ساتھ چلو اور اپنے بڑے کو جگاؤ۔

یہ کوئی بنوں کے علاقے کا ہندو تھا۔ ڈر سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ فقیر محمد کے آگے آگے چل پڑا اور پچھواڑے والے دروازے پر زور زور سے دو تین ہاتھ مار کر بڑے بابو کو آوازیں دیں۔ بڑا بابو اس کی آواز پہچان کر اُس کو بُرا بھلا کہتا ہُوا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ فقیر محمد نے چھوٹے بابو کو بندوق سے دھکیلا اور اندر لے گیا۔ بڑے بابو کو اُس نے لالٹین جلانے کو کہا۔ وہاں ان کی مدد کے لئے آنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ شہر یا قصبے جیسی آبادی نہیں تھی۔ فقیر محمد نے اپنا چہرہ پگڑی میں لپیٹا ہُوا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔

اس مکان کا ایک ہی کمرہ اور صحن تھا۔ فقیر محمد دونوں کو اس کمرے میں لے گیا۔ وہاں اُس کی بیوی تھی جو جاگ اُٹھی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے سوئے ہوئے تھے۔

"کیا تم اس آدمی کی بیوی ہو؟" ـــــ فقیر محمد نے اس عورت سے پوچھا ـــــ "ان بچوں کی ماں ہو؟"

عورت سخت ڈری ہوئی تھی۔ اُس نے سر ہلایا۔ وہ بڑے بابو کی بیوی تھی۔

"اپنے خاوند کو کہو کہ ہاشماں نام کی ایک عورت کے خاوند کی چار مہینوں کی تنخواہ اُس کو دے دے" ـــــ فقیر محمد نے کہا ـــــ "اگر کل ڈاکئے نے اُس کو پوری رقم نہ دی تو یہ دونوں بچے تم کو ساری عمر نہیں ملیں گے۔ ان کو یہاں گولی مار جاؤں گا یا اُٹھا کر لے جاؤں گا"

ایسی دھمکی کوئی ماں برداشت نہیں کر سکتی۔ فقیر محمد نے بڑے بابو کی بیوی کو بتایا کہ ان دونوں نے ہاشماں کے خاوند کے بھیجے ہوئے پیسے کیوں روکے ہوئے ہیں اور انہوں نے اُس کو کیا کہا تھا۔ یہ قصہ سُن کر بڑے

بابو کی بیوی نے اپنے خاوند کو کوسنا شروع کر دیا پھر روتے ہوئے اُس نے فقیر محمد کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ چلا جائے۔

"میں اتنا بڑا ڈاکو ہوں کہ پولیس بھی مجھ سے ڈرتی ہے" ـــــ فقیر محمد نے ان کو ڈرانے کے خیال سے کہا ـــــ "میں چلا جاؤں گا۔ تم میرے شاگردوں کو نہیں جانتے۔ اگر تم نے پھر کبھی ہاشماں کو اس طرح تنگ کیا یا پولیس کو اطلاع دی کہ ہاشماں کا تعلق ایک ڈاکو کے ساتھ ہے تو اپنا انجام سوچ لو۔ ہاشماں میری منہ بولی بہن ہے۔ تم اس کے خاوند کی تنخواہ کھا رہے ہو۔ میں تم دونوں کو گرفتار بھی کرا سکتا ہوں۔ ریاست کی پولیس میرے ہاتھ میں ہے"۔

فقیر محمد ان کو ڈرا دھمکا کر ان کا خون خشک کرتا رہا پھر وہاں سے آگیا۔ دل میں تو وہ خود بھی ڈرا ہُوا تھا کہ پکڑا ہی نہ جائے۔ وہ فوج کا بھگوڑا تو تھا ہی، اس کے قبضے میں بلا لائسنس بندوق بھی تھی جو چوری کی تھی۔

دوسرے دن ڈاکیا ہاشماں کے گھر آیا اور چار مہینوں کی تنخواہ دے گیا لیکن اُس نے کسی سادے کاغذ پر بھی ہاشماں کا انگوٹھا نہ لگوایا۔ وہ ایک بھی منی آرڈر نہیں لایا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاک خانے کے بابو منی آرڈروں پر جعلی انگوٹھے لگاتے رہے تھے۔

فقیر محمد نے اور زیادہ دلیری یہ دکھائی کہ چار پانچ دن وہیں رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہاشماں کو کوئی تنگ کرنے تو نہیں آتا۔ تھانیدار نے اُس کا بیان لیتے ہوئے جب اُس کے یہ الفاظ سُنے کہ وہ چار پانچ دن ہاشماں کے ساتھ رہا تو اُس نے ہنس کر فقیر محمد کو کہا کہ اُس نے دل سے تو ہاشماں کو مُنہ بولی بہن نہیں بنایا ہو گا۔

"سب حال خدا جانتا ہے" ـــــ فقیر محمد نے انگلی آسمان کی طرف کر کے کہا ـــــ "ہاشماں کو میرے اُوپر اعتبار آگیا تھا۔ ایک رات کی بات سنا دیتا ہوں۔ میں سویا ہوا تھا۔ ساری رات بچے کے لئے لالٹین جلتی رہتی تھی۔ بتی مدہم رکھتے تھے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کسی نے میرے چہرے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ میں نے ہاشماں کو دیکھا۔ وہ میری چارپائی کے پاس کھڑی تھی۔ اُس نے جب

دیکھا کہ میری آنکھ کھل گئی ہے تو وہ تیزی سے اپنی چارپائی پر چلی گئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اُس کو اپنے پاس بلایا۔ وہ میرے پاس آئی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ میری چارپائی کے پاس کیا کر رہی تھی۔ اُس نے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں سمجھتا تھا۔ اُس کا خاوند دو سالوں سے گھر سے گیا ہوا تھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں اُس کو بہن سمجھتا ہوں۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی مانگی۔ صبح اس نے پھر مجھ سے معافی مانگی اور کہنے لگی کہ مجھ کو بدچلن نہ سمجھ لینا۔ میں نے ایسی حرکت تو کبھی سوچی بھی نہیں تھی .... تھانیدار صاحب! اگر میں ایسا بد ہوتا تو پہلی رات ہی اپنی نیت ظاہر کر دیتا۔"

اس سے اگلے دن فقیر محمد وہاں سے نیچے اُترا۔ اُس نے بندوق ہاشماں کے بستر کے نیچے چھپائی ہوتی تھی۔ اُس کے پاس عام قسم کا ایک چاقو تھا۔ اُس نے دیکھا کہ دو آدمی ہندو تاجر کو روکے کھڑے تھے۔ فقیر محمد ان کے پیچھے تھا۔ اُس کو رہزن نہ دیکھ سکے۔ جب خانو نے ریوالور نکالا اور ہندو کے نوکر نے خانو کا ریوالور والا بازو پکڑا تو فقیر محمد سمجھ گیا کہ رہزنی ہو رہی ہے۔ اُس نے انسانی ہمدردی کی خاطر اور فوجی ٹریننگ کے تحت ہندو کو بچانا اپنا فرض سمجھا۔ اُس نے ایک بار پتھر اُٹھا کر پیچھے سے خانو کو مارا پھر بہت تیزی سے چاقو نکال کر خانو پر حملہ کیا۔ اس فرض کی خاطر اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ خود بھی پکڑا جائے گا۔

تھانیدار نے یہ کارروائی کی کہ ریاست میں جا کر ہاشماں کے گھر سے صوبیدار کی بندوق کی برآمدگی کی اجازت پولیس کپتان سے طلب کی۔ اجازت ملنے پر وہ فقیر محمد کو زیرِ حراست لے کر کشمیر گیا اور فقیر محمد کی نشاندہی پر بندوق برآمد کی۔ باوا انور اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے مجھ کو بتایا کہ ہاشماں بہت خوبصورت عورت تھی۔ اُس کا بھی بیان لیا گیا جو فقیر محمد کے بیان سے ملتا تھا۔ باوا انور نے مجھ کو بتایا کہ ہاشماں نے بڑی دلیری سے بیان دیا۔ ایسا بیان کوئی سچا آدمی ہی دے سکتا ہے۔

چونکہ خانو کا موقعہ واردات بھی وہیں تھا اس لئے خانو اور اُس کے

ساتھی کو بھی وہاں لے گئے۔ تھانیدار نے موقعہ واردات دیکھ کر اُدھر ہی متعلقہ افراد سے بیانات لئے۔ ان میں ملزم بھی شامل تھے اور گواہ بھی۔ ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خانو اور اس کے ساتھی کا جُرم ثابت ہو گیا۔ باوا انور نے مجھ کو یہ کہانی سناتے ہوئے بتایا کہ خانو کا ذہن اتنا زیادہ مجرمانہ تھا کہ اُس نے صرف سات وارداتوں کا اقبال کیا تھا لیکن اُس کے اقبال پر اعتبار نہ کیا گیا۔ باوا انور ایذا رسانی کا ماہر تھا۔ اس نے خانو سے چار مزید وارداتوں کا اقبال کروا لیا۔ تھانیدار کا بیان تھا کہ خانو نے ایک دو آدمیوں کو قتل کیا ہوگا لیکن خانو کہتا تھا کہ یہ اُس کا ایمان تھا کہ کسی کو قتل نہیں کرنا۔ اُس کا یہ بیان صحیح نکلا۔

پولیس نے خانو اور اُس کے ساتھی کے خلاف مقدمہ تیار کر کے عدالت میں بھیج دیا اور فقیر محمد کو اُس کی پلٹن میں زیرِ حراست بھجوا دیا گیا۔ اس پر ایک تو یہ فوجی الزام تھا کہ وہ فوج سے بھگوڑا ہوا تھا اور دوسرا الزام شہری قانون کے مطابق یہ تھا کہ اُس نے ایک آدمی کو زخمی کر کے اُس سے اُس کی بندوق چھینی تھی۔ انگریز صحیح معنوں میں بادشاہ قوم تھی۔ فقیر محمد کی پلٹن کا کمانڈر انگریز تھا۔ اُس نے فقیر محمد کا بیان سُنا پھر اس کی تصدیق مری تھانے سے کروائی۔ ادھر عدالت میں خانو اور اُس کے ساتھی کے خلاف مقدمہ چل رہا تھا جس میں فقیر محمد بھی گواہ تھا اور ہاشماں بھی گواہ تھی۔ انگریز کمانڈنگ آفیسر کو جب پتہ لگا کہ فقیر محمد نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ایک ایسے خطرناک اشتہاری ملزم کو پکڑا تھا جو ایک درجن ڈکیتی اور رہزنی کی وارداتوں میں مطلوب تھا تو اس انگریز افسر نے فقیر محمد کی سفارش اُوپر بھیجی کہ اس کو کم سے کم سزا ملنی چاہئے۔ فقیر محمد کچھ عرصے بعد چھٹی آیا تو مری تھانے میں بھی باوا انور اور تھانیدار سے ملنے آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کے بارے میں فقیر محمد نے بتایا کہ ہاشماں کا خاوند ہے۔ اس کی پلٹن برما فرنٹ سے واپس آگئی تھی اور وہ کچھ دنوں کی چھٹی آیا تھا۔ فقیر محمد نے بتایا کہ اُس کے کمانڈنگ آفیسر کو یہ بھی پتہ لگ گیا تھا کہ وہ ہاشماں کے گھر رُکا رہا تھا اور اس

کو رُکی ہوئی تنخواہ دلواتی تھی۔

دورانِ جنگ فوج سے بھگوڑا ہونے والوں کا کورٹ مارشل ہوتا تھا جس کی کم سے کم سزا دو سال تھی۔ فقیر محمد کا بھی کورٹ مارشل ہونا تھا۔ اُس کے دو جرم تھے لیکن اُس کے کمانڈنگ آفیسر کی سفارش کام کر گئی۔ اُس کے اوپر والوں کی منظوری سے اُس کے کمانڈنگ آفیسر نے صرف اٹھائیس دن کوارٹر گارڈ کی قید کی سزا دی۔ اُس پر صرف یہ الزام لگایا گیا کہ باقاعدہ طور پر چھٹی لئے بغیر غیر حاضر ہُوا۔ باوا انور کی رائے یہ ہے کہ خانو نے مری میں ایک انگریز افسر کے گھر میں ڈکیتی کی واردات کی تھی اور فقیر محمد نے خانو کو پکڑا تھا اس لئے فقیر محمد کو اس کے انگریز کمانڈنگ آفیسر نے یہ انعام دیا کہ اس کو کئی سالوں کی جیل کی سزائے قید سے بچا لیا۔ باوا انور کہتا ہے کہ فقیر محمد کو دراصل خدا نے اس نیکی کے صلے میں بچایا تھا جو اس نے ہاشماں کے ساتھ کی تھی۔ ہاشماں کے ساتھ اُس کی نیکی صرف یہ نہیں تھی کہ اُس کو اُس کے خاوند کی رُکی ہوئی تنخواہ دلوائی تھی بلکہ اصل نیکی یہ تھی کہ اتنی خوبصورت اور جوان عورت کے ساتھ اتنے دن اکیلے رہ کر بھی اُس نے اپنی نیت کو خراب نہیں ہونے دیا تھا حالانکہ ایک رات اس عورت کی نیت خراب ہو گئی تھی۔

پیاسے

تھانیداروں کی کہانیاں آپ کے رسالے میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ میں نے تھوڑا عرصہ تھانیداری کی تھی۔ بھائی احمد یار خان صاحب کی طرح سنگین وارداتوں کی تفتیش بھی کی ہے۔ پہلے میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ کسی واردات کی تفتیش کی کہانی سناؤں گا لیکن بہت ساری سوچ بچار کے بعد مجھ کو اچھا یہ لگا کہ اپنی کہانی سُنا دوں۔ آپ اس کو آپ بیتی کی ذیل میں رکھ لیں۔

یہ اُسی زمانے کی کہانی ہے جس زمانے کی کہانیاں میرے دونوں تھانیدار بھائی آپ کو سناتے رہتے ہیں۔ میں نے پولیس کی نوکری اس وجہ سے نہیں کی تھی کہ مجھ کو یہ نوکری پسند تھی بلکہ مجھ کو نوکری کرنے کی ضرورت تھی۔ پولیس میں نہ کرتا تو کسی اور محکمے میں کر لیتا۔ اُس زمانے میں نوکری ملتی ہی نہیں تھی۔ وہ بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ مجھ کو ایک نیک آدمی اپنے ساتھ لے گیا اور اُس کی کوشش سے مجھ کو ایک انگریز ڈی ایس پی کے پیش کیا گیا۔ میری صحت اچھی تھی اور قد بھی اچھا تھا۔ اس انگریز افسر نے مجھ کو ڈائریکٹ اے ایس آئی (اسسٹنٹ سب انسپکٹر) بھرتی کرا دیا۔

میں نے پوری تابعداری سے ٹریننگ کی اور مجھ کو پولیس لائنز میں بھیج دیا گیا۔ ایک سال بعد مجھ کو دیہاتی علاقے کے ایک تھانے میں تعینات کر دیا گیا۔ لوگ مجھ کو چھوٹا تھانیدار کہتے تھے۔ سب علاقے پر اپنا رعب تھا۔ بڑی بڑی جاگیروں والے بھی سلام کرتے تھے۔ اس تھانے کا انچارج ایک ہندو سب انسپکٹر تھا۔ میرے ساتھ تو وہ ٹھیک رہتا تھا لیکن مسلمانوں کے خلاف دل میں کھوٹ رکھتا تھا۔ اس نے پہلے تو مجھ کو چوری کی دو تین وارداتوں کی

تفتیش دی پھر ایک واردات قتل کی ہو گئی۔ قتل ہونے والا مسلمان تھا۔ اُس کی لاش کھیتوں میں پڑی ہوئی تھی۔

میرے انچارج سب انسپکٹر نے یہ تفتیش مجھ کو دے دی۔ مجھ کو ابھی اتنا تجربہ نہیں تھا۔ دیہات میں ایک طرح کے قتل آپس کی عداوت پر ہوتے تھے۔ ان کے ملزموں کو پکڑنا بہت آسان تھا۔ پتہ لگ جاتا تھا کہ مقتول کی خاندانی عداوت کس کے ساتھ تھی اور مقتول کے خاندان نے اُس خاندان کا ایک آدمی قتل کیا تھا۔ اُس گاؤں کے نمبردار وغیرہ سے ساری باتیں معلوم ہو جاتی تھیں۔ ہم دو تین آدمیوں کو مشتبہ بٹھا لیتے تھے۔ پہلے شرافت سے پوچھتے تھے۔ جب شرافت کام نہیں کرتی تھی تو ہم دوسرا نسخہ استعمال کرتے تھے جس کو تھرڈ ڈگری کہتے ہیں۔ یہ ڈگری کالج والی نہیں ہوتی۔ یہ جس کو ملتی ہے وہ باقی عمر یاد رکھتا ہے۔ ہم مشتبہوں کو یہ ڈگری دیتے تھے تو ایک نہ ایک آدمی مان جاتا تھا کہ قتل اُس نے کیا ہے، مگر میرے ایس ایچ او سب انسپکٹر لچھمن پال نے مجھ کو قتل کا جو کیس برائے تفتیش دیا، وہ اُس طرح کی واردات زیر دفعہ ۳۰۲ تھی جس کی وجہ خاندانی عداوت نہیں تھی۔ اس طرح کی وارداتوں کی تفتیش بہت مشکل ہوتی ہے۔

میں نے لچھمن پال کو جس کو پولیس والے اور دوسرے لوگ لچھا تھانیدار کہا کرتے تھے، کہا کہ جناب، مجھ کو خوار نہ کریں۔ میں ایسا ایک کیس آپ کے ساتھ کر لوں گا تو مجھ کو تھوڑی عقل آ جائے گی۔ لچھا بولا کہ دریا میں اُترو گے تو اپنے آپ تیرنا آ جائے گا۔

"میں اِدھر موجود ہوں" — اُس نے کہا — "مشکل ہوئی تو میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں گا۔ اس کام میں پڑو گے تو تم کو خود عقل آ جائے گی۔ مخبر تمہاری مدد کریں گے۔ بے غم ہو کر جاؤ" — اُس نے مجھ کو بہت حوصلہ دیا پھر مسکرانے لگا۔ اُس نے کہا — "تم خوبصورت جوان ہو اور تمہاری صحت بھی بہت اچھی ہے۔ اپنے خون کو ٹھنڈا رکھنا۔"

اُس کی یہ بات میری سمجھ میں نہ بیٹھی۔ میں بیوقوفوں کی طرح اُس کا مُنہ دیکھتا رہا۔

"نہیں سمجھے؟" — اُس نے کہا — "میں اچھی طرح سمجھاتا ہوں۔ قتل کی یہ واردات ایسی ہے کہ اس میں بہت سارے لوگ سامنے آئیں گے۔ ان میں عورتیں بھی ہوں گی۔ اس برادری کی بعض عورتیں بہت خوبصورت ہیں۔ یہ سب لوگ تم کو خوش کرنے کی بہت کوشش کریں گے۔"

"میں رشوت نہیں لوں گا" — میں نے کہا۔

"وہ تمہاری مرضی ہے، لو یا نہ لو" — لچھے تھانیدار نے کہا — "کسی عورت کے چکر میں نہ پڑ جانا۔ میں نے کہا ہے نا، کہ اس برادری کی عورتیں بہت خوبصورت ہیں۔ اگر تمہارا کان دھیان اُدھر ہو گیا تو تفتیش نہیں کر سکو گے۔ اپنی سروس اور ترقی پر دھیان دینا۔"

میں نے اُس کو ہنس کر ٹال دیا۔ میں نے رشوت کا لالچ کبھی نہیں کیا تھا اور اُس جوانی میں بھی عورت کو دل میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نیک اور نمازی آدمی تھا لیکن میں بدمعاش آدمی بھی نہیں تھا۔

میرے دل میں ڈر اس بات کا تھا کہ لچھے تھانیدار کا دل مسلمانوں کے حق میں صاف نہیں تھا۔ مجھ کو ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل نے موقعۂ واردات پر روانہ ہونے سے پہلے کہا کہ ہوش قائم رکھ کر تفتیش کرنا۔ اس ہندو سب انسپکٹر کو موقع مل گیا تو نقصان پہنچائے گا۔ میں لچھے کی نیت سمجھ گیا۔ اُس نے مجھ کو بدنیتی سے یہ کیس دیا تھا۔

میں اتنا اناڑی بھی نہیں تھا۔ مجھ کو اپنے اُوپر اعتماد تھا۔ میرا حوصلہ اور دل بہت مضبوط تھا۔ میں نے لچھے تھانیدار سے کہا کہ مجھ کو میری مرضی کے آدمی دے دو۔ اُس نے کہا جس کو چاہتے ہو اُس کو ساتھ لے جاؤ۔ میں نے مسلمان ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ رکھ لیا اور تین کانسٹیبل بھی اپنی پسند کے لے لئے۔ ان میں دو ہند و تھے اور ایک مسلمان۔ ان سب کو ساتھ لے کر میں اُس

گاؤں میں چلا گیا جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی۔

ایسی کہانیاں آپ نے بہت پڑھ لی ہیں کہ لاش فلاں جگہ پڑی تھی۔ تھانیدار پہنچا۔ اُس نے کھُرے دیکھے۔ لاش کو اچھی طرح دیکھا پھر پوسٹمارٹم کے لئے بھجوا دیا۔ اسی طرح میں نے بھی لاش دیکھی۔ کھوجی ساتھ تھا۔ اُس نے کھُرے دیکھے اور میں نے وہ ساری کارروائیاں کیں جو موقعۂ واردات پہ تھانیدار کیا کرتے ہیں۔ اس مقتول کو چھُریوں یا خنجروں سے مارا گیا تھا۔ کھُروں سے پتہ لگا کہ مقتول کے ساتھ یا قاتلوں کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔

میں آپ کو اس قتل کی کہانی نہیں سناؤں گا۔ میں اپنا جرم سناؤں گا۔ میں نے چوپال کو تفتیش کا دفتر بنا لیا تھا۔ ذیلدار، نمبردار اور دو مخبروں نے مجھ کو مقتول کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں۔ اُس کے بارے میں پتہ لگا کہ اپنے آپ کو خوبصورت اور بدمعاش سمجھتا تھا اور عورتوں کے ساتھ دوستی لگانے کا اُس کو نشہ تھا۔

یہ تو مقتول کے بارے میں رپورٹ تھی، مجھ کو قاتل کی ضرورت تھی۔ اُس کے بارے میں مجھ کو کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ میں اور میرا عملہ گاؤں کا مہمان تھا۔ وہاں کے لوگوں نے ہم کو مُرغ، انڈے، مکھن اور پراٹھے بہت کھلائے۔ اس گاؤں میں ایک مسلمان خاندان تھا۔ اس خاندان کی زمین بہت زیادہ تھی اس لئے روپیہ پیسہ بھی بہت تھا اور اس خاندان میں مرد بھی بہت تھے۔ اس وجہ سے یہ خاندان قانون سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس کے لئے قتل کر دینا ایسے تھا جیسے مکھی مار ڈالی۔ اس خاندان کی عورتیں خوبصورت تھیں اور اپنے مردوں کی طرح مضبوط دل رکھتی تھیں اور مردوں کی طرح قتل کر سکتی تھیں۔

دوسرے دن کا سورج ڈوب گیا تو میرے پاس دو عورتیں لائی گئیں۔ مقتول کی ان کے ساتھ دوستی تھی۔ یہ دونوں ہندوؤں کی جوان عورتیں تھیں۔ ان سے ایک مسلمان عورت کا پتہ مل گیا۔ مسلمان ہیڈ کانسٹیبل میری بہت مدد کر رہا تھا۔ اُس کو بہت تجربہ تھا۔ ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے تفتیشی افسر وہ

ہے میں نہیں۔

تفتیش کو آگے چلانے کے لئے میرے ہاتھ میں تین عورتیں آگئیں تو ان سے دو تین آدمیوں کا پھر ان آدمیوں سے دو اور عورتوں کا پتہ چلا۔ میرا کام اب یہ تھا کہ ان سب کو باری باری اپنے پاس بٹھا کر تفتیش کرنی تھی۔ ایک ایک کے ساتھ تین تین چار چار گھنٹے لگ جاتے تھے۔

ان میں ایک اور جوان عورت شامل ہو گئی لیکن مقتول کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ یہ عورت اُس خاندان کی تھی جس کے بارے میں میں نے لکھا ہے کہ قتل کو معمولی بات سمجھتا تھا۔ یہ عورت مشتبہ نہیں گواہ تھی۔ اُس کا نام میرے سینے پر لکھا ہُوا ہے اور آج بھی اُس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے اور میں اپنی آنکھوں میں اُسی کی تصویر لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔ میں اُس کا وہ نام نہیں لکھوں گا جو میرے سینے پر لکھا ہُوا ہے۔ آپ اُس کا نام ممتاز رکھ لیں۔

ممتاز جب چوپال کے اُس کمرے میں داخل ہوئی جہاں میں پلنگ پر بیٹھا ہُوا تھا تو میرا دل اُچھل پڑا۔ وہ بہت خوبصورت عورت تھی۔ اُس کا قد اور اُس کے جسم کی بناوٹ میں قدرت نے اپنا سارا آرٹ ڈال دیا تھا۔ اُس کا چہرہ اتنا دلکش کہ مجھ کو صاف پتہ چلا کہ اُس نے مجھ کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ مَیں تھانیداروں یا پیروں کی طرح پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اُس کو دیکھ کر میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پلنگ کے پاس ایک مُوڑھا رکھا تھا۔ مَیں نے مُوڑھے کی طرف اشارہ کر کے اُس کو کہا کہ بیٹھ جاؤ۔

اُس کی عمر چھبیس ستائیس سال تھی۔ اُس وقت میری عمر اکیس سال تھی۔ میں اُس کو تھوڑی دیر تک دیکھتا ہی رہا لیکن میرے دیکھنے میں بدمعاشی والا معاملہ نہیں تھا۔ میرے دل میں احترام بھی آگیا اور پیار بھی۔ میں نے واردات کے بارے میں پوچھنے کی بجائے اُس سے اُس کی ذاتی باتیں پوچھنی شروع کر دیں۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے اپنا ایک ہاتھ پلنگ پر رکھا۔ میں نے اُس کا یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ پہلی عورت تھی جس کا میں نے ہاتھ

اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ ہاتھ نہیں تھا، کوئی بہت ہی خوبصورت چیز تھی۔
میں نے اس ہاتھ کے ساتھ اس طرح کھیلنا شروع کر دیا جس طرح بچہ کھلونے
کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اُس وقت میں نے ممتاز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔ اس
مسکراہٹ نے اُس کے حسن کو کوئی اور ہی رنگ دے دیا۔

"تم شاید کسی کی بیوی ہو؟" —— میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں" —— اُس نے جواب دیا —— "میرا خاوند ہے۔"

"وہ تم کو بہت اچھا لگتا ہوگا۔"

"بس خاوند ہے" —— اُس نے کہا اور ہنس پڑی —— "اُس کے ساتھ
میرا جھگڑا ہے۔ میں تین مہینوں سے اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوتی ہوں۔"

"وہ تو تم پر مرتا ہوگا" —— میں نے کہا —— "اگر اس نے تم کو ماں باپ
کے گھر بٹھا دیا ہے تو وہ بیوقوف آدمی ہے۔"

"وہ مجھ کو صرف بیوی سمجھتا ہے" —— ممتاز نے کہا —— "کہتا ہے کہ میرا
ہر حکم مانو۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ اُس کے دل میں میری محبت ہے یا نہیں۔"

یہاں سے بات چل پڑی تو میں بالکل بھول گیا کہ میں تھانیدار ہوں
اور اس عورت کو میں نے تفتیش کے لئے بلایا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ
عشق و محبت کی باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے بُرا نہیں مانا۔ اس عورت نے
میرے اُوپر جادو جیسا اثر کر دیا، یا اس کو آپ نشہ کہہ لیں جس نے میرا دماغ
میرے ہاتھ سے نکال دیا۔ مجھ کو بالکل پتہ نہیں چلا کہ میں نے کب اُس کو
مُوڑھے سے اُٹھا کر اپنے پلنگ پر بٹھا لیا، پھر اُس کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

مجھ کو اچانک اس طرح دھکّہ لگا جیسے ممتاز نے مجھ کو غصے میں آ کر
پیچھے دھکیل دیا ہو، لیکن اُس نے مجھ کو دھکّہ نہیں دیا تھا۔ وہ تو پہلے سے زیادہ
میرے قریب ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھ سے یا اُس کے ہاتھ سے کوئی ایسی حرکت
ہو گئی تھی جس نے مجھ کو جگا دیا اور میرا نشہ اُتار دیا۔

"نہ ممتاز!" —— مَیں نے اُس کو کہا —— "تم مُوڑھے پر بیٹھو۔"

اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ ہٹ گئی اور وہ شاید یہ سوچ کر ڈر گئی

کہ تھانیدار اُس سے ناراض ہو گیا ہے۔ وہ پلنگ سے مُوڑھے پر ہو گئی اور
میرا مسکرادینے تھا۔ مَیں نے اُس کے دل سے ڈر دُور کر دیا اور اُس کے چہرے
پر اطمینان آ گیا۔ وہ جو مجھ کو دھکّہ لگا تھا وہ میرے اپنے ذہن میں پیدا ہُوا تھا۔
مجھ کو اپنی گذری ہوئی زندگی یاد آ گئی تھی۔ میں نے بہت سوچا کہ ممتاز کو یہ ساری
باتیں بتا دوں یا نہ بتاؤں۔ مجھ کو یہی سوچ پسند آئی کہ یہ عورت شکل صورت
اور ڈیل ڈول کی وجہ سے کسی شاہی خاندان کی شہزادی لگتی ہے اور شاید اس
کا دماغ بھی شہزادیوں جیسا ہوگا مگر وہ دیہات کی اَن پڑھ عورت تھی۔ میں اُس
کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ میرے جذبات کو سمجھے گی۔

میں آپ کو بتاتا ہوں۔ مجھ کو اپنی ماں تھوڑی تھوڑی یاد ہے۔ وہ فوت
ہو گئی تھی۔ میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا، اور جس وقت میرا باپ فوت ہُوا
اُس وقت میری عمر پانچ سال تھی۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ میرا ایک چچا تھا۔
وہ مجھ کو اپنے گھر لے گیا۔ اُس کے اپنے دو بچے تھے۔ مَیں آپ کو یہ بھی بتا دوں
کہ ہم بہت معمولی سے لوگ تھے۔ دو وقت کی روٹی کی کوئی محتاجی نہیں تھی
لیکن مَیں نے کبھی ایک پیسہ اپنے ہاتھ میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس زمانے کا ایک
پیسہ بھی آج کے ایک روپے کے برابر تھا۔ خوشحال گھروں کے بچے ایک پیسہ
لے کر سکول جایا کرتے تھے۔

مجھ کو چچا کے گھر میں کوئی تنگی نہیں ہوتی۔ چچی جو اپنے بچوں کو کھلاتی
وہ مجھ کو بھی کھلاتی تھی۔ مجھ کو کپڑے بھی ٹھیک ٹھاک مل جاتے تھے۔ چچا اور
چچی مجھ کو اپنا بچہ سمجھتے تھے مگر میرے وجود کا ایک خانہ خالی رہ گیا تھا، وہ
نہیں بھرتا تھا۔ رات کو جب میں اکیلا سوتا تھا تو کئی مرتبہ ایسے ہُوا کہ میرے
آنسو نکل آتے۔ مجھ کو ماں یاد آتی تھی۔ میں کبھی کبھی رات کو تکیہ سر کے نیچے
سے نکال کر اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا کرتا تھا۔ خواب میں مجھ کو ایک
عورت جو میری ماں کی طرح ہوتی تھی، نظر آتی تھی۔ اُس نے مجھ کو اپنے سینے
کے ساتھ لگایا ہُوا ہوتا تھا۔

اگر میری ایک بہن ہوتی تو وہ مجھ کو اپنے ساتھ لگا لیتی۔ بہن بھی نہیں تھی۔ میں چچی کو اپنی یہ خواہش نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ مجھ کو اپنے ساتھ سلایا کرے۔ اس طرح مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں اپنے سے بڑی کسی عورت کو دیکھتا تھا تو میرے دل کو یہ خواہش پریشان کرنا شروع کر دیتی تھی کہ یہ عورت مجھ کو اپنے ساتھ لگا لے اور مجھ کو پیار دے۔

پھر میں جوان ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں جوانی کیا ہوتی ہے اور کیا مانگتی ہے لیکن میں عورت کو کسی اور نظر سے دیکھتا تھا۔ پولیس میں بھرتی ہونے سے ایک سال پہلے جب میری عمر بیس سال تھی، ایک بڑی لڑکی نے جو عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹی تھی، میرے ساتھ محبت کا اظہار کیا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ شریف خاندان کی نیک سیرت لڑکی ہے اور یہ پاک محبت چاہتی ہے مگر میرے دل نے اس لڑکی کو قبول نہیں کیا۔ میں بھی پاک محبت کا خواہش مند تھا لیکن اتنی خوبصورت لڑکی مجھ کو محبت کے قابل معلوم نہ ہوتی۔ اُس نے میرے ساتھ بہت شکوے کئے۔ میں نے اُس کو یہ نہیں کہا کہ تم مجھ کو اچھی نہیں لگتیں۔

میرے دل کو ایسی خوبصورت عورت اچھی لگتی تھی جو عمر میں بڑی ہوتی تھی لیکن میں اُس کو دُور سے دیکھتا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے دل میں کوئی بُرا خیال نہیں آتا تھا۔ اُس وقت میں کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ بہت بعد کی بات ہے جب میری عمر چالیس سال سے اُوپر ہو گئی تھی تو ایک روز ایک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بات ہوئی۔ وہ میرے دوست تھے۔ میں نے اُن کو بتایا کہ میں لڑکپن اور نوجوانی میں اپنے سے بڑی عمر کی عورت کو پسند کرتا تھا اور اپنی عمر کی یا اپنے سے کم عمر کی لڑکی مجھ کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو بتایا کہ یہ نفسیاتی معاملہ ہے۔ میرا دل اپنی ماں کے پیار کو ڈھونڈتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے میری عقل میں آئی کہ

میں کسی لڑکی کو یا جوان عورت کو بُری نظر سے کیوں نہیں دیکھتا تھا۔ نوجوانی کے زمانے میں میرے دوست عورتوں کے بارے میں ننگی باتیں کرتے تھے اور بدکاری کے قصے سناتے تھے تو مجھ کو اچھا نہیں لگتا تھا اور کبھی کبھی غصہ بھی آجاتا تھا۔

میں لڑکپن میں اپنے وجود میں تشنگی محسوس کرنے لگا تھا۔ جوان ہو کر اس کی شکل ذرا بدل گئی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ کسی عورت کے ساتھ محبت کروں اور پھر شادی کروں۔ اگر کوئی میری یہ بات سُن کر کہتا ہے کہ میں نے بُرے الفاظ کہہ دیتے ہیں تو وہ آدمی غلط کہتا ہے۔ ایسی خواہش ہر کسی کے دل میں ہوتی ہے اور ایسی خواہش ہر لڑکی میں بھی ہوتی ہے۔

میں نے میٹرک پاس کر لیا۔ چچا نے مجھ کو دلچسپی سے پڑھایا تھا۔ اب وہ خواہش کرتے تھے کہ مجھ کو اچھی نوکری مل جاتے۔ اُس زمانے میں میٹرک پاس لڑکا کوئی کوئی ہوتا تھا۔ لڑکے کو صرف اچھی نوکری کے لئے میٹرک پاس کرایا جاتا تھا مگر وہ بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ ایک ہندو آڑھتی نے مجھ کو اپنا منشی رکھ لیا تھا۔ اُس وقت میری عمر سترہ سال تھی۔ مجھ کو یہ نوکری پسند نہیں تھی لیکن چچا نوکری نہیں چھوڑنے دیتا تھا۔

مجھ کو کئی آدمیوں نے کہا کہ فوج میں بھرتی ہو جاؤ لیکن فوج کی نوکری مجھ کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں نے ڈیڑھ سال بعد ہندو کی نوکری چھوڑ دی۔ چچا اور چچی مجھ سے ناراض ہوتے۔ چچی نے ایک بات ایسی کہہ دی جس سے مجھ کو محسوس ہوا کہ ان کو میرا فارغ رہنا اس لئے پسند نہیں کہ میں ان پر بوجھ بن گیا تھا۔ میں ان پر بوجھ نہیں تھا کیونکہ میری تھوڑی سی زمین تھی۔ اُس کی پیداوار چچا کے گھر میں آتی تھی۔

میں تھوڑا فارغ پھرتا رہا۔ ایک روز ایک بزرگ نے مجھ کو کہا کہ پولیس میں بھرتی ہو جاؤ۔ اس بزرگ کا میل ملاقات شہر میں افسروں کے ساتھ بھی تھا۔ میں شاید پولیس کی نوکری کو بھی پسند نہ کرتا لیکن اس بزرگ شخصیت نے مجھ کو کہا کہ تمہارا چچا اچھا نہیں سمجھتا کہ تم اُس کے سر پر نکھٹو بیٹھے رہو۔ اگر اپنی

عزّت بنانا چاہتے ہو تو کوئی پکی نوکری کرو۔ پکی سے مطلب سرکاری نوکری تھی۔ بزرگ نے مجھ کو یہ بھی کہا کہ تمہارا باپ شریف آدمی تھا اور تم بھی چال چلن کے ٹھیک ہو، اس لئے میں تم کو دل سے چاہتا ہوں۔

میں اُن کے ساتھ چلا گیا۔ یہ اس بزرگ کا احسان تھا کہ میں اے ایس آئی بن گیا اور خدا نے مجھ کو عزّت دی کہ میں ایک گاؤں میں بیٹھا قتل کے کیس کی تفتیش کر رہا تھا اور لوگ سمجھتے تھے کہ چوپال میں کسی ریاست کا نواب اُترا ہُوا ہے۔ میں گاؤں سے گزرتا تھا تو لوگ رستہ چھوڑ دیتے اور جھک کر سلام کرتے تھے اور ایک اتنی زیادہ خوبصورت عورت میرے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ اُس خاندان کی عورت تھی جو قتل کو جرم سمجھتا ہی نہیں تھا اور یہ خاندان عزّت اور غیرت کے لئے مشہور تھا۔

ممتاز مجھ کو اداس اور پریشان ہو کر دیکھ رہی تھی۔ مجھ کو یہ سوچ آئی کہ ممتاز کو میں ایسی بات نہ سناؤں جو میں نے آپ کو سنائی ہے۔ دیہات کی عورت میں یہ باتیں اور میری کمزوری سمجھنے کی عقل نہیں تھی لیکن میں اُس کو یہ بتانا ضروری سمجھتا تھا کہ میرے دل میں اُس کی بہت محبت پیدا ہو گئی ہے اور میں اُس سے ناراض نہیں ہوں۔ مجھ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اُس کے دل میں جو بات تھی اُس کو وہ زبان پر لے آئی۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟" ـــــ ممتاز نے مجھ سے اس طرح پوچھا جس طرح وفادار بیوی اپنے خاوند سے پوچھتی ہے ـــــ "آپ نے مجھ کو کسی قابل نہیں سمجھا؟"

"میری نیت غلط نہیں ممتاز!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں تم کو یہی بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری جو محبت پیدا ہو گئی ہے وہ بہت پاک ہے۔ مجھ کو یہ بتاؤ کہ تم پاک محبت کر سکتی ہو؟"

"ہاں" ـــــ اُس نے سر ہلا کر کہا ـــــ "کیوں نہیں کر سکتی! لیکن تھانیدار صاحب جی، ہمارے ساتھ کون پاک محبت کرتا ہے۔ خاوند کو دل میں بٹھایا تھا

لیکن اُس کو پتہ ہی نہیں کہ محبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ انسان کو ایسا حیوان نہیں ہونا چاہیئے لیکن عورت ذات کی کون سُنتا ہے!"

"میں تمہیں وہ محبت دوں گا" ـــــ میں نے اس طرح کہا جس طرح میں اُس کے خاندان کا ایک آدمی ہوں اور ہم کھیتوں میں کہیں چھپے ہُوئے بیٹھے ہیں ـــــ "میں تم سے بھی ایسی ہی محبت مانگتا ہوں .... میں محبت کا پیاسا ہوں ممتاز! اس کے سوا میرا تمہارے ساتھ کوئی مطلب نہیں۔"

وہ مُوڑھے سے اُٹھ کر پلنگ پر میرے ساتھ اس طرح بیٹھ گئی کہ اُس کی سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔

"میں آپ کو وہ محبت دوں گی جس کی پیاس آپ کو محسوس ہو رہی ہے" ـــــ اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُس نے کوئی نشہ پیا ہُوا ہو۔

ہیڈ کانسٹیبل اندر آیا اور اُس نے مجھ کو بتایا کہ ایک مخبر کوئی خبر لایا ہے۔ میں نے اُس کو کہا کہ میں کچھ دیر بعد اُس کو بلا لوں گا۔ جس وقت ہیڈ کانسٹیبل اندر آیا تھا، ڈیوڑھی میں اُس کے پاؤں کی آواز سُن کر ممتاز پلنگ سے اُٹھ کر مُوڑھے پر بیٹھ گئی تھی ورنہ ہم پکڑے جاتے۔ بے شک ہم کوئی بُری حرکت نہیں کر رہے تھے لیکن یہ کوئی بھی نہ مانتا کہ ایک تھانیدار پاک محبت کر رہا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کے آنے سے مجھ کو افسوس ہُوا لیکن میں نے اس کو اچھا سمجھا کہ میں جذبات کے نشے سے نکل آیا۔ میں نے ممتاز سے واردات کے بارے میں کچھ معلوم کرنا تھا۔ میں اگر آپ کو یہ سنانا شروع کر دوں کہ اُس سے کیا معلوم کرنا تھا تو میری اصل کہانی درمیان میں ہی رہ جاتے گی۔

میں نے اس واردات کے بارے میں پوچھ گچھ کی اور اُس کو جو کچھ معلوم تھا وہ اُس نے بتا دیا۔

وہ جب چلی گئی تو میرا دل تفتیش سے اُٹھ گیا۔ مجھ کو صاف پتہ چل رہا تھا کہ مجھ کو جس پانی کی پیاس لگی ہوتی ہے وہ پانی اس چشمے میں ہے۔ ممتاز مجھ سے پانچ چھ سال بڑی تھی۔ مجھ کو صرف یہ افسوس تھا کہ وہ کسی کی بیوی تھی۔ میں نے اپنے دل میں قسم کھا لی کہ اس کی محبت پر اپنی جان بھی دے دوں گا لیکن

نکاح کے بغیر اس کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا۔ مجھ کو یہ خوشی ہوئی کہ خاوند نے اس کو ماں باپ کے گھر بٹھایا ہوا تھا۔ اگر خدا میری دُعا سنتا تو میں صرف یہ دُعا مانگتا کہ خاوند اس کو طلاق دے دے اور میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔

میں نے جان بوجھ کر تفتیش کو اور زیادہ لمبا کر دیا۔ دوسرے دن پھر ممتاز کو بُلوا لیا۔ رات کو ایک مخبر جو خبر دے گیا تھا اُس نے مجھ کو بہت فائدہ دیا۔ اگر میں چاہتا تو اُسی دن تفتیش ختم کر سکتا تھا لیکن میرا دل بے ایمان ہو گیا تھا۔ ممتاز آئی تو میں نے اُس کو اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا لیا۔ اُس کی باتوں اور حرکتوں سے مجھ پر یہ ظاہر ہُوا کہ جس طرح میں اُس کو ملنے کے لئے بے تاب تھا اسی طرح وہ میرے پاس ایک بار پھر آنے کے لئے پریشان ہو رہی تھی۔ اتنی خوبصورت عورت اس طرح پاس ہو جس طرح ممتاز میرے پاس تھی تو اپنے دل میں اپنی نیّت کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے لیکن خدا گواہ ہے، میں نے اپنی نیّت کو خراب نہیں ہونے دیا۔ نیّت خراب ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میرے جذبات کی ضرورت کچھ اور تھی۔ ممتاز اس ضرورت کو سمجھ گئی تھی۔ وہ خود محبت کی تلاش میں تھی۔ اپنے خاوند کے خلاف اُس کو یہی شکایت تھی کہ وہ ممتاز کے صرف جسم کے ساتھ واسطہ رکھتا تھا۔

دو دن اور گزر گئے۔ میں نے ممتاز کو ان دو دنوں میں تین مرتبہ اپنے پاس بلایا اور ہر بار دو دو تین تین گھنٹے اپنے پاس رکھا۔ ایک دن اُس نے مجھ سے میری بیوی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے جب اُس کو بتایا کہ میں نے ابھی شادی نہیں کی تو وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی مسکراہٹ بُجھ گئی اور وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اُس نے لمبا سانس چھوڑ کر سَر کو جُھکا لیا۔ میں نے اُس کے سَر پر ہاتھ رکھ کر سَر اُوپر کیا تو اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں سکتی۔ اُس نے اپنے دل کی بات نہ بتائی لیکن میں نے اُس دن اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا اور اُس کو بتا دیا کہ میں چھوٹا سا

تھا تو میری ماں مر گئی تھی اور مَیں عورت کی اُس محبت کا پیاسا ہوں جس میں ماں کی محبت بھی شامل ہو۔ میں نے اُس کو بتایا کہ وہ محبت میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔

میری تفتیش مکمل ہو چکی تھی۔ مقتول کو دو آدمیوں نے قتل کیا تھا۔ ان میں ایک ممتاز کا چھوٹا بھائی تھا۔ جب مجھ کو پورا یقین ہو گیا تو میں نے ان دونوں کو گرفتار کرنے سے پہلے ممتاز کو بلایا۔ میں آپ کو ایک بات اور بتا دیتا ہوں۔ اگر میں صرف ممتاز کو بار بار بلاتا رہتا تو میرے خلاف یہ شک پیدا ہوتا کہ میں عیش موج کر رہا ہوں۔ خاص کر مقتول پارٹی میرے خلاف شک کی بنا پر اُوپر درخواست دے دیتی کہ تھانیدار رشوت لے کر قاتلوں سے مل گیا ہے اور قاتلوں کی ایک عورت اُس کے پاس جاتی ہے۔ میں نے اس شک سے بچنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ مقتول کے خاندان اور برادری کی دو تین عورتوں کو کسی وجہ کے بغیر ہی بلا لیا کرتا تھا اور ان سے مقتول کے بارے میں ایسی باتیں پوچھتا تھا جن کی تفتیش میں ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح میں نے ترازو کو بالکل سیدھا رکھا۔

میں نے ممتاز کو بلایا اور بتایا کہ یہ دیکھو، تمہارا بھائی پکڑا جا رہا ہے اور اُس کے خلاف پکّی شہادت مل گئی ہے۔ میری یہ بات سُن کر ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ہاں" — ممتاز نے کہا — "مجھ کو معلوم ہے کہ قتل میں میرا بھائی بھی شامل تھا لیکن میں آپ کو بتا دیتی ہوں اس بدمعاش آدمی کو کیوں قتل کیا گیا ہے۔ وہ ایک غریب لڑکی کو بہت تنگ کرتا رہتا تھا۔ اُس کو پیسے دکھاتا اور اپنے پاس بلاتا تھا۔ لڑکی نے اپنے ماں باپ کو بتایا۔ باپ بیچارہ غریب اور کمزور آدمی ہے۔ اُس نے میرے بھائی کو بتایا۔ میرے بھائی نے اپنے ایک دوست کو ساتھ ملا لیا۔ بھائی نے مجھ کو کہا کہ میں اُس لڑکی کو کہوں کہ وہ رات کو اس بدمعاش کے ساتھ فلاں جگہ چلی جائے۔ مجھ کو معلوم تھا کہ اس بدمعاش کی زندگی پوری ہو گئی ہے۔ ہمارے خاندان والے اس

جُرم کی بھی سزا دیا کرتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ میرے خاوند نے اگر مجھ کو آباد نہ کیا تو میرے بھائی اُس کو بھی موت کی سزا دیں گے۔ میں آپ کو اس بدمعاش کے قتل کی بات سنا رہی تھی۔ میرے بھائی اور اُس کے دوست نے جس طرح سوچا تھا اسی طرح اس پر عمل ہُوا۔ ان دونوں نے اس بدمعاش کو اس لڑکی کے ساتھ پکڑ لیا اور چاقوؤں سے اُس کو ختم کر کے واپس آ گئے۔ انہوں نے لڑکی کو قتل سے پہلے وہاں سے بھگا دیا تھا۔ اپنے بھائی اور اُس کے دوست کے خون والے کپڑے رات کو میں نے گرم پانی اور صابن سے دھوتے تھے .... مَیں آپ کو یہ بات کبھی نہ بتاتی کیونکہ اس میں میرا اپنا جُرم شامل ہے۔ آپ مجھ کو بھی گرفتار کر سکتے ہیں لیکن میرے دل میں آپ کی جو محبت ہے اس نے مجھ کو مجبور کیا ہے کہ میں دل کی کوئی بات آپ سے چُھپا کر نہ رکھوں۔ میں آپ سے یہ منّت نہیں کروں گی کہ میرے بھائی کو گرفتار نہ کریں۔"

"اگر تمہاری محبت نے تمہارے دل سے رازؔ اگلوا لیا ہے"——

مَیں نے کہا —— "تو میری محبت مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ مَیں تمہارے بھائی کو سزا سے بچالُوں۔ اگر اُس نے بدمعاشی کی نیّت سے قتل کیا ہوتا تو میں شاید اُس کو بچانے کی بات نہ کرتا۔ اُس نے ایک غریب کی بچّی کی عزّت کو ایک بدمعاش سے بچایا ہے، لیکن میرے دل میں زیادہ خیال تمہارا ہے۔ ممتاز! میں تم کو دُکھی نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارے بھائی کو میں گرفتار ضرور کروں گا لیکن وہ بری ہو جائے گا۔"

ممتاز نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں کے ساتھ لگائے۔ پھر میرے ہاتھوں کو بہت مرتبہ چُوما۔ اس طرح اُس نے اور بھی حرکتیں کر کے شکریے اور محبت کا اظہار کیا۔

میں نے پکّا ارادہ کر لیا کہ میری اگر نوکری چلی جاتی ہے تو چلی جائے، میں اس عورت کے دل کو خوش کر دوں گا جس نے میری روح کی اور میرے

دل کی پیاس بجھائی ہے۔ میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے شہادت میں کیا کیا گھپلا کیا اور کس طرح کیس کمزور کیا۔ میں نے ممتاز کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ اپنے بھائی کو کیا کہے۔ اس سے میری تسلّی نہ ہوئی۔ میں نے اُس کے باپ کو شاملِ تفتیش کر لیا لیکن اندر بٹھا کر اُس کو بتایا کہ وہ صفائی کے لئے کیسے گواہ لائے اور کیا کہے۔

اُس نے میری باتیں سمجھ کر مجھ سے پوچھا کہ میں اُس سے کتنی رقم بطور رشوت لُوں گا۔ اُس نے کہا کہ میں جتنی رقم اپنے مُنہ سے کہوں گا اتنی ملے گی۔ میں نے اُس کو کہا کہ اُس کے بیٹے نے ایک غریب اور نیک لڑکی کی عزّت کو ایک بدمعاش آدمی سے بچانے کے لئے خود کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا ہے اس لئے میں اُس کو پھانسی کے تختے تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ میں تو اُس کو یہ کہنے والا تھا کہ اگر رشوت دینی ہے تو اپنی بیٹی کو اس کے خاوند سے طلاق دلا کر اس کی شادی میرے ساتھ کر دو لیکن میں نے ایسی بات کہنے کی جرأت نہ کی۔

آخری ملاقات میں ممتاز نے مجھ کو کہا کہ اُس کو جہاں کہیں بھی بلاؤں گا، وہ آجایا کرے گی۔ میں نے اُس کے بھائی کو اور بھائی کے دوست کو گرفتار کر لیا۔ میں جب گاؤں سے رخصت ہُوا تو مجھ کو اس طرح معلوم ہو رہا تھا کہ ہتھکڑیاں ملزموں کو نہیں بلکہ مجھ کو لگی ہوئی ہیں اور مجھ کو گھسیٹ کر گاؤں سے نکال رہے ہیں۔

دس بارہ دنوں بعد کیس مجسٹریٹ کے سامنے چلا گیا پھر سیشن کورٹ میں گیا اور سیشن جج نے ممتاز کے بھائی کو اور دوسرے آدمی کو شک کا فائدہ دیکھ کر بری کر دیا۔ ہر پیشی پر ممتاز کورٹ میں آتی تھی۔ میں اُس کو دُور سے دیکھ لیا کرتا تھا۔ اُس کے ساتھ بات کرنا مناسب نہیں تھا۔

میں ممتاز سے ملنے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا۔ کیس ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے ایک مُخبر کو پکڑا۔ اُس پر مجھ کو اعتبار تھا کہ میرے راز کو چھپا کر رکھے گا۔ اُس کو کہا کہ وہ ممتاز کو میرا پیغام پہنچا دے۔ دوسرے دن مُخبر نے

آکر بتایا کہ ممتاز شام کے بعد اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں کی طرف جائے گی۔ لڑکیاں شام کے بعد گھومنے پھرنے جایا کرتی تھیں۔

میں چلا گیا اور ممتاز میرے پاس آگئی۔ اُس کے ساتھ بات کیے نو دس مہینے گزر گئے تھے۔ میں اپنی بے تابی اور بے چینی پر قابو نہ پا سکا، لیکن اُس کو میں نے بالکل ٹھنڈا دیکھا۔ میں بات کرتا تھا تو وہ تھوڑا سا جواب دے دیتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ اُس کو کیا ہو گیا ہے۔

"آپ نے مجھ کو بلایا تھا اور میں آگئی ہوں" — اُس نے کہا — "میں پھر کبھی آپ کے بلانے پر نہیں آؤں گی۔ مجھ کو اب دل سے اُتار دیں۔"

"کیا تم مجھ کو دل سے اُتار سکتی ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"میں نے آپ کو دل میں کبھی بھی نہیں بٹھایا" — اُس نے آرام آرام سے بولتے ہوئے کہا — "آپ تھانیدار ہیں۔ مجھ کو سزا دلا سکتے ہیں تو دلا دیں۔ میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ میں نے اپنے بھائی کو بچانا تھا، وہ میں نے بچا لیا ہے۔ آپ نے مجھ سے محبت مانگی تو میں نے آپ کو رشوت کے طور پر محبت دے دی۔ آپ نے مجھ کو پہلے دن تفتیش کے لئے بلایا تھا۔ آپ مجھ سے کچھ اور پوچھنا چاہتے تھے۔ میں نے آپ کو غلط باتیں بتائیں۔ مجھ کو اُس وقت بھی معلوم تھا کہ قاتل میرا بھائی اور اس کا دوست ہے۔ آپ نے اپنی ایک دُکھتی رگ میرے ہاتھ میں دے دی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھ کو دھوکے میں رکھا تھا" — میں نے کہا۔

"میں انکار نہیں کروں گی" — اُس نے کہا — "میں نے اپنے بھائی کے لئے آپ کو محبت کا دھوکہ دیا ہے لیکن آپ نے مجھ پر جو مہربانی کی ہے، اس کی میں پوری قیمت دوں گی۔ نقد مانگیں۔ میرا سارا زیور مانگیں۔ زیور میرے بھائی سے زیادہ قیمتی نہیں" — اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا اور ذرا سوچ کر کہا — "اگر آپ مجھ کو رشوت کے طور پر مانگیں گے تو یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اپنے جسم کو اور اپنی عزت کو میں اپنے بھائی کی جان

سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہوں۔ اگر آپ کو میری محبت کی ضرورت ہے تو میرے خاوند کے مرنے کے بعد آپ کو مل سکتی ہے .... آپ تھانیدار ہیں۔ آپ مجھ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"ممتاز!" — میں نے ایسے کہا جیسے میں رو پڑوں گا — "میں تمہارے لئے تھانیدار نہیں۔ تم پر پھر کبھی کوئی مشکل آگئی تو اپنے کُتّے کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال کر تمہاری مدد کو پہنچوں گا۔ جسے چاہو قتل کر دو۔ میں تمہیں اُسی طرح بچاؤں گا جس طرح تمہارے بھائی کو بچایا ہے .... تم نے مجھ کو دھوکہ دیا ہے، میں نے تم کو دھوکہ نہیں دیا۔ تمہاری محبت کو دل سے نہیں نکال سکوں گا" — میں وہاں سے آگیا۔

میں نے اُس کی محبت کو دل سے نکالنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ تصوّر میں اُس کے ساتھ باتیں کر لیتا تھا۔ میں اپنی ڈیوٹی میں پکا تھا۔ میں نے ایسا نہیں کیا کہ ہر وقت ممتاز کے خیالوں میں ڈوبا رہتا۔ تنہائی اور خاص کر رات سونے سے پہلے میرے ذہن میں ممتاز کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے دل کو تسلّی دے دی تھی کہ میری قسمت میں محبت ہے ہی نہیں۔ بعض اوقات دل بہت دُکھتا تھا۔ کبھی کبھی آنسو بھی نکل آتے تھے لیکن میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتا تھا کہ میرے دل کو کتنا بڑا غم کھا رہا ہے۔

میں نے اپنے اندر ایک اور تبدیلی پیدا کر لی۔ میں خدا کی عبادت میں پڑ گیا۔ میں نے خدا سے کہا کہ میری قسمت میں اگر وہ محبت نہیں لکھی جس کی مجھ کو ضرورت ہے تو میرے خدایا، مجھ کو اپنی محبت دے دے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی محبت نہیں۔ میں نے خدا سے کوئی شکوہ نہیں کیا، بلکہ اُس کی محبت کو اپنا ایمان بنا لیا۔ اس سے مجھ کو بہت سکون ملا اور اس کا یہ فائدہ بھی ہُوا کہ میرا دل میری ڈیوٹی اور میرے کام میں خوب لگتا تھا۔

کسی واردات کی تفتیش مجھ کو مل جاتی تھی تو میں اُس میں ڈوب جاتا تھا۔ ایک بار ایک مشہور ڈاکو کے گروہ کے آٹھ آدمیوں کے ساتھ پولیس مقابلہ

ہو گیا جو میرے لئے بہت خطرناک تھا کیونکہ میرے ساتھ صرف تین کانسٹیبل تھے۔ میں نے زخمی ہو کر اس گروہ کے تین آدمیوں کو مار ڈالا اور باقی کو پکڑ لیا تھا۔ پھر ان کی نشاندہی پر اُسی رات جب میں زخمی تھا، میں نے ایک گاؤں سے گروہ کے سردار کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔

میری قابلیت اور بہادری مشہور ہو گئی تھی لیکن خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ممتاز کی محبت نے مجھ کو کتنا کمزور کر دیا تھا۔

چھ سال اور پانچ مہینے گزر گئے۔ مجھ کو اچھے کام کی وجہ سے ترقی مل گئی اور میں سب انسپکٹر ہو گیا۔ میں ممتاز کے علاقے کے تھانے میں اڑھائی سال رہا تھا۔ وہاں سے ایک اور تھانے میں تعینات ہُوا۔ وہاں ابھی چار سال پورے نہیں ہوتے تھے کہ مجھ کو ایک اور علاقے کا تھانہ دے دیا گیا۔ یہ تھانہ ممتاز کے علاقے کے تھانے سے تقریباً بیس میل دُور تھا۔ یہ قصبہ تھا۔

اس تھانے میں مجھ کو ایک مہینہ اور کچھ دن گزر گئے تھے۔ ایک روز تین آدمی ایک زخمی آدمی کو لائے۔ اُس کے جسم پر لوہے کی کسی چیز کے دو زخم تھے اور کسی نے اُس کو بہت مارا پیٹا تھا۔ اس کی ایک آدمی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ یہ لوگ اُس آدمی کے خلاف پرچہ کرانے آئے تھے۔ میں اس کیس کو سنگین نہیں بنا سکتا تھا لیکن لڑائی جھگڑے میں میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ دونوں پارٹیوں میں راضی نامہ ہو جائے۔ میں نے ان چاروں کو مشورہ دیا کہ وہ ذرا صبر سے کام لیں، میں دوسری پارٹی کو بلاتا ہوں اور سمجھوتہ کرا دوں گا مگر وہ تو سخت غصے میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ملزم نے ان سب پر حملہ کیا ہے اور اس ایک آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جس کا خون نکل آتا ہے اُس کو سب مظلوم سمجھتے ہیں اور جو پارٹی تھانے پہلے پہنچ جاتی ہے اُس کو سچا سمجھا جاتا ہے لیکن میرا طریقہ ذرا الگ تھا۔ اکثر تھانیدار میرے والا طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ میں نے حملہ کرنے والے آدمی کو بلوا لیا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی آئے

تھے۔ اُس نے بیان دیا کہ اُس نے حملہ نہیں کیا بلکہ لڑائی ہوئی ہے۔ دوسری پارٹی کے بیان کچھ اور تھے۔ میں راضی نامے کی کوشش کر رہا تھا مگر مضروب پارٹی نہیں مانتی تھی۔ مجھ کو پرچہ کاٹنا پڑا۔ میں نے ایف آئی آر لکھ کر دوسرے آدمی کو حوالات میں بند کر دیا۔ اُس کا نام لطیف تھا۔

میری عمر ستائیس اٹھائیس سال ہو گئی تھی اور میں نے شادی نہیں کی تھی۔ میں چھٹی لے کر چھ سات مرتبہ اپنے گاؤں گیا تھا۔ برادری میں جن کی لڑکیاں تھیں وہ میری بہت عزت خاطر کرتے تھے۔ میں ان کی نیت کو سمجھتا تھا۔ میرا چچا اور چچی بھی مجھ کو شادی کے لئے کہتے تھے لیکن شادی کا نام سن کر میرے دل کو تلخی ہوتی تھی۔ میں کسی لڑکی کو اس نظر سے دیکھتا تھا کہ اس کے ساتھ شادی کر لوں تو میری آنکھوں کے سامنے ممتاز آ جاتی تھی۔ ممتاز میری رُوح میں شامل ہو گئی تھی۔ میں اُس کو اپنے تصوّر میں سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں عبادتِ اللہ میں زیادہ ہی ڈوبتا جا رہا تھا۔ اب مجھ کو یہ نظر آ رہا تھا کہ میں دنیا سے مُنہ موڑ لوں گا بلکہ ایسے ہو گا کہ دنیا سے میرا مُنہ خود بخود مُڑ جائے گا۔

اُس رات کا واقعہ ہے جس روز میں نے لطیف نامی آدمی کو حوالات میں بند کیا تھا۔ میں اپنے گھر میں تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے نوکر نے جو کھانا پکاتا تھا، جا کر دروازہ کھولا اور آ کر مجھ کو بتایا کہ ایک عورت آئی ہے جو اپنا نام ممتاز بتاتی ہے۔ میں حیران ہُوا کہ ممتاز کہاں سے آ گئی؟ پھر خیال آیا کہ یہ کوئی اور ممتاز ہو گی۔

میں نے ابھی نوکر کو کہا نہیں تھا کہ اس عورت کو اندر بلا لو، وہ خود ہی اندر آ گئی ـــ یہ وہی ممتاز تھی ـــ میں اُس کو ساڑھے چھ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کو بٹھایا اور نوکر کو باہر بھیج دیا۔ میرے ذہن میں بہت سارے سوال اور بہت سارے خیال اکٹھے ہی آ گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیوں آئی ہے۔

"میں ایک سال سے اس شہر میں ہوں" ـــ اُس نے کہا ـــ "یہاں

میرے خاوند کی بہت بڑی دکان ہے۔"

"اُس نے کھیتی باڑی چھوڑ کر دکان کر لی ہے؟"— میں نے پوچھا۔

"نہیں"— اُس نے کہا —"یہ وہ خاوند نہیں۔ اُس سے میں نے طلاق لے لی تھی۔ یہ میرا دوسرا خاوند ہے۔"

میں نے اُس کو غور سے اور محبت کی نظروں سے دیکھا۔ اُس کی عمر اب تیس سے ڈیڑھ دو سال زیادہ ہوگئی تھی۔ مجھ کو اب وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اُس کو کہا کہ وہ بتائے کہ میرے پاس کیوں آئی ہے۔

"یاد ہے آپ کو، آپ نے کہا تھا کہ کوئی مشکل آپڑی تو آپ میری مدد کریں گے"— اُس نے کہا —"آج مجھ پر ایک مشکل آپڑی ہے۔ آپ میرے ساتھ سخت ناراض ہوں گے۔ میں نے آپ کو دھوکہ دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کے دل سے میری محبت نہیں نکل سکتی .... کیا اب بھی میری محبت آپ کے دل میں موجود ہے؟"

"تم اپنی مشکل بیان کرو ممتاز!"— میں نے کہا۔

"میرے خاوند کو اپنی حوالات سے نکال دو"— اُس نے کہا۔

اُس نے بتایا کہ لطیف اُس کا خاوند ہے جس کو میں نے اُسی روز حوالات میں بند کیا تھا۔

"نکال دیا ممتاز!"— میرے لہجے میں تلخی تھی۔ میں نے کہا — "اپنے گھر چلی جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر نہ بیٹھو۔ تمہارا خاوند دو دِنوں میں تمہارے پاس آجائے گا لیکن اُس کے خلاف شہادت بڑی سخت ہے اور جرم معمولی نہیں۔ مجھ کو اُستادی کرنی پڑے گی۔ تم جاؤ۔"

"تھوڑی دیر اور نہ بیٹھوں؟"— اُس نے کہا —"آپ کے پاس بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ مجھ کو آج کسی نے بتایا ہے کہ آپ یہاں کے تھانیدار ہیں۔ میں بے دھڑک چلی آئی۔"

"اور اب چلی جاؤ"— میں نے کہا —"اور یاد رکھنا کہ اپنے خاوند کو

نہ بتانا کہ تم میرے پاس آئی تھیں اور تم نے اُس کو رہا کرایا ہے۔ تم اُس کو ایسا کہو گی تو وہ تم کو بدنام کر دے گا۔"

وہ اُٹھی تو میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ جو بہت ہی خوبصورت تھا، اُداس ہوگیا تھا۔ میں نے نوکر کو بلایا اور اُس کو کہا کہ ممتاز کے ساتھ جائے اور اسے گھر چھوڑ آئے۔

وہ جب چلی گئی تو میرے آنسو نکل آئے۔ دل کی حالت بہت بُری ہوگئی۔

دوسرے دن مضروب پارٹی آئی۔ میں نے مضروب کو ڈاکٹر کے پاس بھیجا تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ ممتاز کے خاوند کے لئے اچھی نہیں تھی۔ دوسری پارٹی گواہ لائی تھی۔ لطیف کے لئے سزا سے بچنا مشکل تھا۔ مجھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ دو گواہ اپنے بیان میں جھوٹ بھی شامل کر رہے ہیں۔ میں نے مضروب کو، اُس کے گواہوں کو اور دو اور آدمیوں کو جو اُس کے ساتھ آئے تھے، اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔

"سب آدمی میری بات غور سے سُن لو"— میں نے اُن کو کہا — "کیس عدالت میں جانے سے پہلے سوچ لو۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ دو گواہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ تمہارا زخمی بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ میں رات کو مخبروں سے اور بازار کے کئی آدمیوں سے اصل واقعہ معلوم کر چکا ہوں۔ جھوٹ اور سچ میرے سامنے آچکا ہے۔ ملزم صفائی کی جو شہادت لا رہا ہے، مجھ کو وہ بھی معلوم ہو چکی ہے۔ میں کیس عدالت میں پیش کر دوں گا لیکن میں تم سب کو خبردار کرتا ہوں کہ عدالت میں کیس اُلٹ جائے گا اور تم سب کے خلاف جھوٹا کیس دائر کرنے کا کیس چلے گا۔ بہتر ہے راضی نامہ کر لو۔"

اُن میں سے تین آدمیوں نے کہہ دیا کہ وہ راضی نامہ کر لیں گے۔ مضروب نہیں مانتا تھا۔

"کیا یہ جھوٹ ہے کہ تم نے ملزم لطیف کی بیوی کے ساتھ چھیڑ خانی کی تھی؟"— میں نے مضروب سے کہا —"لطیف نے تم کو دیکھ لیا تھا۔"

وہ کُودنے لگا اور کہنے لگا کہ ایسی بات نہیں۔ میں نے اُس کو کہا کہ
چار گواہ موجود ہیں جنہوں نے دیکھا تھا کہ لطیف نے تم سے باز پُرس کی تو تم
نے اُس کو گالیاں دیں۔ اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے قسمیں کھانی شروع
کر دیں کہ ایسا واقعہ نہیں ہُوا۔ میں نے اُن کو کہا کہ میں نہ ملزم کو جانتا ہوں نہ
تم لوگوں کو۔ میں ملزم کے خلاف پرچہ کاٹ چکا ہوں۔ اب تو کیس عدالت میں
ہی جائے گا۔ میں تم کو یہ بتا رہا ہوں کہ ملزم بری ہو جائے گا پھر میں تم سب
کو گرفتار کروں گا اور عدالت تم کو سزا دے گی کہ تم سب نے مل جل کر ایک
بے گناہ آدمی کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور اُس کو جھوٹے مقدمے میں پھنسانے
کی کوشش کی اور تم سب نے مل کر اُسے مارا پیٹا۔ میں نے رات کو اُس کا
ڈاکٹری معائنہ کرایا ہے۔ ڈاکٹر نے اندر کی چوٹیں لکھی ہیں۔ تم پر جب یہ کیس اُلٹ
کر پڑے گا تو تم پر ہرجانہ بھی پڑے گا۔

آپ میری بابت یہ رائے ضرور دیں گے کہ ایک طرف میں نماز
روزے کی پابندی کرتا ہوں اور دوسری طرف جھوٹ بولتا ہوں اور ایک
جائز مقدمے کو جھوٹا کہتا ہوں۔ آپ میرے اُوپر الزام دھریں گے تو میں
اپنی صفائی میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میرے اُوپر ممتاز کی محبت کا جو اثر تھا
وہ آپ پر ہوتا تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔ یہ صرف میں جانتا ہوں کہ یہ اثر
کیسا تھا۔ اِس اثر نے مجھ سے جھوٹی کارروائی کرائی۔ میں نے ان لوگوں کو اتنا ڈرایا
کہ آخر کار وہ راضی نامے پر تیار ہو گئے۔

میں پکّے فارم پر ایف آئی آر لکھ چکا تھا۔ لطیف کی گرفتاری اور
مضروب کی ڈاکٹری رپورٹ پکّے کاغذوں پر آ چکی تھی۔ میں نے فریقین کے
راضی نامے کے لئے قاعدے قانون کی کارروائی کی جو اِن حالات میں کی
جاتی ہے۔ اس میں سارا دن گزر گیا۔ رات کو میں نے لطیف کو حوالات سے
نکال دیا۔ دوپہر کو اور پھر شام کو یعنی رہائی سے دو گھنٹے پہلے ممتاز لطیف کے
لئے کھانا لے کر آئی تھی۔ اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ حوالاتی ملزم
کو اُس کے گھر کا کھانا دیا جائے یا نہیں۔ میں نے اجازت دے دی تھی۔ ممتاز

کو حوالات سے دُور رکھا گیا تھا۔ میں نے اُس کو دیکھا تھا لیکن اُس کے ساتھ
بات نہیں کی تھی۔ اُس کا خاوند جب حوالات سے نکلا تو میں نے اُس کو نہیں
بتایا تھا کہ میں نے اُس پر احسان کیا ہے۔ اُس نے مجھ کو سلام کیا تو میں
نے اُس کو کہا کہ بھاگ جاؤ۔

مجھ کو بہت خوشی ہوئی کہ میں نے ممتاز کا کام کر دیا ہے لیکن افسوس
بھی ہوتا تھا کہ ممتاز کسی اور کی ہے۔ میں نے ایسی خواہش کو دل میں نہ رکھا کہ
ممتاز میرے پاس آئے اور میرے احسان کا شکریہ ادا کرے۔ پہلے اُس
نے اپنے بھائی کو چھُڑا کر مجھ کو صاف جواب دے دیا تھا۔ اب اُس نے
میرے ہاتھ سے اپنے خاوند کو چھُڑا لیا تھا۔ اُس نے میرے پاس آ
کر کیا کرنا تھا۔

دوسرے دن، وقت گیارہ بجے کے لگ بھگ ہو گا۔ میرے گھر
سے میرا لڑکا آیا اور مجھ کو بتایا کہ وہ عورت جو رات کو آئی تھی پھر آئی ہے اور
مجھ کو بُلاتی ہے۔ میں تھانے سے گھر چلا گیا۔ وہ کمرے میں میری چارپائی پر
بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کمرے میں گیا تو وہ اُٹھی اور میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔
میرے پاؤں پکڑے پھر اُٹھ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر چُومے اور
پھر میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔
میں نے اُس کو پلنگ پر بٹھا دیا اور خود کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے میرا بازو پکڑ
کر اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ میں اُس کے پاس پلنگ پر بیٹھوں لیکن میں
کُرسی پر ہی بیٹھا رہا۔

اُس نے کہا کہ وہ مجھ سے بہت شرمندہ ہے اور اُس کو بالکل اُمید
نہیں تھی کہ میں اُس کے خاوند کو چھوڑ دوں گا۔ میں نے اُس کو کہا کہ میں نے
اپنا وعدہ پورا کیا ہے اور اس کے صلے میں مجھ کو کچھ نہیں چاہیئے۔ میں نے اُس
کو کہا کہ وہ چلی جائے۔

"خدا کے لئے میرے دل کی بات سُن لیں" —— اُس نے میرے چہرے
کے اِدھر اُدھر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر منّت کی اور کہا —— "آپ نے

میری زندگی برباد کر دی ہے۔"

میں بہت حیران ہُوا کہ میں نے اس کی زندگی کس طرح برباد کر دی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے یہ سوچ لیا کہ یہ جو کچھ کہتی ہے وہ اس کو کہنے دو۔ مجھ کو معلوم تھا کہ یہ مجھ کو خوش کرنے کے لئے محبت کی باتیں کرے گی۔

"آپ کو یاد ہے میں خاوند سے رُوٹھ کر والدین کے گھر بیٹھی ہوتی تھی" — ممتاز نے کہا — "وہ کوئی بہت بڑی ناراضگی نہیں تھی۔ جب قتل کا وہ کیس عدالت میں چل رہا تھا جس میں میرا بھائی ملزم تھا، انہی دنوں خاوند مجھ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ بُرا آدمی نہیں تھا لیکن قتل کے کیس کے ساتھ ہی مجھ کو اُس کی باتیں بُری لگنے لگیں اور میں نے اُس کے ساتھ لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔ پہلے کبھی اس طرح نہیں ہُوا تھا۔ اُس کے ساتھ تین چار مرتبہ لڑائی جھگڑا ہُوا تو اُس نے ایک روز مجھ سے پوچھا کہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ تم خوش کیوں نہیں رہتیں؟ مجھ کو اُس کے پوچھنے پر بھی غصّہ آ گیا ....

"ایک سال بعد حالت یہ ہو گئی کہ میرے اندر اس خاوند کی اور اس کے گھر کی نفرت پیدا ہو گئی۔ مجھ کو خود اپنے اُوپر شک ہو گیا کہ کسی دُشمن نے مجھ پر تعویذ کرا دیئے ہیں۔ مجھ کو غصّہ چڑھتا تھا تو اپنے اُوپر قابو نہیں رہتا تھا۔ میری ماں نے پوچھا تو اُس کو میں نے بتایا کہ مجھ کو خود سمجھ نہیں آتی۔ پھر میں نے اپنے خاوند کے ساتھ میاں بیوی والا تعلق توڑ دیا۔ میرے باپ اور دونوں بھائیوں نے پتہ لگا لیا کہ سب قصور میرا ہے۔ اُنہوں نے میرے خاوند کو کہا کہ اِس کو طلاق دے دو۔ ہم تو اپنی بیٹی کی خاطر تمہیں اتنی زیادہ تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اُس نے مجھ کو طلاق دے دی ....

"مجھ کو پھر بھی چین نہ آیا۔ پھر میرا نکاح اس خاوند کے ساتھ ہو گیا جس کا نام لطیف ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے آپ کو بہت یاد کیا تھا مگر آپ اُس تھانے سے جا چکے تھے۔ لطیف کے ساتھ شادی ہوتے ایک سال ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ بھی میرا سلوک وہی

شروع ہو گیا جو میں نے پہلے خاوند کے ساتھ کیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اسی وجہ سے مجھ کو ایک خاوند سے طلاق ملی ہے، اب اس سے بھی طلاق ملے گی۔ میں اپنا غصّہ پی لیتی ہوں لیکن لطیف کے ساتھ میرا دل نہیں لگتا۔ اس کو آپ نے گرفتار کر لیا تو میں نے اس کو اس لئے رہائی دلا دی کہ میرا خاوند ہے۔"

میرا دل کرتا تھا کہ ممتاز بولتی رہے اور میں سُنتا رہوں لیکن میں تھانے سے اُٹھ کر آیا تھا۔ وہاں بہت کام تھا۔ میں نے ممتاز کو کہا کہ وہ بات ذرا جلدی ختم کرے کیونکہ مجھ کو کام ہے۔

"میں خود جلدی میں ہوں" — اُس نے کہا — "خاوند دکان پر ہے اور میں یہ کیس اپنے اُوپر ڈال کر آتی ہوں۔ میں نے اصل بات یہ کرنی تھی کہ میری ماں نے ایک پہنچے والے بزرگ سے میرے لئے تعویذ لئے تھے۔ وہ کہتی تھی کہ تم پر کوئی کالا اثر ہے۔ میں بھی اس کو کالا ہی اثر سمجھتی تھی لیکن کل جب آپ کو چھ سال بعد دیکھا تو مجھ کو پتہ لگ گیا کہ یہ کیسا اثر اور کیسا جادو تھا۔ یہ آپ تھے۔ میں نے آپ کو اپنے گاؤں میں محبت کا دھوکہ دے کر اپنے بھائی کو بری کرایا تھا، پھر آپ کو میں نے صاف جواب دے دیا تھا۔ جب آپ خاموشی سے وہاں سے آ گئے تو میرے دل اور دماغ کو کچھ ہو گیا۔ مجھ کو اپنا خاوند بُرا لگنے لگا اور وہ سب کچھ ہُوا جو میں نے آپ کو سُنا دیا ہے۔ دوسرے خاوند کو بھی میرے دل نے قبول نہیں کیا ....

"کل آپ کو دیکھا تو مجھ کو سوچ آئی کہ میرا دل آپ کو چاہتا تھا لیکن میں نہیں مانتی تھی۔ مجھ کو جو محبت آپ نے دی تھی وہ میرے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکی۔ میرا سینہ جلتا رہا۔ یہ مجھ کو اُس دھوکے کی سزا مل رہی ہے جو میں نے آپ کو دیا تھا۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں ممتاز!" — میں نے کہا۔

"آپ نے میرے خاوند کو رہا کر کے مجھ کو اپنا غلام بنا لیا ہے" — اُس نے کہا — "میں آپ کی بیوی بننا چاہتی ہوں۔"

"کیا اس خاوند سے طلاق لے لو گی؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "وہ طلاق نہیں دے گا۔"

"میں بغیر نکاح کے تم کو بیوی نہیں بناؤں گا" — میں نے کہا — "اور میں تم کو کبھی نہیں کہوں گا کہ خاوند سے طلاق لے لو۔"

"ہمارا خاندان قاتلوں کا خاندان ہے" — اُس نے بڑی دلیری سے کہا — "میں اپنے خاوند کو ختم کر دوں گی۔ زہر دے دوں یا کسی اور طریقے سے ختم کروں، آپ کی خاطر میں اُسے قتل کر دوں گی۔ پھر آپ میرے ساتھ شادی کر لینا۔ میں آپ کی محبت کو اپنے دل میں چھپا نہیں سکتی۔"

میرا دل یہی کہتا تھا کہ ممتاز کو اپنے گھر سے جانے نہ دوں اور باقی عمر اس کے ساتھ گزار دوں لیکن اس کا خاوند زندہ تھا۔ میں نے ممتاز کو سمجھایا کہ ہمارے راستے الگ الگ ہیں لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ پھر اُس نے کہا کہ میں اُس کو اجازت دوں کہ وہ کبھی کبھی میرے پاس آجایا کرے۔ میں نے اُس کو روک دیا اور اُس کو کہا کہ اپنے گھر چلی جائے۔ وہ نہیں جاتی تھی۔ میں نے اُس کو بہت مشکل سے اپنے گھر جانے پر آمادہ کیا۔

میں وہاں دو سال رہا۔ اس عرصے میں وہ تین مرتبہ میرے گھر آئی۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ وہ اپنے خاوند کو میری خاطر قتل کر دے گی۔ وہ روتی بھی تھی۔ میں نے اُس کو کہا کہ اُس نے اپنے خاوند کو قتل کیا تو میں اس کو گرفتار کر کے عمر قید دلا دوں گا۔

پھر میں ممتاز سے بہت دُور چلا گیا اور دُور دُور ہی رہا۔ میں نے شادی نہ کی۔ ممتاز نے مجھ کو کہا تھا کہ میں نے یعنی میری محبت نے اُس کی زندگی تباہ کر دی ہے لیکن اُس نے میری زندگی تباہ کر دی تھی۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ میں کسی اور لڑکی کے ساتھ شادی کروں۔ میں صوم و صلوٰۃ کا بہت پابند رہا لیکن میرا دماغ خراب ہوتا گیا۔ ممتاز کی محبت اور جدائی نے مجھ کو کسی کام کا نہ چھوڑا۔ پہلے میں اپنی ڈیوٹی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا لیکن اب مجھ سے کوتاہیاں ہونے لگیں۔ ایک بار بے دھیانی میں ایسی غلطی

ہو گئی کہ مجھ کو لائن حاضر کر دیا گیا۔ میں اتنا بد دل ہوا کہ میں نے استعفیٰ دے دیا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔ اُس وقت میری عمر چھتیس سال ہو چکی تھی۔

گاؤں میں تھوڑی سی زمین تھی۔ میں نے سروس میں تھوڑی سی اور خرید لی تھی۔ یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ پاکستان ابھی بنا نہیں تھا لیکن یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان ضرور بنے گا۔ ہندوؤں نے اپنی زمینیں بہت سستی بیچنی شروع کر دی تھیں۔ میں نے ان سے بھی خاصی زمین لے لی۔ میری اکیلی جان تھی۔ میرے لئے یہ زمین بہت زیادہ تھی۔

پاکستان وجود میں آگیا۔ بیٹیوں والے اب بھی مجھ کو رشتے پیش کرتے تھے لیکن شادی کے نام سے مجھ کو چڑ ہو گئی تھی۔ میرے دماغ پر ممتاز سوار رہتی تھی۔ ممتاز سرحد پار کی رہنے والی تھی۔ مجھ کو آج تک معلوم نہیں کہ وہ ہندوستان سے زندہ آگئی تھی یا نہیں۔

ہمارے گاؤں سے ہندو اور سکھ چلے گئے اور اُن کی جگہ مہاجر آباد ہو گئے — پھر پاکستان کی عمر تین سال ہو گئی۔

ایک روز ہمارے گاؤں کے دو آدمی میرے پاس آئے اور مجھ کو کہنے لگے کہ ایک مہاجر خاندان کی بیوہ ہے جس کا ایک بچہ ہے۔ بیوہ کی عمر تیس سال بتائی گئی۔ اُس کا خاوند مشرقی پنجاب میں شہید ہو گیا تھا۔ مجھ کو بتایا گیا کہ یہ خوبصورت عورت ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی مہاجر شادی نہیں کرتا۔ اُس کا قصور یہ تھا کہ وہ پیچھے رہ گئی تھی۔ قتلِ عام کی قیامت میں اپنے لوگوں سے بچھڑ گئی تھی۔ وہ دس گیارہ دن بعد اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے پاکستان میں آگئی۔ یہاں اس کو اپنی برادری اور خاندان کے لوگ مل گئے مگر اُس کو کوئی اپنی بیوی نہیں بناتا۔ مہاجر کہتے ہیں کہ یہ دس گیارہ روز سکھوں کے پاس رہی ہے اس لئے داغدار ہے۔

میں نے شادی نہیں کرنی تھی۔ اب تو عمر ڈھلنے لگی تھی لیکن اس بیوہ کی مشکل سُنی تو میں نے اُس کو بلایا۔ وہ آگئی۔ وہ بہت روتی تھی۔ کہتی تھی کہ اپنے سگے بھی اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ اُس نے دوسری بات یہ بتائی کہ اُس

کے ساتھ شادی کوئی نہیں کرتا لیکن بیوی بنانے والے کئی ہیں۔ اُس نے مجھ کو چار پانچ نام بتا دیتے تھے۔ وہ اس بیوہ پر بُری نظر رکھتے تھے۔ اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میرے خاوند نہ بنو، میرے اس بچے کے باپ بن جاؤ۔

میں نے دوسرے ہی دن اُس کے ساتھ نکاح پڑھا لیا۔ وہ ساری عمر مجھے پیرو مُرشد سمجھتی رہی اور ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہوگئی۔

کافر کی کرامات

میں بہت تھوڑا پڑھا ہُوا ہوں۔ آپ کے رسالے میں بہت زیادہ پڑھے ہوتے حضرات مضمون لکھتے ہیں۔ مجھ کو جرأت نہیں ہونی چاہیئے کہ میں ان سب عالموں کے سامنے کوئی بات کروں لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں اپنے دل میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ باتیں میں آپ کو سناتا ہوں۔ اگر یہ باتیں آپ کے دل لگ جائیں تو اپنے علم کی زبان میں ان کو اچھی طرح بنا سنوار کر لکھ لیں۔ یہ ارادہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ آپ کے رسالے میں روحانیت اور علم الیقین پر کوئی نہ کوئی عالم صاحب مضمون لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی باتیں مجھ کو اچھی لگتی ہیں لیکن ہمارے دیہات میں اس علم کے پردے میں جو چار سَو بیسی ہو رہی ہے، اس نے لوگوں کو برباد کر دیا ہے میں اس کے خلاف بات کرتا ہوں تو دیہاتی لوگ مجھ کو کافر کہتے ہیں۔

اصل واقعہ اس طرح ہے کہ عرصہ چار سال ہُوا ہمارے گاؤں میں میری برادری کے ایک لڑکے کا رشتہ ایک اور گھر سے لیا جا رہا تھا۔ لڑکے کی خالہ اُس کو اپنی بیٹی دینا چاہتی تھی۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ دیہات میں اپنی پسند اور اپنی مرضی کی شادی کوئی نہیں کر سکتا۔ بعض شادیاں والدین بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ برادری کا اپنا حکم چلتا ہے۔ اس لڑکے کا رشتہ اُس کے ماں باپ نے پکا کیا تھا لیکن اس کی خالہ اس لڑکے کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ مجھ کو پورا پورا یقین تھا کہ یہ لڑکا اپنی خالہ کی بیٹی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ مجھ کو یہ بھی پتہ تھا کہ یہ لڑکا کبھی بھی اپنی خالہ کے گھر نہیں گیا تھا۔ چھوٹے ہوتے کبھی گیا ہو گا۔ جوان ہو کر کبھی نہیں گیا۔

ہم سب بہت حیران ہُوتے کہ اس لڑکے نے خالہ کے گھر آنا جانا

شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خالہ کے گھر جاتا تو تین تین چار چار گھنٹے وہیں بیٹھا رہتا۔ ایک دن اُس کے باپ کو میں نے بہت پریشان دیکھا۔ میں نے ذرا ہمدردی سے بات کی تو اُس نے مجھ کو کہا کہ چوہدری اشرف، میں لڑکے کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ اس کی خالہ نے اس کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ کل رات اس نے اپنی ماں سے کہا ہے کہ وہ اپنی خالہ کی بیٹی کے ساتھ شادی کرے گا۔ اب تم ہی بتاؤ چوہدری اشرف کہ یہ ہماری کتنی بے عزتی ہے۔ ایک طرف کڑماتی ہو گئی ہے اور بیٹا کہیں اور پھنس گیا ہے۔ تم سیانے آدمی ہو خدا کے واسطے اُس کو کچھ سمجھاؤ۔

میں نے اُس کو کہا کہ میں کوشش تو پوری کروں گا لیکن آپ کا بیٹا بڑا مُنہ زور ہے۔ مجھ کو یہ بتائیں کہ اس سے پہلے کبھی اُس نے کہا تھا کہ اُسے کو خالہ کی بیٹی اچھی لگتی ہے؟

"نہیں" — اُس نے مجھ کو جواب دیا — "تم ضرور حیران ہو گے کہ بیٹے کا یہ رشتہ پکا کرنے سے پہلے اس کی ماں نے اس سے پوچھا تھا کہ تمہاری خالہ اپنی بیٹی تم کو دینا چاہتی ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ کہتا تھا کہ یہ لڑکی مجھ کو زہر لگتی ہے اسی واسطے میں خالہ کے گھر نہیں جاتا۔ اب دیکھو کہ وہ خالہ کے گھر سے نکلتا ہی نہیں۔"

میں نے اُس کو تسلی دی اور کہا کہ میں اُس کے ساتھ بات کروں گا۔

دوسرے دن کا واقعہ ہے کہ میں نے اس لڑکے کو جس کا نام اکرم تھا، خالہ کے گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ میں اُس کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا، اکرم کدھر جا رہے ہو؟ اُس نے مجھ کو دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ مجھ کو اس طرح لگا جیسے اُس نے مجھ کو پہچانا ہی نہیں۔ وہ رُکا نہیں۔ میں نے اُس کو آواز دی۔ اُس نے پیچھے دیکھا لیکن آگے چلتا گیا۔ میں وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ یہ لڑکا بڑا خوش طبع ہے۔ ہر کسی کے ساتھ بہت اچھا بولتا ہے۔ اب اِس کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھ کو کچھ شک ہُوا۔

دوسرے دن میں سارے کام چھوڑ کر وہیں جا کر کھڑا ہو گیا جہاں میں

نے اکرم کو جاتے دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اکرم آ گیا۔ میں نے آگے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ دیے۔ میں نے کہا، یار کوئی ناراضگی ہو گئی ہے تم تو میرے سلام کا بھی جواب نہیں دیتے۔ اُس نے کبڈی کے کھلاڑیوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ میرے بازوؤں پر مارے اور آگے چل پڑا۔ میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر اور آنکھوں میں غصہ بھرا ہُوا تھا۔ میں وہیں کھڑا رہا اور وہ خالہ کے گھر کی طرف چلا گیا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ کیا چکر ہے۔ میں اکرم کے گھر چلا گیا۔ اُس کے ماں باپ کو میں نے کہا کہ تمہارے بیٹے پر اس کی خالہ نے کوئی تعویذ دھاگہ کر دیا ہے۔ تم لوگ مجھ کو کافر کہتے ہو۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ تمہارے بیٹے کا کیا حال ہو گیا ہے۔ مجھ کو شک ہے کہ تم جس پیر کے مُرید ہو یہ کرتوت اُس کی ہے۔

"نہیں چوہدری اشرف!" — اکرم کے باپ نے کہا — "یہ شک مجھ کو پہلے بھی تھا کہ لڑکے پر کالا جادو چل گیا ہے لیکن یہ کام ہمارے پیر صاحب کا نہیں۔ وہ ایسا کام کرتے ہی نہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ یہ علم جانتے ہی نہیں۔"

اکرم کا باپ عقل والا انسان تھا۔ میں نے اُس کی بات مان لی۔ میں اپنے بارے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کسی پیر کو نہیں مانتا۔ میرا پیر خدا کا رسولؐ ہے۔ گاؤں کے لوگ مجھ کو 'بے پیرا' کہتے ہیں۔ عورتیں مجھ کو بددعا یا ہُوا کہتی ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ کالا علم موجود ہے اور اس سے دشمنوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ مجھ کو پہلے بھی کسی نے بتایا تھا کہ اس گاؤں کا پیر کالا علم نہیں کرتا۔ میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کس نے کیا ہے۔

میں اکرم کی خالہ کے خاوند کے پاس چلا گیا۔ میں نے اُس کو صاف بتایا کہ تم شیطانی کاموں سے باز آ جاؤ۔ تم نے اکرم پر جادو کروایا ہے۔ تم کو یہ ہوش نہیں کہ یہ جادو ساری عمر نہیں چل سکتا۔ تمہاری لڑکی کی شادی اس جادو کے زور پر اکرم کے ساتھ ہو جائے گی لیکن بعد میں جادو ختم ہو جائے گا۔ لڑکے پر جُوں ہی جادو کا اثر ختم ہو گا وہ تمہاری بیٹی کو تنگ کرے گا یا طلاق

دے دے گا۔

اس شخص نے مجھ پر غصہ کرنا شروع کر دیا۔ کہنے لگا کہ تم اکرم کے یا میری بیٹی کے چاچے لگتے ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو۔

میں گاؤں کا کمین تو نہیں تھا کہ دبک جاتا۔ میں بھی انہی چوہدریوں جیسا چوہدری تھا۔ میں نے اُس کو کہا کہ دیکھو چوہدری میں تمہارے فائدے کی بات کرتا ہوں۔ میں نے جب بہت ساری باتیں کیں تو وہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے اُس کو صاف بتایا کہ تمہاری بیوی بہت تیز ہے۔ اس طرح کی تیز بیویاں اپنے مردوں کو ذلیل کرا دیتی ہیں۔ تم کو معلوم نہیں ہو گا لیکن تمہاری بیوی نے اُلٹا علم ضرور چلایا ہے۔ تم اپنی مونچھ کو ذرا نیچے کرو اور اس بے عزتی سے ڈرو جو تمہارے لئے آ رہی ہے۔

اس بات سے وہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تب اُس نے کہا کہ اُس کو کچھ پتہ نہیں کہ اُس کی بیوی کیا کرتی ہے اور اکرم نے میرے گھر میں کیوں آنا جانا شروع کر دیا ہے۔ مجھ کو اتنا پتہ ہے کہ میری بیوی نے قسم کھائی تھی کہ اپنی بیٹی اکرم کو ہی دے گی۔ اگر اس نے کچھ کیا ہے تو اُس کا خدا جانے، مجھ کو کچھ پتہ نہیں۔

میں نے صاف طور پر دیکھا کہ یہ شخص اپنی بیوی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم بھی چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی کا بیاہ اکرم کے ساتھ ہو؟ اُس نے صاف جواب دیا کہ نہ اکرم نہ اُس کے ماں باپ میرے گھر کا رشتہ پسند کرتے ہیں پھر میں کیوں زبردستی ان کو رشتہ دوں؟

میں نے اُس کو کہا کہ اکرم اُس کے گھر آتا جاتا ہے تو اس کے بارے میں اُس کا کیا خیال ہے۔ اُس نے صاف کہا کہ مجھ کو یہ بالکل پسند نہیں لیکن میری بیوی اور میری بیٹی اُس کو بہت پسند کرتے ہیں۔

میں نے جب اس شخص کو بیوی کے ہاتھ میں اتنا مجبور دیکھا تو میں نے اُس کو صاف کہا کہ تم یہ تو مانتے ہو ناکہ تمہاری بیوی نے لڑکے پر کوئی تعویذ دھاگہ کرایا ہے۔ اُس نے مجھ کو جواب دیا کہ ہاں مجھ کو یہ شک ہے۔ میں نے

اُس کو کہا کہ یاد رکھو چاچا کہ شیطانی عمل جب اُلٹا پڑتا ہے تو گھر بار تباہ کر کے جاتا ہے۔

وہ ڈر گیا اور کہنے لگا کہ مجھ کو کچھ پتہ ہو تو میں کچھ کروں۔ میں نے اس کو کہا کہ میں کچھ کرتا ہوں۔ تم مجھ کو صرف اجازت دے دو۔ اُس نے کہا کہ تمہارے دماغ میں جو آتا ہے وہ کرو۔ میں تم کو نہیں روکوں گا۔

مجھ کو یہ پتہ تھا کہ شیطانی عمل کو توڑنے کے لئے شیطانی عمل ہی کرایا جاتا ہے لیکن میں کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے گاؤں کے بہت سے آدمیوں سے پوچھا۔ سب نے کہا کہ اس سارے علاقے میں کالا علم جاننے والا کوئی نہیں۔ میں نے سب سے کہا کہ تمہارے پیر صاحب جانتے ہوں گے۔ سب نے انکار کیا۔ ہمارے علاقے کا تھانیدار میرا واقف کار تھا۔ میں اُس کے پاس چلا گیا۔ میں نے اُس کو کہا کہ دیکھو تمہارے علاقے میں ایک جُرم ہو رہا ہے۔ میں نے اُس کو یہ پوری بات سنا دی۔

اُس نے کہا کہ یہ مذہب کا معاملہ ہے اس واسطے میں اس کو جُرم نہیں کہتا۔ میں نے اُس کو کہا کہ اس شیطانی عمل کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اُس کو یہ بھی کہا کہ کوئی آدمی کسی کو بھنگ یا شراب یا کوئی ایسی ویسی دوائی پلا کر اُس سے غلط کام کرواتے یا اُس کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرے تو کیا یہ جُرم نہیں ہے؟

تھانیدار نے میری کسی بات پر دھیان نہ دیا اور مجھ کو ٹال دیا۔ یہاں میں اس واردات کو ذرا روک کر آپ کو اپنے بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں کوئی زیادہ پڑھا ہُوا آدمی نہیں ہوں اور میں دیہاتی ہوں۔ اب میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں انگریزوں کی فوج کا حوالدار تھا اور پاکستان میں آ کر مجھ کو میڈیکل پنشن ملی ہے۔ آپ ضرور حیران ہوں گے کہ ایک دیہاتی اور فوجی اور بہت تھوڑا پڑھا ہُوا عقل والا کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ پیروں کو نہ مانے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے حقیقت کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ [illegible]

وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا انسان کا کوئی مددگار نہیں اور اس کے سوا انسان کو کوئی انسان نہ فائدہ دے سکتا ہے نہ نقصان دے سکتا ہے۔ میں جنگِ عظیم دوم میں برما فرنٹ پر تھا۔ ہر ایک سپاہی کی گردن کے ساتھ یا بازو کے ساتھ اپنے پیر کا تعویذ بندھا ہُوا ہوتا تھا۔ میرے پاس بھی تعویذ تھا۔ وہ کہیں گُم ہو گیا۔ میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ اس لڑائی میں میری آدھی بٹالین ماری گئی۔ مرنے والوں میں تعویذ والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ میرے دل سے آواز نکلی کہ تمہارا تعویذ گُم نہ ہو جاتا تو تم بھی مارے جاتے۔ بس وہاں سے میرے دل میں خدا کی روشنی آگئی اور سب تعویذ دھاگے نکل گئے۔

اس لڑائی کو چھوڑیں وہ کافروں کی لڑائی تھی اور ہم کرائے کے سپاہی تھے۔ میں آپ کو اُس لڑائی کا حال سناتا ہوں جو میں نے خدا کے نام پر لڑی تھی۔ یہ کشمیر کی پہلی جنگ تھی جو ۱۹۴۷ء میں شروع ہوئی تھی اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو ختم ہو گئی تھی۔ اُوڑی کے محاذ پر دُشمن کا توپ خانہ ہم کو بہت برباد کرتا تھا۔ میں نے اپنے کمپنی صوبیدار کو کہا کہ آپ اگر مجھ کو اجازت دیں تو میں دُشمن کے توپ خانے کو ختم کر سکتا ہوں۔ صوبیدار نے کہا کہ تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اُس کو کہا کہ آپ یہ سمجھیں کہ حوالدار اشرف چھٹی پر چلا گیا ہے یا زخمی ہو کر ہسپتال چلا گیا ہے۔ آپ مجھ کو بھول جائیں۔

فوج میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی آدمی اپنی مرضی سے کوئی کام کرے۔ ہر کام اپنے افسروں کے حکم سے چلتا ہے کیونکہ دماغ افسر کا کام کرتا ہے لیکن کشمیر کا محاذ کچھ اور قسم کا تھا۔ پھر وہ جنگ ہماری اپنی جنگ تھی۔ میں نے صوبیدار کو منوا لیا اور دو جوان اپنی پلاٹون کے ساتھ لئے تین قبائلی پٹھان اور دو میرپور کے مجاہدین جو سابق فوجی تھے اُن کو ساتھ لیا۔ اس پارٹی کو میں نے بتایا کہ کیا کام ہے۔ ان کو زبانی ٹریننگ دی۔

کشمیر کی لڑائی کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ آسمان سے سبز کپڑوں والے انسان اُترتے ہیں اور وہ مجاہدین کی مدد کرتے ہیں اور

ہندوستان کے ہوائی جہاز جو بم پھینکتے ہیں ان کو سبز پوش راستے میں پکڑ کر دریا میں پھینک دیتے ہیں۔ میں نے اپنی پارٹی کو کہا کہ دیکھو جوانو! تمہاری مدد کے لئے آسمان سے سبز کپڑوں والا کوئی انسان یا فرشتہ نہیں اُترے گا۔ جب خدا خود تمہارے ساتھ ہے تو وہ سبز کپڑوں والوں کو کیوں بھیجے گا۔ تم کافروں کے خلاف لڑ رہے ہو اور جو کافر کے خلاف لڑتا ہے اُس پر خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ میں نے اُن کو کہا ـــــ "خبردار! کسی پیر فقیر اور مُرشد کا نام نہ لینا۔ اللہ کو اور اُس کے رسولؐ کو یاد کرتے جانا تمہارے لئے ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔"

یہ کہانی پڑھنے والے دوستو! یقین کرنا کہ ایک میرپوریے نے اپنے گلے سے تعویذ اُتار کر پھینک دیا۔ ہم رات کے پہلے پہر چل پڑے۔ پہاڑیوں میں چلتے چلتے اور دُشمن کی پوسٹوں کے نیچے سے گزرتے ہم دُشمن کے توپ خانے کے پیچھے پہنچ گئے۔ وہ محاذ بہت گرم تھا۔ اللہ نے ہماری یہ مدد کی کہ دشمن کے توپ خانے نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس سے ہم کو یہ فائدہ ملا کہ پتہ چل گیا کہ دُشمن کی گن پوزیشنیں کہاں ہیں۔ وہ ایک پہاڑی کی ڈھلان تھی۔

اِس بات کو چھوڑیں کہ ہم پہاڑی کے اُوپر کس طرح خاموشی سے چڑھ گئے۔ ہم اُوپر سے نیچے آئے۔ میں نے پارٹی کو جوڑی جوڑی میں بانٹا ہُوا تھا۔ میری گنتی یہ تھی کہ توپیں چھ ہیں۔ میری ایک جوڑی نے سب سے پہلے گرینیڈ پھینکا۔ گرینیڈ وہاں گرا جہاں توپ کے گولے رکھے ہوتے تھے۔ اتنی زور کا دھماکہ ہُوا جس سے پہاڑی ہل گئی۔ اس کے بعد میں نے گرینیڈ پھینکا۔ اس گرینیڈ نے بھی وہی کام کیا۔ اس کے بعد مجھ کو پتہ نہیں کہ کتنے دھماکے ہُوئے اور کیا ہُوا۔ ہم اپنا کام کر کے وہاں سے نکلے۔ صبح اپنی پوزیشن میں پہنچ گئے۔ ہم اکیلے اکیلے آئے تھے۔ ایک جوان میری پلاٹون کا اور ایک سابق فوجی میرپور کا واپس نہ آ سکے۔ یہ پتہ چل گیا کہ چار توپیں بالکل تباہ کر دی گئی تھیں۔

اس گن پوزیشن کو تباہ کر کے ہم نے بہت فائدہ اُٹھایا۔

پانچ چھ دنوں کے بعد میرے بائیں بازو میں گولی لگی۔ مجھ کو پیچھے لے آئے۔ گولی کسی ایسی رگ کو کاٹ گئی کہ میرا بازو کہنی سے اکڑ گیا اور بے کار ہو گیا لیکن مجھ کو افسوس کی بجائے خوشی ہے کہ میں نے خدا کی خوشنودی کے لئے کچھ کیا ہے۔ میری روح ایسی روشن ہوتی کہ سب تعویذ دھاگے، وہم اور ڈھکوسلے ذہن سے نکل گئے۔ بس یہ وجہ ہے کہ میں ان دنیاوی چکر بازیوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔

میں آپ کو سُنا رہا تھا کہ تھانیدار نے مجھ کو ٹال دیا۔ مجھ کو بہت افسوس ہُوا کہ اسلامی ملک کا تھانیدار اگر پیری مُریدی اور شیطانی علم اور عمل کو جرم نہیں سمجھتا تو لوگوں کو خدا کی روشنی کون دکھلائے گا۔ میں نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ کم از کم اپنے گاؤں والوں کو روشنی میں دکھاؤں گا۔ میں نے رات کو کچھ نفل پڑھے اور خدا سے دعا مانگی کہ یا مولا! مجھ کو راستہ دکھا جس پر میں چل کر میں ان گمراہ لوگوں کو تمہاری روشنی دکھا سکوں۔

اس کے فوراً بعد میرا دماغ ایک بڑے قابل سراغ رساں کی طرح کام کرنے لگا۔

مجھ کو خیال آیا کہ اکرم کی خالہ نے اگر کسی سے کوئی شیطانی عمل کرایا ہے تو وہ اُس کے پاس ضرور جاتی ہوگی۔ مَیں نے اس عورت پر نظر رکھ لی۔ ایک رات میں ویسے ہی باہر نکلا اور گاؤں سے تھوڑا باہر چلا گیا۔ چاندنی صاف تھی۔ مجھ کو دیکھ کر چوکیدار آ گیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کہ چوہدری کدھر گھوم رہے ہو۔ مجھ کو خیال آیا کہ میں اس شخص کو بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ میں نے اُس کو کہا کہ میں تم کو انعام دوں گا۔ تم اکرم کی خالہ پر نظر رکھو کہ وہ رات کو کہیں جاتی ہوگی۔

چوکیدار نے کہا کہ چوہدری جی! اس وقت آپ کچھ اور نہ مانگئے۔ وہ اب بھی کہیں گئی ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا کدھر گئی ہے؟ اُس نے مجھ کو ساتھ لیا اور ایک ایسا گھر دکھایا جو گاؤں کے باہر تھا۔ وہ ایک شریف آدمی

کا گھر تھا۔ وہ آدمی کھدر کے کپڑے بُنتا تھا۔ سن کی رسیاں بھی بناتا تھا۔ اَن پڑھ لوگوں کے خط پتر بھی لکھتا تھا۔ اتنے میں ایک عورت گھر سے نکلی۔ ہم ایک طرف ہو گئے۔ وہ ہمارے قریب سے گزری۔ وہ اکرم کی خالہ تھی۔ چوکیدار نے بتایا کہ وہ اس عورت کو تین چار مرتبہ رات کو اسی وقت اس گھر میں آتے جاتے دیکھ چکا ہے۔ چوکیدار غریب سے لوگ ہوتے تھے۔ وہ چوہدریوں اور اونچی ذاتوں کے کاموں اور کرتُوتوں میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ مجھ کو حیرت اس بات کی تھی کہ اس گھر میں یہ عورت کیا لینے آتی ہے۔ یہ تو ایک شریف آدمی کا گھر ہے۔ خالہ شریف عورت نہیں تھی۔ میں نے چوکیدار کو کہا کہ جب بھی آئندہ یہ عورت اس گھر میں آئے تو وہ مجھ کو جگا کر بتائے۔ چوکیدار کچھ ڈر گیا۔ کہنے لگا کہ چوہدری جی! مجھ غریب کو کیوں مرواتے ہو۔ میں نے اُس کا دل بڑا کیا اور کہا کہ چلو میرے گھر آؤ۔ میں نے گھر لا کر اُس کو دس روپے دیئے۔

اگلے چھ سات دنوں میں چوکیدار نے دو مرتبہ مجھ کو جگا کر بتایا کہ اکرم کی خالہ اُسی گھر میں گئی ہے۔ میں نے دونوں مرتبہ باہر جا کر خالہ کو واپس آتے دیکھا اور میں نے دونوں مرتبہ چوکیدار کو پانچ پانچ روپے دیئے۔ اب مجھ کو زیادہ ثبوت اور شہادت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اُس آدمی کے گھر ایک دن چلا گیا۔ وہ بہت پیار اور احترام سے ملا۔ میں نے سیدھی اور کھری بات کی۔ میں نے کہا کہ فلاں چوہدرانی رات کو تمہارے پاس کیوں آتی ہے۔ وہ اتنا گھبرایا کہ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن آدمی ایسا ہوشیار تھا کہ فوراً بولا کہ اس عورت کو آدھے سر کا دَرد رہتا ہے۔ مجھ کو میرے اُستاد نے ایک دَم درُود بتایا تھا۔ اس چوہدرانی کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ مجھ کو آدھے سر کے دَرد کا دَم آتا ہے۔ اس دَم کا یہی وقت ہے۔ اس واسطے آتی ہے۔

میں نے اُس کو کہا کہ تم کچھ اور بھی کرتے ہو۔ اُس نے کہا کہ میں اور تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ کہنے لگا کہ میں تو دَم کسی کو بتاتا ہی نہیں تھا۔ پتہ نہیں اس چوہدرانی کو کس طرح پتہ چل گیا ہے۔ اس کے بعد اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت شروع کر دی کہ میں اس پر کوئی شک و شبہ نہ کروں۔ سچی

بات یہ ہے کہ میں اس شخص پر کوئی شک وشبہ نہیں کر سکتا تھا۔

اکرم کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہوتی جارہی تھی۔ اب گاؤں کے لوگ بھی کہتے تھے کہ اکرم کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس کے چلنے سے صاف پتہ لگتا تھا کہ وہ کسی اثر میں ہے۔ ایک دن اُس کا باپ میرے آگے رو پڑا۔ میں نے اُس کو تسلی دی اور اُس کو یہ بھی کہا کہ دیکھو اگر میں اس سلسلے میں کوئی کارروائی کروں تو تم میرا ساتھ دینا۔ اُس نے میری خوب ہلاشیری کی۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے خدا سے روشنی مانگی تھی اور میں ایک شیطانی عمل کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ اب آپ دیکھیں کہ خدا نے میری کس طرح مدد کی۔ چار پانچ دن بعد کا واقعہ ہے کہ مجھ کو ایک گاؤں میں ایک ماتم پر جانا پڑا اور وہاں سے میں رات کو واپس چلا۔ اپنے گاؤں سے میں آدھا یا پون میل دُور پہنچا ہوں گا کہ چاندنی میں مجھ کو ایک چوڑے کھڈ میں ایک عورت نظر آئی جو سر سے پاؤں تک کپڑوں کے بغیر کھڑی تھی۔ میں نے چڑیلوں کو کبھی نہیں مانا لیکن اس عورت کو دیکھ کر میرا دل بھٹک گیا کہ یہ چڑیل ہے۔ میں کھڈ کے اُوپر تھا۔ وہ نیچے تھی۔ میرے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ چڑیل کے ہاتھ اور پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں لیکن اس عورت کے ہاتھ پاؤں سیدھے تھے۔ اُس نے مجھ کو دیکھ کر بڑی زور سے کہا — "جا ... جا ...."

میں نے تین دفعہ سورہ اخلاص پڑھی اور کھڈ میں کُود گیا۔ کلہاڑی سیدھی کر کے کہا — "سچ بتا تُو کون ہے نہیں تو سر کھول دوں گا۔"

وہ مجھ سے ڈر کر پیچھے ہٹی۔ میں دلیر ہو گیا کہ یہ عورت ہے چڑیل نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ مجھ سے اپنے ستر پر پردہ ڈال رہی ہے۔ ویسے ہی میری نظر پڑی۔ مجھ کو اُس کے کپڑے نظر آگئے۔ میں نے اُس کی طرف پیٹھ کر لی اور کہا کہ کپڑے پہنو۔ دیہات کے لوگ عجیب وغریب ٹونے ٹوٹکے کرتے رہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عورت کوئی ٹونہ کر رہی ہے۔

وہ کپڑے پہن چکی تو میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اُس کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ بے اولاد ہے اور ایک آدمی نے اُس کو یہ ٹونا بتایا ہے کہ اس جگہ کپڑے اُتار کر کھڑی ہو جاؤ اور اُس نے کچھ الفاظ بتائے تھے کہ یہ پڑھتی رہو تو دو تین جنات آئیں گے اور وہ جو حکم تم کو دیں وہ مان لینا اور اس کے بعد تمہارا بچہ پیدا ہو جائے گا۔

یہ کہہ کر اِس عورت نے کہا کہ مجھ کو تم ہر طرح اپنی سمجھو صرف یہ مہربانی کرنا کہ میرا یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا۔ میں نے اُس کو کہا کہ میں نہ شیطان ہوں نہ شیطانی عمل کو پسند کرتا ہوں۔ تم مجھ کو اُس آدمی کے پاس لے چلو جس نے تم کو یہ ٹونہ بتایا ہے۔ وہ کسی دوسرے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ میری منتیں کرنے لگی کہ اُس آدمی کے پاس نہ لے جاؤ۔ میں نے کلہاڑی سیدھی کی، اُس کو ڈرایا اور کہا کہ میں اُس کو اُٹھا کر اپنے گاؤں لے جاؤں گا۔

وہ میرے ساتھ چل تو پڑی لیکن قدم قدم پر وہ رُکتی تھی، میری منت سماجت کرتی تھی اور ایک فاحشہ عورت کی طرح مجھ کو اپنا آپ پیش کرتی تھی۔ میں چلتا گیا اور اُس کو سمجھاتا رہا کہ تم عزت دار عورت ہو، ایک خواہش نے تم کو مجبور کر دیا ہے کہ تم یہ شیطانی عمل کرو۔ ایک مسلمان عورت کو چاہیئے کہ وہ جان دے دے اپنی عزت کسی کو نہ دے۔ میں تم کو یہی دکھانے کے لئے لے جا رہا ہوں کہ تم کتنے بڑے دھوکے میں آئی ہوتی ہو۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہاری عزت پر میں اپنی جان دے دوں گا۔

اِس طرح وہ مجھ کو میرے ہی گاؤں میں لے گئی اور اُس وقت میں بے حد حیران ہُوا جب اُس نے مجھ کو اُس گھر کے دروازے کے سامنے جا کھڑا کیا جس گھر میں اکرم کی خالہ جایا کرتی تھی۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ یہ تو ہمارے گاؤں کا ایک شریف آدمی ہے۔ تم مجھ کو دھوکہ دے رہی ہو۔ عورت اس قدر غصّے میں آگئی کہ اُس نے زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارے۔ دروازہ کُھلا تو وہ آدمی میرے سامنے آیا جس کو سارا گاؤں نہایت شریف

آدمی سمجھتا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اس عورت کو یہ شیطانی ٹونہ تم نے بتایا ہے؟

وہ چُپ چاپ میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوری طاقت سے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ وہ کواڑوں کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑا۔ میں نے اُس کو بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور کہا کہ فوراً بولو۔ اُس نے ہم دونوں سے کہا کہ اندر چلو۔ ہم اندر گئے تو اُس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے یہ کہا کہ چوہدری میرے ہاتھ میں اتنی طاقت ہے کہ جیسا تھپڑ تم نے میرے مُنہ پر مارا ہے ایسے تھپڑ ہر روز تمہارے مُنہ پر پڑیں گے لیکن تم کو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ تھپڑ کون مار رہا ہے۔ میں تم کو چلتی پھرتی لاش بنا سکتا ہوں۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہارے پاس کالا علم ہے"— میں نے کہا — "میں تمہارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ تم اپنا علم مجھ پر چلاؤ۔ تم کو اجازت ہے۔ جو کچھ بھی کر سکتے ہو کرو۔"

میں چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دل ہی دل میں سورۃ اخلاص کا وِرد شروع کر دیا اور خدا پر توجہ اس طرح لگا لی جیسے یہاں میرے اور خُدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ اُٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ میرے چہرے کے قریب کر کے کچھ مُنہ ہی مُنہ میں بولنے لگا۔ میں نے سورۃ اخلاص کا وِرد جاری رکھا۔ مجھ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مجھ کو ہپناٹائز کر رہا ہے۔ وہ بہت دیر اپنا عمل کرتا رہا۔ اُس نے اپنے دونوں انگوٹھے میری کنپٹیوں پر رکھ کر دباتے۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ مجھ کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ کتنے منٹ یا کتنے گھنٹے گزر گئے ہیں۔ آخر وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ میں بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"چوہدری!"— اُس نے کہا — "مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ تم بھی یہ علم جانتے ہو۔ تمہارا پیر اُستاد کون ہے؟"

میں نے انگلی آسمان کی طرف کی اور چُپ رہا۔

"بولو چوہدری کیا چاہتے ہو"— اُس نے پوچھا۔

"میں تم کو بہت شریف آدمی سمجھتا تھا"— میں نے کہا — "اگر تمہارے دل میں یہ خواہش ہے کہ میں تمہارے ساتھ سودا بازی کر کے چُپ ہو جاؤں گا تو یہ خواہش دل سے نکال دو۔ میں تم کو سارے گاؤں میں ننگا کر دوں گا اور تم کو اس گاؤں سے نکلوا دوں گا۔ اس عورت کو دیکھو۔ یہ ایک شریف گھرانے کی عورت ہے۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو سوچو کہ وہ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ اس عورت کی جوانی اور خوبصورتی دیکھو۔ پھر یہ دیکھو کہ خدا نے مجھ کو کتنی طاقت دی ہے کہ میں اس عورت کو اپنی بیٹی اور بہن سمجھ کر یہاں لے آیا ہوں۔ تم پہلا کام یہ کرو کہ اکرم سے اپنا اثر آج رات ہی اُتار دو۔ میں صبح اکرم کو صحیح حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو دوپہر سے پہلے پہلے تمہارے اس گھر کو آگ لگی ہوتی ہو گی۔"

ایک تو میں گاؤں کے چوہدری خاندان کا فرد تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس کو یقین ہو گیا تھا کہ میرے پاس بھی اُس جیسا کوئی علم ہے۔ میں نے اُس کو بالکل نہ بتایا کہ میں تو اللہ کے کلام پر عقیدہ رکھتا ہوں اور وہی پڑھتا رہا ہوں۔ اُس نے وعدہ کیا کہ صبح اکرم بالکل پہلی حالت میں آ جاتے گا۔

میں نے اُس عورت کو دیکھا کہ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ چُپ چاپ میرے مُنہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ کو خیال آیا کہ یہ تو گھر میں کسی کو بتاتے بغیر آئی ہو گی لیکن اس کو تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ بے چاری پکڑی جاتے گی۔ مجھ کو معلوم تھا کہ اس آدمی کی گھوڑی ہے۔ میں نے اُس کو کہا کہ اپنی گھوڑی فوراً مجھ کو دو۔ تھوڑے سے وقت میں وہ گھوڑی تیار کر کے لے آیا۔ میں گھوڑی پر سوار ہُوا۔ اس عورت کو پیچھے بٹھایا اور گھوڑی دوڑا دی۔ اُس کو اُس کے گاؤں کے باہر اُتارا اور واپس آ گیا۔ گھوڑی اس آدمی کو واپس کی اور اس کو ایک بار پھر دھمکی دی کہ وہ میرا کام کر دے۔

اُس نے میری منت کی کہ میں اُس کا یہ راز کسی کو نہ دوں۔ میں نے

اُس کو کہا کہ تم نے یہ کیا چکر چلا رکھا ہے۔ اُس نے کہا کہ اُس نے کسی وقت
ایک سادھو بہنت کی بڑی خدمت کی تھی۔ اُس نے خوش ہو کر اسے اپنی
شاگردی میں بٹھا لیا اور یہ علم سکھا دیا۔

"چوہدری!" —اُس نے کہا— "اس گاؤں کی تین عورتوں کے سوا
اس راز سے کوئی بھی واقف نہیں۔ اب اگر تم میرے جسم کے ٹکڑے کر دو تو
بھی ان تین عورتوں کے نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ وہ تمہاری ہی برادری کی عورتیں
ہیں۔ نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ نہیں تو اس گاؤں میں بڑا خون خرابہ ہو گا۔ میں یہ
وعدہ کرتا ہوں کہ اس گاؤں میں یہ کام نہیں کروں گا۔"

مَیں نے خود بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں اپنی برادری کو جانتا تھا۔
جب انسان گاؤں کا چوہدری بن جاتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس کے لئے
ہر گناہ معاف ہے۔

دوسرے دن میں گھر سے نکلا اور اکرم کے گھر کا رُخ کیا۔ اکرم اپنے
دروازے میں کھڑا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر بڑی خوشی سے بولا— "آؤ چاچا کہاں چلے
گئے تھے۔ تم تو اتنے دن نظر ہی نہیں آتے"— اور وہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ تم کہاں چلے گئے تھے۔ اُس نے کچھ
پریشان سا ہو کر کہا کہ معلوم نہیں مجھ کو کیا ہو گیا تھا کہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ
اس گاؤں میں چل پھر رہا ہوں لیکن یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی اور دُنیا ہے۔"

"سُنا ہے تم خالہ کی بیٹی سے شادی کر رہے ہو"— میں نے پوچھا۔

"یہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟"— اُس نے حیران ہو کر کہا— "میں
سنکھیا کھا لوں گا۔ خالہ کی بیٹی کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔"

اکرم اپنی اصلی حالت پر واپس آ گیا تھا۔ اُس کی شادی وہیں ہوئی
جہاں اُس کے ماں باپ چاہتے تھے۔ وہ ہر طرح صحیح رہا۔

اُس عورت کی کہانی الگ تھلگ ہے جسے میں نے ٹونا کرتے پکڑا
تھا۔ وہ پوری سنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اتنا بتا دیتا ہوں کہ اب اُس
کے دو بچے ہیں لیکن خاوند دوسرا ہے۔ میں نے ایک ڈرامہ کھیل کر پہلے خاوند

سے اُس کو طلاق دلوا دی تھی۔ اس عورت نے دوسری شادی کی تو اُس کے
دو بچے پیدا ہوئے۔

لوگ اب بھی مجھ کو کافر ہی کہتے ہیں!!

ضمیر کی زنجیر

میرے والد صاحب آزادی سے پہلے برٹش انڈیا کی انڈین آرمی میں ڈاکٹر تھے۔ وہ میجر کے رینک سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ دراصل نفسیات کے ڈاکٹر (سائیکاٹرسٹ) تھے۔ انہیں فوت ہوئے آٹھ سال گزر گئے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے کئی نفسیاتی کیس سنائے تھے۔ میں اُن کا ایک کیس اُنہی کی زبانی سناتا ہوں۔ والد صاحب کو اُن دو فوجیوں کے نام یاد نہیں تھے جن کا یہ کیس تھا۔ میں اُن کے فرضی نام استعمال کروں گا۔

۱۹۴۳ء میں انگریزوں کی انڈین آرمی برما میں لڑ رہی تھی۔ یہ دوسری جنگِ عظیم تھی۔ پہلے جاپانی فوج نے انگریزوں کی فوج کو برما سے بھگا کر اس ملک پر قبضہ کر لیا تھا پھر انگریزوں نے حملہ کیا اور جاپانی پسپا ہو رہے تھے لیکن جاپانی فوج کی پسپائی انگریزوں کو بھی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ جاپانی فوجی خودکشی کے انداز سے لڑتے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے لیکن انگریزوں کی فوج کا بہت نقصان کر رہے تھے۔

جنگ میں فوجی بہت بُری طرح زخمی ہوتے ہیں۔ ایسے فوجیوں کو بھی فوجی ہسپتال میں بھیجا جاتا تھا جو زخمی نہیں ہوتے تھے۔ ان کے دماغ بیکار ہو جاتے تھے۔ اس مرض کو SHEL SHOCK کہا جاتا ہے۔ مورچوں پر دشمن کے توپ خانے کے گولے لگاتار پھٹتے رہتے تھے۔ اتنے زیادہ دھماکوں سے کسی فوجی کا دماغ ہل جاتا تھا اور وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا تھا۔

میں اُس وقت جبل پور فوجی ہسپتال میں تھا۔ ایک ہندوستانی بٹالین برما کے محاذ پر زیادہ عرصہ لڑ کر جبل پور آئی ہوئی تھی۔ اسے آرام دیا جا رہا تھا۔ ایک روز ایک انگریز ڈاکٹر نے جو میجر تھا، مجھے کہا کہ وہ ایک مسلمان نائیک

کو میرے پاس بھیجے گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ SHEL SHOCK کا مریض نہیں لگتا تھا۔ اگر اُس کا مرض بھی ہوتا تو محاذ سے ہی پیچھے بھیج دیا جاتا۔ اُسے محاذ سے آتے چھ مہینے ہو گئے ہیں اور وہ ایک مہینہ چھٹی بھی گزار آیا ہے۔ یہ انگریز ڈاکٹر اُسے نفسیاتی مریض کہہ رہا تھا۔

یہ انگریز ڈاکٹر اس نائک میں جو ہندوستانی مسلمان تھا، اس لئے دلچسپی لے رہا تھا کہ یہ نائک امن میں بریگیڈ کا ایتھلیٹ تھا اور محاذ پر قابل اور نڈر سیکشن کمانڈر۔ اس کا کمپنی کمانڈر جو انگریز تھا، اسے بہت پسند کرتا تھا۔ یہ میجر اس میجر ڈاکٹر کا دوست تھا۔ انگریز افسر اس نائک جیسے فوجیوں کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ اس کمپنی کمانڈر نے میجر ڈاکٹر سے کہا تھا کہ نائک سلیمان کا علاج نہ ہُوا تو اسے وہ انڈین آرمی کا بھی اور اپنا ذاتی بھی نقصان سمجھے گا۔

کمپنی کمانڈر کی سفارش سے نائک سلیمان کو میرے پاس بھیجا گیا، ورنہ انڈین آرمی میں لاکھوں فوجی تھے۔ ہر کسی کو اتنی زیادہ توجہ نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں نے ویسے بھی اپنی عادت بنائی ہوتی تھی کہ میں یہ نہیں دیکھا کرتا تھا کہ مریض جسے میرے پاس بھیجا جاتا تھا وہ سپاہی ہے یا جرنیل، میرے لئے ہر مریض انسان ہوتا تھا۔ مریض خود تو میرے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ فوج کا طریقہ کچھ اور تھا۔ میرے پاس وہی مریض آتا تھا جسے میڈیکل آفیسر میری طرف رَیفر کرتے تھے۔

سلیمان آیا تو میں نے اپنے طریقے کے مطابق اُس سے یہ نہ پوچھا کہ اُسے کیا تکلیف ہے بلکہ اُس کے ساتھ بے تکلّف دوستوں کی طرح محاذ کی اور بارکوں کی باتیں کیں تاکہ وہ بے تکلفی سے اپنی حالت بیان کر سکے۔ وہ پھر بھی گھبرا رہا تھا۔ میں نے مشاہدہ کر لیا کہ اُس کے ذہن پر بوجھ ہے۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔

"میرے جسم میں جان نہیں رہی" —— اُس نے ایسی آواز میں کہا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ کچھ دیر چُپ رہ کر اُس نے کہا —— "مجھ پر کسی دُشمن نے کالے علم کے تعویذ کر دیئے ہیں۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا اور دل پر خوف

بیٹھ گیا ہے۔"

اُس دَور میں سپاہی اَن پڑھ ہوتے تھے۔ انہیں فوج میں رومن اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ نائک سلیمان فوجی ہونے کے علاوہ دیہاتی تھا اس لئے اُس نے تشخیص خود کر لی تھی کہ اُسے کسی نے تعویذوں سے بیکار کر دیا ہے۔ دیہات میں اور شہروں میں بھی لوگ ایک دوسرے کو تعویذوں کے ذریعے نقصان پہنچانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

نائک سلیمان سے میں نے کرید کرید کر پوچھا تو اُس نے بتایا کہ برما کے محاذ پر اُس نے بڑی سخت جنگ لڑی ہے۔ جاپانی اپنے قدم جمانے کے لئے بے جگری سے لڑتے تھے۔ سلیمان کی بٹالین آگے تھی۔ دن رات اس کی پوزیشنوں پر گولا باری ہوتی رہتی تھی۔ کبھی جاپانی حملہ کرتے اور کبھی سلیمان کی بٹالین حملہ کرتی تھی۔ مشین گنوں اور رائفلوں کی گولیاں اس طرح چلتی تھیں جیسے نلکوں سے تیز پانی بہہ رہا ہو۔ ہر وقت موت کا ڈر ہوتا تھا۔

اس بٹالین کو آرام کے لئے پیچھے بھیج دیا گیا۔ نائک سلیمان ٹھیک تھا۔ اُس کی یہ حالت بالکل نہیں تھی۔ چھاؤنی میں ایک مہینہ رہ کر سلیمان کو ایک ماہ کی چھُٹی ملی۔ اُس کی شادی کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ گاؤں جاتے ہی اُس کی شادی ہو گئی۔ وہ اسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اس لئے وہ بہت خوش تھا لیکن پہلی رات ہی اُس کی خوشی ختم ہو گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو دُلہن کے لئے مُردہ پایا۔ وہ ایتھلیٹ تھا اور وہ فوجی بھی تھا اس لئے اُس کا جسم مضبوط اور خوبصورت تھا مگر اپنی دُلہن کے لئے اُس کا جسم بالکل بیکار ثابت ہُوا۔

اُس نے اپنی دوسری حالت یہ بیان کی کہ دُلہن کو دیکھ کر ہی اُس کے دل پر خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ اس لڑکی کو وہ بچپن سے جانتا تھا۔ یہ اُس کے اپنے گاؤں کی لڑکی تھی۔ دُور پار کی رشتہ داری بھی تھی۔ نائک سلیمان نے اپنے دماغ پر اور اپنے جسم پر ایسا اثر محسوس کیا جو کسی دُشمن کے کئے ہوئے

تعویذوں کا ہی ہُوا کرتا ہے۔

سلیمان شادی کے بعد دس گیارہ دن گھر رہا اور اُس کی یہ حالت بگڑتی گئی، ٹھیک نہ ہوئی۔ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر اپنے پیر کے پاس گیا۔ پیر نے اُسے کہا کہ اُس پر واقعی کسی نے کالا جادُو کر دیا ہے۔ پیر نے اُسے اپنے تعویذ دیئے جن سے سلیمان کو کوئی فائدہ نہ ملا، پیر کو کچھ مالی فائدہ ہو گیا تھا۔ چھُٹی ختم کر کے سلیمان اپنی بٹالین میں آگیا۔ اس سے کوئی ایسی اُلٹی حرکتیں ہو گئیں جو اس کے صوبیدار نے کمپنی کمانڈر کو بتا دیں۔ کمپنی کمانڈر نے اس کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے پوچھا کہ اُس نے نائک ہوتے ہوتے یہ غلطیاں کیوں کی ہیں۔ سلیمان رو پڑا اور اُس نے کمپنی کمانڈر کو بتایا کہ اُس کے دماغ اور جسم کا آپس میں تعلق ٹوٹ گیا ہے اور اس سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

کمپنی کمانڈر نے اُسے کوئی سزا نہ دی۔ سلیمان کی حالت یہ ہو گئی کہ ایک صبح پریڈ پر اُس کے ہاتھ سے رائفل گر پڑی۔ اُس سے باز پرس ہوئی تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُسے اب حوالداری کی ترقی ملنے والی تھی۔ فوج کے سٹینڈرڈ کے مطابق وہ حوالداری کے لئے فِٹ نہیں رہ گیا تھا لیکن کمپنی کمانڈر اُس کی طرف داری کرتا تھا۔ سلیمان نے محاذ پر اپنے جو جوہر دکھاتے تھے، ان سے کمپنی کمانڈر بہت متاثر تھا۔ وہ شاید اسی شک میں پڑ گیا تھا کہ نائک سلیمان کو کوئی ذہنی عارضہ لاحق ہو گیا ہے — سلیمان نے اُسے اصل وجہ نہیں بتائی تھی۔

سلیمان نے مجھے وجہ بتا دی۔ میں نے اُس سے نفسیاتی علاج کے مطابق کچھ ایسی باتیں پوچھیں جو اُس کے لئے تو ویسے ہی ہوں گی لیکن میں انہیں بہت اہم سمجھتا تھا۔ میں نے اُس کے اس وہم کی طرف توجہ نہ دی کہ اُس پر کسی نے تعویذ کئے ہوتے ہیں۔ اس وہم کو میں نے الگ نوٹ کر لیا۔ وہم بھی نفسیاتی مرض بن جایا کرتا ہے۔

اس کے مرض کے دو باعث میرے دماغ میں آتے۔ ایک یہ کہ اس

کو جنگ میں زیادہ عرصہ رہنا پڑا۔ اس کا اس کے اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑا۔ چھاؤنی میں آکر بھی یہ اثر قائم رہا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا تھا کہ وہ خوابوں میں زیادہ تر جنگ دیکھتا ہے۔ اُس کے اِرد گرد گولے پھٹتے ہیں۔ ہوائی جہاز بم پھینکتے ہیں اور اس کے ساتھی بُری طرح زخمی ہو کر مرتے ہیں۔

اس سے مجھے یہ ثبوت ملا کہ جنگ کی خوفناکی اس کے ذہن لاشعور میں اُتر گئی ہے اور اس سے اس کے اعصاب کمزور ہوتے ہوتے اس کی جسمانی کمزوری کا باعث بن گئے ہیں۔ اعصاب زیادہ کمزور ہو جائیں تو دل پر ایسا خوف بیٹھ جاتا ہے جو جسم کو بیکار کر دیتا ہے اور دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔

اس مریض کی اس حالت کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی تھی۔ جنگِ عظیم کے محاذوں سے فوجی جب پیچھے آتے تھے تو سب سے پہلے گندی پیشہ ور عورتوں کے پاس جاتے تھے۔ کلکتہ برما کے محاذ کے پیچھے بہت بڑا شہر تھا۔ محاذ کی طرف جانے والی اور واپس آنے والی فوجیں کلکتہ میں قیام کرتی تھیں۔ وہاں پیشہ ور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔ وہ کئی بیماریوں کے جراثیم کی حامل تھیں۔ بعض فوجی ان سے کوئی نہ کوئی بیماری وصول کر لیتے تھے۔ میں نے نائک سلیمان سے پوچھا تو اُس نے انکار کیا اور قسمیں کھائیں کہ وہ ایسا آدمی ہرگز نہیں۔ میں نے اُس کے انکار کے باوجود اُس کا ضروری معائنہ کروایا اور خون اور پیشاب بھی ٹسٹ کرایا۔ میں نے اُسے دوسرے دن آنے کو کہا۔

دوسرے دن اُس کے ٹسٹوں کی رپورٹیں مل گئیں جو بالکل ٹھیک تھیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُس پر کسی تعویذ، کسی کالے یا سفید جادو کا اثر نہیں۔ یہ اثر جنگ کا ہے۔ میں نے ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں سمجھایا کہ وہ سمجھ گیا۔ میں نے نسخہ لکھ کر اُسے ہسپتال سے دوائیاں دلا دیں۔ یہ اعصابی طاقت کی دوائیاں تھیں۔ اُس زمانے میں آج والی دوائیاں نہیں تھیں جو ذہن کو سکون دیتی ہیں۔ نیند کی گولیاں تھیں۔ میں نے ایک ہفتے کے لئے

اُسے یہ گولیاں بھی دیں تاکہ وہ گہرا سوئے۔

چونکہ میں نے لکھ دیا تھا کہ اُسے ایک ہفتے بعد میرے پاس پھر بھیجا جائے اس لئے اُسے پھر میرے پاس بھیجا گیا۔ اُس کی رپورٹ نے مجھے مایوس کیا۔ اُس کی حالت اگر بگڑی نہیں تو ذرا سی بھی بہتر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ٹیلیفون پر اُس کے کمپنی کمانڈر سے پوچھا کہ اپنے کام میں اب یہ کیسا ہے۔ اُس کی رپورٹ مایوس کن تھی۔ میں نے انسانی جذبے کے تحت سوچا کہ یہ انگریز میجر ایک ہندوستانی نائیک پر کب تک مہربان رہے گا۔ ایک نہ ایک دن تنگ آکر سلیمان کو میڈیکل بورڈ میں بھیج کر گھر بھجوا دے گا۔ اس کے علاوہ سلیمان کی ترقی کا بھی سوال تھا۔

میں نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے سلیمان کو ہسپتال میں داخل کر لیا۔ ذہنی مریضوں کے وارڈ میں تھوڑے سے مریض تھے۔ میں ہر ایک کو اطمینان سے توجہ دے سکتا تھا۔ سلیمان کو میں نے اپنے مشاہدے اور علاج میں رکھا۔ پندرہ دنوں بعد وہ بہتر محسوس کرنے لگا۔ میں نے مزید دس بارہ دن اُسے ہسپتال میں رکھا اور جب اُسے ہسپتال سے نکالا تو لکھ دیا کہ اسے ایک ماہ کی چھٹی دی جائے اور جب واپس آئے تو اسے میرے پاس معائنے کے لئے بھیجا جائے۔

وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد میرے پاس آیا۔ اُس کی رپورٹ وہی تھی جو پہلے روز تھی۔ اب بھی وہ اپنی بیوی کے لئے بیکار ثابت ہُوا اور اُس کے دل پر خوف پہلے سے زیادہ تھا۔ اُس نے خودکشی کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ اب اُسے یقین تھا کہ اُس پر کسی نے تعویذ کئے ہوئے ہیں۔ میں اُس کا یہ وہم نہیں مانتا تھا۔ اُس کا یہ وہم اس کے پیر کے علاوہ کسی ایسے آدمی نے بھی پکا کر دیا تھا جو اس قسم کے تعویذ دیا کرتا تھا۔

میں نفسیات کا ڈاکٹر تھا۔ میرا طریقہ نبض دیکھنا اور ٹوٹی لگانا نہیں تھا۔ میں نے تو اُس کے ذہن لاشعور میں سے کچھ نکالنا تھا۔ اب اُس نے دو تین ایسی باتیں کہیں جن سے مجھے شک ہُوا کہ اس پر جنگ کا اثر نہیں۔

معاملہ کچھ اور ہے۔ میں نے اپنے طریقے سے اُس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد اُس نے ایک پردہ اُٹھا دیا۔

"صاحب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں نے اِس چھٹی کے دوران اپنی آزمائش کی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور ازدواجی زندگی کے لئے فِٹ ہوں لیکن میں جب اپنی بیوی کے پاس جاتا ہوں تو میرا جسم برف کی طرح سرد ہو جاتا ہے اور میرے دل پر خوف آ جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ بیوی جب مجھے دیکھتی ہے تو میرا پسینہ نکل آتا ہے اور میں اپنی بیوی سے آنکھ نہیں ملا سکتا" ــــ اُس نے یہ بھی کہا ــــ "میں جب بیوی سے دُور ہوتا ہوں تو مجھے کچھ سکون ملتا ہے۔"

یہاں مجھے کچھ اور شک ہُوا۔ وہ کسی ایسے خوف PHOBIA میں مبتلا تھا جس کا تعلق اُس کی بیوی کے ساتھ تھا۔ مجھے اُس کے دو تین تجربے سُن کر یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے خاوند بننے کے قابل ہے۔ پیچھے کوئی خوف رہ گیا تھا جس کا میں نے سراغ لگانا تھا۔ میں نے اُس پر اتنے سوال کیے کہ جواب دے دے کر اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ میں نے اُسے پانی پلایا۔ میں خاص طور پر بتاتا ہوں کہ میں تھانیداروں کی طرح تفتیش نہیں کر رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ملزم سمجھنے لگتا۔ نفسیات کے ڈاکٹر کا انداز بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ میرے انداز میں دوستی کا رنگ بہت ہی صاف تھا۔ میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ کوئی بات ایسی ہے جو وہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"کیا تم اس جہنم سے نہیں نکلنا چاہتے جو تم نے اپنے لئے بنا رکھا ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ــــ اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگا ــــ "اگر میں اصل بات بتا دوں تو میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ آپ میجر صاحب ہیں۔"

"میں ڈاکٹر ہوں" ــــ میں نے کہا ــــ "یہ تو فوج نے مجھے رینک دے دیا ہے۔ مجھے ڈاکٹر سمجھو، میجر نہ سمجھو۔"

وہ تھوڑی دیر تک ڈرتا رہا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے عذاب سے نکالوں گا، کسی اور عذاب میں نہیں ڈالوں گا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کی مدد کرنے والا مسلمان ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ میں اس کوشش میں ہوں کہ اُسے جلدی ٹھیک کر دوں تاکہ اُسے ترقی ملے جو اُس کی بیماری کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے۔

"میری بیماری کا علاج آپ کے پاس نہیں میجر صاحب!" —اُس نے کہا۔

"مجھے میجر نہ کہو ڈاکٹر کہو"— میں نے کہا —"تم نے دل میں جو کچھ بھی چھپا رکھا ہے وہ مجھے بتا دو۔ میں اپنی کوشش کروں گا۔ شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"میں نے اس لڑکی کو جو میری بیوی ہے، بڑے غلط طریقے سے حاصل کیا ہے"— اُس نے کہا —"یہ غلط طریقہ فوجی قانون کے مطابق جرم ہے ....اس لڑکی کی منگنی ایک سپاہی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ سپاہی میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میری برادری کا تھا اور وہ میری بٹالین کا تھا۔ اگر وہ بٹالین کی کسی اور کمپنی میں ہوتا تو مجھے یہ جرم کرنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ میری کمپنی میں اور میری پلاٹون میں تھا....

"اس لڑکی کی شادی میرے ساتھ ہونی تھی یا اس سپاہی کے ساتھ۔ برادری میں تیسرا لڑکا کوئی نہیں تھا۔ اگر اس سپاہی کو رشتے سے جواب مل جاتا تو رشتہ کوشش کے بغیر بھی مجھے مل جاتا۔ رشتہ اس سپاہی کو مل گیا۔ مجھے یہ لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ جب رشتہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تو مجھے بہت افسوس ہُوا۔ اس کے مقابلے میں برادری کی اور کوئی لڑکی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی....

"جب اس رشتے کا فیصلہ ہُوا، اُس وقت ہماری بٹالین برما فرنٹ پر تھی۔ سپاہی بٹالین میں تھا اور میں چھٹی پر تھا۔ لڑکی اپنے گاؤں اور اپنی برادری کی تھی۔ میرے ساتھ اُس کی دُور کی رشتہ داری بھی تھی۔ میری

چھٹی کا آخری دن تھا۔ وہ مجھے کھیتوں میں اکیلی مل گئی۔ میں نے اُسے منگنی کی مبارک دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے اُس کے رشتے کے لئے اللہ تعالیٰ سے بڑی منّتیں مانی ہوئی تھیں لیکن خدا نے میری کوئی مَنّت قبول نہیں کی۔ اُس نے تھوڑا سا شرما کر کہا —'یہ تو بڑوں کا فیصلہ ہے، میں کیا کر سکتی ہوں۔ میرا کیا ہے۔ میرے لئے تو تم دونوں ایک جیسے ہو'— میں نے اُسے مذاق میں ایک بات کہی تو وہ ہنس پڑی اور اُس نے کہا —'خدا اُسے زندگی دے۔ جب تک وہ زندہ ہے، منگنی تو نہیں ٹوٹ سکتی۔ وہ جب بھی چھٹی آیا، شادی ہو جائے گی'....

"میں دوسرے دن گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے بہت افسوس تھا کہ یہ لڑکی میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی.... میں اپنی بٹالین میں پہنچ گیا۔ ایسے سمجھ لیں کہ میں جہنم میں پہنچ گیا جہاں انسان جل رہے تھے۔ اتنی زبردست اور ایسی ظالم لڑائی تھی کہ زمین اور آسمان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک ایک منٹ کا پتہ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ جاپانی فوج بھاگ رہی ہے، پھر بھی جاپانی بڑی سخت لڑائی لڑ رہے تھے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کتنے مہینے گزر گئے تھے۔ دن اور رات کا فرق ختم ہو گیا تھا....

"ہماری دو ڈیوٹیاں بہت خطرناک تھیں۔ ایک پٹرول ڈیوٹی تھی اور دوسری رِیکی تھی یعنی چھُپ کر آگے جانا اور دُشمن کو دیکھنا۔ پٹرول ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی۔ اس میں بھی دُشمن کے قریب جانا پڑتا تھا.... برما کا علاقہ پہاڑی ہے اور جنگل بھی ہیں۔ ہماری بٹالین جس علاقے میں تھی، وہ بھی پہاڑی علاقہ تھا لیکن جنگل نہیں تھا۔ ہمارے مورچے پہاڑیوں پر تھے۔ جاپانیوں کے مورچے سامنے والی پہاڑی پر تھے۔ رِیکی پٹرول یا فائٹنگ پٹرول کے لئے نیچے جانا پڑتا تھا....

"ایک روز میری سیکشن کو دن کی پٹرول (گشتی) ڈیوٹی دی گئی۔ میرے ساتھ بارہ جوان تھے اور ان میں وہ سپاہی بھی تھا جس کے ساتھ اُس لڑکی کی منگنی ہوئی تھی جو مجھے اچھی لگتی تھی۔ یہ سپاہی پہلے بھی میرے

ساتھ پٹرول ڈیوٹی پر گیا تھا۔ وہ میری سیکشن میں تھا۔ دو سال پہلے کی بات ہے کہ میں نے خود کمپنی صوبیدار کو کہا تھا کہ اس سپاہی کو میری سیکشن میں کر دیں کیونکہ یہ میرے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس کا خیال رکھتا....

"وہ تو چھاؤنی کا معاملہ تھا۔ اب ہم جنگ میں بڑے خطرناک فرنٹ پر تھے۔ وہاں میں اُس کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ ایک روز وہ میرے ساتھ پٹرول ڈیوٹی پر گیا تو مجھے اُس کی منگیتر یاد آ گئی۔ شاید کئی مہینے اُس خوفناک جنگ میں رہ کر میرا دماغ کمزور ہو گیا تھا۔ مجھے وہ لڑکی اتنی یاد آئی کہ میرے دل پر بہت بُرا اثر ہوا۔ مجھے اُس لڑکی کے یہ الفاظ یاد آئے — 'جب تک وہ زندہ ہے منگنی نہیں ٹوٹ سکتی۔ وہ جب چھٹی آیا، شادی ہو جائے گی'....

"میرے دل سے دُعا نکلی کہ یہ سپاہی مر جائے۔ میری بٹالین کے دو سو سے زائد آدمی مارے جا چکے تھے۔ اگر یہ مر جاتا تو کیا ہو جاتا۔ مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ میں ان بارہ جوانوں کو ساتھ لے کر ٹیکری سے اُتر گیا اور نیچے جا کر انہیں پٹرول کی ترتیب میں تقسیم کر دیا۔ ہم نے جدھر جانا تھا اُدھر گئے اور پٹرول پارٹیاں جو کام کرتی ہیں وہ ہم نے کیا۔ میرے دل میں بڑا خطرناک ارادہ آ گیا۔ میں نے اپنے گاؤں کے سپاہی کو ایک سپاہی کے ساتھ آگے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ارادہ یہ کیا کہ چھپ کر پیچھے سے اپنے گاؤں کے سپاہی کو گولی مار دوں۔ ہمارے اُوپر سے دونوں طرفوں کی گولیاں گزر رہی تھیں۔ مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میری سیکشن پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں جگہ جگہ کسی اوٹ میں پوزیشن لینی پڑتی تھی۔ میں نے اس ڈر سے اپنا ارادہ بدل دیا کہ کوئی دیکھ لے گا اور مجھے قتل کی سزا ملے گی....

"ارادہ پھر دل میں آ گیا۔ میں نے ایک اور طریقہ سوچا۔ وہ سپاہی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ آگے تھا۔ میں ایک ٹیکری کے پیچھے جا کر آگے چلا گیا اور اُس سپاہی تک پہنچا۔ میں نے اُن دونوں کو کہا کہ وہ اوٹ میں

رہ کر آگے چلے جائیں اور جہاں ٹیکری ختم ہوتی ہے وہاں سے دائیں کو اُتر جائیں.... میں نے انہیں اس سے بھی آگے چلے جانے کو کہا۔ میں ان کا کمانڈر تھا۔ انہیں ہر کام میرے حکم سے کرنا تھا۔ میں اس علاقے میں پہلے آ چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کس جگہ سے آگے نہیں جانا۔ اس سے آگے جو جگہ تھی، وہ دشمن کی ان پوزیشنوں سے صاف نظر آتی تھیں جو ٹیکریوں پر تھیں۔ اس سے پہلے ہماری ڈی کمپنی کے دو جوان وہاں مارے گئے تھے....

"میں اپنی پسند کی لڑکی کے منگیتر کو اکیلا اُدھر نہیں بھیج سکتا تھا۔ اگر اکیلا بھیجتا تو اس کا جوڑی دار (اُس کے ساتھ کا سپاہی) سب کو بتا دیتا کہ وہ جوان میرے حکم سے آگے گیا تھا۔ ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ میں انہیں جہاں بھیج رہا ہوں وہاں وہ مارے جائیں گے.... وہ دونوں چلے گئے۔ میں ٹیکری کے ساتھ ساتھ پیچھے آ گیا اور اپنے چار سپاہیوں کے پاس پہنچ گیا جو ایک جگہ پوزیشن لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آگے والے دو جوانوں کو دیکھنے گیا تھا لیکن وہ دونوں وہاں نہیں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ آگے نہ چلے گئے ہوں....

"میں وہاں سے ایک اور جگہ چلا گیا جہاں میرے دو سپاہی پوزیشن میں تھے۔ ان کو بھی میں نے ایسے ہی کہا جیسے چار سپاہیوں کو کہا تھا۔ وہاں سے میں پھر آگے گیا تو ہمارے قریب سے ایک مشین گن فائر ہوئی۔ یہ میرے دو سپاہیوں پر فائر ہوتی ہو گی۔ میں نے انہیں بھیجا ہی ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ زندہ آ ہی نہیں سکتے تھے....

"میں پٹرول پارٹی کو شام کے وقت واپس لایا۔ واپس کمپنی ہیڈ کوارٹر میں آ کر میں نے رپورٹ دی کہ دو سپاہی میرے خبردار کرنے کے باوجود خطرناک علاقے میں چلے گئے تھے اور مارے گئے ہیں۔ میں نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ میں نے آگے جا کر دونوں کی لاشیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن آگے جانا خطرناک تھا۔ وہ یقیناً مارے گئے ہیں....

"مجھے اڑھائی تین گھنٹے پہلے واپس آجانا تھا لیکن میں نے کمپنی ہیڈکوارٹر میں یہ رپورٹ دی کہ میں لاشیں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میں نے دراصل وہاں اڑھائی تین گھنٹے اس وجہ سے زیادہ لگا دیئے تھے کہ وہ دونوں سپاہی اگر زندہ ہیں تو واپس آجائیں گے۔ وہ اتنی دیر تک نہ آئے تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مارے گئے ہیں۔"

پھر نائک سلیمان نے بتایا کہ دونوں سپاہیوں کے گھروں کو فوجی ہیڈکوارٹر کی طرف سے سرکاری اطلاع چلی گئی ہوگی کہ وہ جنگ میں مارے گئے ہیں۔ سلیمان نے وہیں سے اپنے گھر خط لکھا کہ فلاں سپاہی جنگ میں مارا گیا ہے۔ پندرہ بیس دنوں بعد اُسے گھر سے جواب ملا کہ سرکاری چٹھی آچکی ہے۔ سلیمان نے اپنے باپ کو خط لکھا کہ اللہ کو ایسے ہی منظور تھا کہ وہ سپاہی مارا گیا ہے۔ اب لڑکی کے ماں باپ سے لڑکی کا رشتہ مانگ لیں۔ ایک مہینے بعد سلیمان کو باپ کا خط ملا کہ لڑکی والوں نے رشتہ دے دیا ہے اور وہ جب بھی چھٹی آئے گا شادی کر دی جائے گی۔

نائک سلیمان نے اپنے رقیب کو ایسے طریقے سے مروایا تھا کہ کسی کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا۔ دو تین مہینے بعد اس کی بٹالین کو جبل پور بھیج دیا گیا۔ جاپانی بُری طرح پسپا ہو گئے تھے۔ پہلے سُنا چکا ہوں کہ نائک سلیمان چھٹی گیا اور اس کی شادی اُسی لڑکی کے ساتھ ہوگئی جسے وہ دل سے چاہتا تھا لیکن اُس نے اب مجھے بتایا کہ دُلہن کو دیکھ کر اُسے ہو کیا گیا تھا۔ پہلے اُس نے یہ راز مجھے نہیں بتایا تھا۔

"میں نے بڑے شوق سے دُلہن کا گھونگھٹ اُٹھایا" — اس نے کہا — "اس نے اپنا چہرہ اُوپر کیا تو مجھے کمرے میں کوئی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ دروازہ کھلا ہُوا تھا اور دروازے میں وہ سپاہی کھڑا تھا۔ وہ مجھے صرف ایک سیکنڈ کے لئے نظر آیا۔ پھر دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور سپاہی وہاں نہیں تھا۔ میرا جسم سرد ہوگیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ وہم تھا لیکن یہ وہم تھا یا جو کچھ تھا، اس نے مجھے مُردہ کر دیا۔ میرے دل

پر خوف چھا گیا....

"میں نے لالٹین بجھا دی لیکن بیوی کا جسم مجھے اتنا سرد لگا جیسے یہ اس کے پہلے منگیتر کی لاش ہو۔ میں اور زیادہ سرد ہوگیا.... پھر ہر رات ایسے ہی ہوتا رہا۔ میری بیوی نے چوتھے پانچویں دن مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ میرے مُنہ سے یہی نکلا کہ کسی دشمن نے تعویذ کر دیئے ہیں۔"

سلیمان نے مجھے ایک ایک منٹ کی روئیداد سناتی۔ اُس نے تین چار مرتبہ اندھیرے کمرے میں اپنی بیوی کے پہلے منگیتر کو دیکھا۔ منگیتر دو تین سیکنڈ بعد غائب ہوگیا۔ اس مرے ہوئے سپاہی کی ماں سلیمان کو بار بار اپنے گھر بلاتی اور پوچھتی تھی — "تم میرے بیٹے کے ساتھ تھے۔ اُس نے زخمی ہو کر پانی مانگا ہوگا۔ تم نے اُسے پانی پلایا تھا نا؟ .... اُس نے آخری وقت کوئی بات کی ہوگی۔ میرا نام لیا ہوگا.... میں تو اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اپنی بیوی کو دیکھ کر تمہیں اپنا دوست یاد نہیں آتا؟ وہ تمہاری بیوی کا منگیتر تھا نا!" — ماں اس طرح کی ایسی جذباتی باتیں کرتی تھی جو سلیمان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اُس پر یہ اثر ہُوا کہ وہ خواب میں جنگ دیکھتا اور اس سپاہی کی لاش دیکھتا۔ وہ اُسے جاگتے ہوئے بھی دیکھتا تھا، اور جب وہ اپنی بیوی کو دیکھتا تھا تو ایسے محسوس کرتا تھا جیسے اس لڑکی کو معلوم ہوگیا ہو کہ اُس کے منگیتر کو سلیمان نے قتل کیا ہے۔

یہ دراصل ضمیر پہ بڑے ہی گھناؤنے گناہ کا بوجھ تھا جس نے اُس کے جسم کی طاقت سلب کر لی تھی۔ اُسے مرا ہُوا سپاہی جس طرح نظر آتا تھا یہ واہمہ تھا جسے HELLUCINATION کہتے ہیں۔ ایک تو ضمیر پر یہ بوجھ تھا، دوسرے وہ اپنی بیوی کے لئے بیکار ثابت ہُوا۔ اس کے نتیجے میں وہ ذہنی طور پر بیکار ہوگیا۔ انسان کا خون ہضم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ سلیمان کی حالت بگڑتی گئی۔

میں نے اُسے لیکچر دیا کہ وہ اپنے آپ کو یقین دلائے کہ وہ سپاہی مر چکا ہے اور واپس نہیں آئے گا۔ جو ہو چکا ہے اس کا کوئی علاج نہیں؛ اب

وہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ میں نے اُسے طریقے بتاتے۔ دوائیاں بھی دیں۔ اُس نے میرے آگے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا اس لئے وہ کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سکون عارضی ہے۔ اس کا علاج ضروری تھا، ورنہ اُس کی حالت کو روز بروز بگڑنا تھا۔ اس کا آخر انجام یہ ہونا تھا کہ سلیمان نے کسی کو قتل کر دینا یا خودکشی کر لینی تھی۔ میں نے ذہنی سکون کی دوائیوں کے علاوہ نفسیاتی طریقوں سے بھی علاج شروع کر دیا۔ اس قسم کے نفسیاتی مرض کے مریض کا علاج تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں نے ایک تو انسانی جذبے کے تحت اور دوسرے تجربے کے طور پر اُس کا علاج شروع کیا تھا۔

اُسے کبھی تین چار دنوں کے لئے ہسپتال میں رکھا اور کبھی اُسے کھلی چھٹی دی کہ بارک میں رہے۔ میری سفارش پر اُسے ہلکی پھلکی ڈیوٹی دی جاتی تھی۔ اُس کا کمپنی کمانڈر اُس میں دلچسپی لیتا تھا۔ اُسے میں نے بتایا کہ سلیمان کی بیماری کا باعث یہ ہے کہ اُس نے بڑی ہولناک جنگ دیکھی ہے اور اُس نے وہاں اپنی طاقت اور برداشت سے بڑھ کر کام کیا ہے جس سے اُس کے اعصاب مجروح ہو گئے ہیں۔ کمپنی کمانڈر اسی لئے سلیمان کو پسند کرتا تھا کہ وہ اپنی طاقت اور برداشت سے بڑھ کر کام کیا کرتا تھا۔

میں نے بیماری کا یہ باعث ایک اور وجہ سے بھی لکھا تھا۔ میں نے انسانی ہمدردی کے تحت سوچا تھا کہ سلیمان اگر ٹھیک نہ ہو سکا تو اسے میڈیکل بورڈ فوج کے لئے "اَن فِٹ" قرار دے دے گا۔ بورڈ جب بیماری کا باعث جنگ لکھے گا تو اسے اچھی پنشن مل جائے گی۔ وہ دراصل قاتل تھا لیکن میں اُسے سزا دینے والا جج نہیں، میں ڈاکٹر تھا۔

ایک روز سلیمان خود ہی میرے پاس آ گیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور بات کرتے اُس کی زبان اُس کے کنٹرول میں نہیں آتی تھی۔ اُس روز اُس نے میرے پاس نہیں آنا تھا۔ کوئی خاص وجہ ہو گی۔ اس نے جب وجہ بتائی تو میں بھی حیران ہو گیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" — اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا — "میری بیوی کا منگیتر سپاہی جو میں کہتا تھا کہ مارا گیا تھا، واپس آ گیا ہے۔ مجھے گھر سے خط ملا ہے۔ وہ رجمنٹل سنٹر میں ہے۔ سنٹر سے اُس کے گھر والوں کو سرکاری اطلاع گئی ہے کہ اُن کا بیٹا بڑی بہادری سے جاپانیوں کی قید سے فرار ہو کر آ گیا ہے ..... میں بہت گھبرا رہا ہوں۔ رات کو میں سویا بھی نہیں۔ وہ بتا چکا ہو گا کہ میں نے اُسے آگے بھیجا تھا۔ میں نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ وہ غلطی سے آگے چلا گیا تھا۔"

میں نے اُسے کچھ باتیں بتائیں، ذہنی سکون کی گولیاں دیں اور اُسے کہا کہ کوئی اور بات یا واقعہ ہو جاتے تو مجھے بتانے آ جایا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ سپاہی بیان دے چکا تھا کہ نائیک سلیمان نے اُسے فلاں مقام تک جانے کو کہا تھا اور اس غلط حکم کی پاداش میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی ہونی تھی تو میں اسے نہیں روک سکتا تھا۔ البتہ یہ کیس اب میرے لئے ایک ڈرامے کی طرح دلچسپ ہو گیا تھا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوا ہے۔

آگے یہ ہوا کہ سات آٹھ دنوں بعد وہ سپاہی رجمنٹل سنٹر سے بٹالین میں آ گیا۔ نائیک سلیمان نے میرے پاس آ کر پورا واقعہ سنایا۔ وہ اب ذرا سکون میں تھا۔ اُس نے مجھے اس طرح سنایا کہ یہ سپاہی بٹالین میں آیا تو نائیک سلیمان سے گلے لگ کر ملا اور اُس نے سلیمان کو کوئی شکایت نہ کی کہ سلیمان نے اُسے اتنی خطرناک جگہ بھیج دیا تھا۔ اُس نے سلیمان کو بتایا کہ اُس نے سنٹر میں یہ بیان دیا تھا کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اپنی پٹرول پارٹی سے آگے نکل گیا تھا۔ یہ سُن کر سلیمان کو سکون آ گیا۔ بٹالین میں آ کر اپنے کمپنی کمانڈر اور بٹالین کمانڈر کو بھی اُس نے یہی بیان دیا تھا۔

اس سپاہی پر جو گزری، وہ یوں تھی کہ وہ نائیک سلیمان کے حکم سے اپنے ساتھی کے ساتھ خطرے کے مقام پر چلا گیا۔ قریب سے ہی مشین گن فائر ہوئی۔ دونوں بچ گئے اور رینگ کر اوٹ میں ہو گئے۔ مشین گن پھر فائر

ہوتی۔ وہ دونوں رینگتے ہوئے نکلے۔ مشین گن ایک بار پھر فائر ہوتی۔ اس سپاہی کا ساتھی مارا گیا اور اُس نے اُٹھ کر ہاتھ کھڑے کر دیئے جاپانی بہت قریب تھے۔ وہ اُسے پکڑ کر لے گئے۔ اُسے پیچھے بھیجا تھا لیکن جاپانیوں کی پوزیشن اب بہت کمزور ہو چکی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

اس سپاہی کو جاپانیوں نے اپنے ساتھ رکھا۔ اسے انہوں نے کوئی تکلیف نہ دی، بلکہ اسے اچھی طرح رکھا۔ سبھاش چندر بوس نے انڈین آرمی کے جنگی قیدیوں کی جو انڈین نیشنل آرمی بنائی اور اسے جاپان کی فوج کے ماتحت کر دیا تھا، اس کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس سپاہی کو انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) میں شامل کرنے کی وجہ سے جاپانیوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔

وہ نو دس دن جاپانیوں کی اسی بٹالین کے ساتھ رہا۔ یہ بٹالین یہ پوزیشن چھوڑ کر پیچھے چلی گئی۔ اِدھر سے انگریزوں کے حملے بہت سخت ہو گئے۔ جاپانی فوج افراتفری میں پسپا ہو رہی تھی۔ اس بھگدڑ میں سپاہی کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میں چونکہ اس سپاہی سے نہیں ملا تھا اس لئے میں اُس کے فرار کی ساری روئیداد نہیں سنا سکتا۔ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ برما کے پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل آنا بہت ہی مشکل کام تھا۔

یہ سپاہی وادیوں اور جنگلوں میں بیس بائیس روز بھٹکتا رہا اور کہیں سے کہیں جا نکلا۔ اب جاپانیوں کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اُسے کسی پہاڑی کی چوٹی سے فوجیوں نے دیکھ لیا۔ وہ غالباً سگنل والوں کی پوسٹ تھی۔ اُسے اُوپر لے گئے۔ بہت دنوں بعد اُسے پیچھے بھیجا گیا۔ اُس کی جسمانی حالت بہت بُری تھی۔ دو مہینوں بعد اُسے کلکتہ پہنچایا گیا۔ کئی روز وہ ہسپتال میں رہا۔ وہاں سے اُسے اُس کے رجمنٹل سنٹر میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اُسے پھر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ایک مہینہ بعد ہسپتال سے اُسے اس سفارش کے ساتھ فارغ کیا گیا کہ اسے کم از کم ایک مہینے کی چھٹی پر بھیجا جائے۔ اب وہ اپنی

بٹالین میں آ گیا تھا اور بٹالین کمانڈر نے اُسے ایک کی بجائے ڈیڑھ مہینے کی چھٹی دے دی تھی۔

نانک سلیمان میرا مستقل مریض بھی تھا اور میرا دوست بھی بن گیا تھا۔ اُسے دوست بنانا علاج کا حصہ تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ سپاہی چھٹی چلا گیا ہے۔ سلیمان کی ذہنی حالت ذرا اور بگڑ گئی تھی۔ اُس کا چہرہ بھی کمزور ہو گیا اور اُس کی حالت کبھی کبھی نیم پاگلوں جیسی ہو جاتی تھی۔

پندرہ سولہ دنوں بعد وہ میرے پاس آیا تو اُس کی حالت اور ہی زیادہ خراب تھی۔ وہ بات کرتے کرتے چُپ ہو گیا اور ویسے ہی کہیں نظریں جما دیں۔ میں نے اُسے بیدار کیا۔ اُس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا۔ مَیں نے لفافے سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ اُس کے باپ کا خط تھا۔ لکھا تھا کہ تم چھٹی لے کر آؤ اور اپنے گھر کو دیکھو۔ تمہاری بیوی نے ہمارے خاندان کی ناک کاٹ دی ہے۔ وہ اپنے پہلے منگیتر (سپاہی) سے ملتی ہے اور دو عورتوں نے انہیں کھیتوں سے آگے ایک گہری جگہ بڑی بے شرمی کی حالت میں دیکھا ہے۔ گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ سلیمان کی بیوی اپنے پہلے منگیتر کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔

خط میں سلیمان کو بھڑکایا گیا تھا کہ وہ آئے اور اس سپاہی کا بندوبست کرے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا بندوبست کرے گا؟ اُس نے کہا کہ اُن کے علاقے میں اس جُرم کی سزا قتل ہے۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے، ورنہ اُس کی ذہنی حالت بگڑتی جائے گی اور وہ کسی روز پاگل ہو جائے گا، لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کا ارادہ خطرناک لگتا تھا۔

وہ چلا گیا اور کوئی ڈیڑھ ہفتہ بعد میرے پاس آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ اب صحیح طریقے سے بولتا تھا اور وہ بالکل نارمل لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر کچھ رونق بھی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا کہ پکّا بندوبست کر آیا ہوں۔

"دونوں کو قتل کیا ہے یا ایک کو؟" — میں نے پوچھا۔

"کسی کو بھی نہیں" — اُس نے کہا — "میں قتل کا ہی ارادہ لے گیا

تھا۔ میں بیمار تھا، چاہے کمزور تھا، عورت کی کیا مجال کہ اپنے دل کی مرضی کرتی پھرے اور یارانے لگاتے!.... میں نے کمپنی صوبیدار اور کمپنی کمانڈر کی منت کر کے دس دنوں کی چھٹی لی تھی۔ میں واپس آنے کے لئے نہیں گیا تھا۔ میں نے قتل کرنا اور گرفتار ہونا تھا۔ میں شام کے بعد اپنے گاؤں پہنچا۔ رات کو بیوی کو الگ کر کے پوچھا کہ اس بات میں کتنی سچائی ہے کہ تم نے اپنے پہلے منگیتر کے ساتھ تعلق جوڑ لیا ہے .... ڈاکٹر صاحب! میں خونخوار اور وحشی بن کر گیا تھا لیکن جب بیوی تنہائی میں میرے سامنے آئی تو میری خونخواری ختم ہو گئی اور دل پر خوف آ گیا۔ میں نے بہت ہمت کر کے اُسے یہ الفاظ کہے تھے جو آپ کو بتاتے ہیں ....

"مجھے یہ امید تھی کہ وہ کہے گی کہ یہ سب جھوٹ ہے، لیکن اُس نے پہلے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ اُس کے ہونٹوں پر کچھ اور ہی طرح کی مسکراہٹ تھی۔ میری نظریں نیچی ہو گئیں۔ اُس نے کہا —— 'طلاق دے دو چاہے میرا گلا دبا دو، جھوٹ نہیں بولوں گی۔ تم جسمانی طور پر صحیح نہیں ہو۔ میں نے یہ برداشت کر لیا تھا۔ تمہارے دماغ پر کوئی اثر ہے۔ میں نے یہ بھی قبول کر لیا تھا لیکن تم بزدل ہو۔ تم میں مردوں والی جرأت بھی نہیں۔ مزہ تو جب تھا کہ تم اُسے (پہلے منگیتر کو) جوانمردوں کی طرح قتل کرتے اور پھر میرے ساتھ شادی کرتے۔ تم نے اُسے اس طرح مروانے کی کوشش کی کہ اُسے جاپانیوں کے سامنے دھوکے سے بھیج دیا اور خود وہاں سے بھاگ آئے اور اپنے افسروں کو کہا کہ وہ غلطی سے آگے چلا گیا تھا اور مارا گیا ہے'....

"ڈاکٹر صاحب! میں تو زندہ لاش بن گیا۔ میری زبان بند ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میری بیوی کو اسی سپاہی نے یہ بات بتائی ہے۔ وہ ابھی گاؤں میں چھٹی گزار رہا ہے۔ میری بیوی نے کہا —— 'تم سے تو وہ اچھا نکلا جس نے واپس آ کر افسروں کو بتایا کہ وہ غلطی سے آگے چلا گیا تھا اور پکڑا گیا۔ اُس نے مجھے ساری بات سنائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلیمان میرا دوست ہے۔ میں نے اس کو کورٹ مارشل سے بچا لیا ہے .... اُسے پتہ چل گیا کہ تم نے کیا رپورٹ دی

تھی۔ تم اُسے مروانا چاہتے تھے۔ اللہ نے اُسے بچا لیا .... کیا تم اپنے اللہ کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ .... لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ میں نے اُس کے ساتھ تعلق جوڑ لیا ہے۔ وہ میرے دل کو اچھا لگتا ہے۔ تم نے صرف اُسے ہی نہیں، اُس کی ماں کو، اُس کے باپ اور اُس کی بہنوں کو چھ مہینے رُلایا ہے۔ اُس کی ماں اور بہنیں رو رو کر اندھی ہو گئی ہیں'....

"وہ اس وجہ سے دلیری سے بول رہی تھی کہ میں اُسے قتل تو کر ہی دوں گا، پھر کیوں نہ وہ دل کا غبار نکال لے۔ میں نے یہ کیا کہ اُسے طلاق دے دی اور رات کو ہی اُسے اُس کے گھر چھوڑ آیا۔ میرے باپ اور میرے چچوں نے مجھے بہت گالیاں دیں کہ غیرت والے مرد بے عزتی کا بدلہ لیا کرتے ہیں، طلاق نہیں دیا کرتے۔ میں نے اُن کی گالیاں برداشت کر لیں۔ دوسرے دن میں سپاہی کو گاؤں سے باہر ملا اور اُسے گلے لگا کر بہت رو دیا۔ میں نے اُس سے معافی مانگی اور اُسے کہا کہ میں نے اُس کی امانت واپس کر دی ہے .... اُس نے لڑکی کے ماں باپ کے ساتھ بات کر لی ہے۔ عدّت کے دن پورے ہو جائیں گے تو اُن کی شادی ہو جائے گی۔ اب میرے دل پر کوئی خوف نہیں اور جسم میں طاقت بھی آ گئی ہے۔"

رانگ نمبر

کہتے ہیں فلمیں اور ٹی وی بچوں اور نوجوانوں پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ میں نے ماہرینِ نفسیات کے مضامین مختلف رسالوں اور اخباروں میں پڑھے ہیں۔ آپ "حکایت" میں بھی اس مسئلے پر لکھتے رہتے ہیں۔ میری ایک ہی لڑکی ہے جس کی عمر سولہ سال سے اُوپر ہو گئی ہے۔ یہی میری کُل اولاد ہے۔ گھر میں پہلے ٹی وی تھا، اب وی سی آر بھی ہے۔ میرا اپنا کوئی گھر نہیں۔ ماں باپ کا مکان ہے اور اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہوں۔ اُس کے بچے ویڈیو فلمیں لا کر دیکھتے ہیں تو میری بچی بھی دیکھتی ہے۔ میں اسے کیسے روکوں!

میں جب جوان تھی بلکہ لڑکی تھی تو سینما میں فلمیں دیکھا کرتی تھی۔ قدرتی بات ہے کہ بچے فلمیں دیکھ کر ان کی نقل کرتے ہیں۔ میں بھی فلموں کا اثر قبول کیا کرتی تھی۔ کوئی غم اور کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ تین کنال میں کوٹھی تھی۔ آج پینتالیس سال عمر میں بھی اسی کوٹھی میں رہ رہی ہوں۔ گھر میں ٹیلیفون تھا۔

میں نے ٹیلیفون کا ذکر رُعب ڈالنے کے لئے نہیں کیا۔ اس کے ذکر کی ایک وجہ ہے بلکہ میری زندگی کی کہانی کا تعلق ٹیلیفون کے ساتھ ہی ہے۔ میری طبیعت میں شوخی اور شرارت زیادہ ہُوا کرتی تھی۔ میں تین بھائیوں میں ایک ہی بہن تھی۔ دو بھائی مجھ سے بڑے اور ایک چھوٹا ہے۔ سب کا پیار حاصل تھا۔ ابّا جان تو بہت ہی پیار کرتے تھے۔ پڑھنے میں دلچسپی اتنی ہی تھی کہ پاس ہو جایا کرتی تھی۔

بی۔ اے کا آخری امتحان ہو گیا تو کالج جانا ختم ہو گیا۔ میں نے محسوس

کیا کہ میں قید ہو گئی ہوں۔ کالج میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے ساتھ کھیل کود اور گپ شپ ہو جاتی تھی۔ اس کے بغیر تو میری زندگی پھیکی رہتی تھی۔ یہ میں چھٹیوں میں بہت محسوس کرتی تھی۔ آخری امتحان بھی ہو گئے تو گھر میں گھٹن لگنے لگی۔ امی اور ابا جان اور بھائی بھی کہنے لگے کہ ایم۔ اے کر لو لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ صاف بات ہے اتنی محنت نہیں ہوتی تھی۔

انہی دنوں ایک انگریزی فلم PILLW TALK دیکھی تھی۔ اس کی کہانی ٹیلیفون پر گھڑی گئی تھی۔ فلم کی ہیروئن ویسے ہی نمبر ملا کر لوگوں کو پریشان کرتی ہے۔ میں امتحان سے فارغ ہوئی تو ایک روز گھر میں بہت ہی بوریت محسوس ہوئی۔ امی اور ابا جان کچھ دنوں کے لئے سوات چلے گئے تھے۔ بڑے دونوں بھائی بھی گھر میں نہیں تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔ کوئی آدمی بول رہا تھا۔ کہنے لگا ــــ "حاجی صاحب کو دو" ــــ اسے رانگ نمبر مل گیا تھا۔

"نہ جی!" ــــ میں نے کہا ــــ "حاجی صاحب یہاں تو نہیں ہیں۔"

"کہاں گئے؟" ــــ اس نے پوچھا ــــ "کہتے تھے دس بجے دکان پر آجاؤں گا۔"

"کیا حاجی صاحب کی دکان پر کوئی لڑکی ٹیلیفون ریسیو کیا کرتی ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"اوہ!" ــــ اس نے ہنس کر کہا ــــ "یہ شاید رانگ نمبر ہے.... آپ کا نمبر کیا ہے؟"

میری فطرت میں شرارت کا جو جن تھا وہ جاگ اٹھا۔

"میں آپ کو اپنا رول نمبر بتا سکتی ہوں" ــــ میں نے کہا۔

"میں ٹیلیفون نمبر پوچھ رہا ہوں" ــــ اس نے کہا۔

"آپ کو رانگ نمبر ملا ہے تو آپ فون بند کیوں نہیں کر دیتے؟" ــــ میں نے شگفتہ لہجے میں کہا ــــ "آپ بھی حاجی معلوم ہوتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا اور اس کی ہنسی احمقوں جیسی تھی۔

"آپ کی آواز بڑی اچھی لگ رہی ہے" ــــ اس نے کہا۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "عمر کتنی ہے آپ کی؟"

"ستائیس اٹھائیس سال ہو گی" ــــ اس نے کہا۔

"ستائیس اور اٹھائیس کو جمع کروں؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "یا ستائیس یا اٹھائیس کو دو سے ضرب دوں؟"

اب اس نے ایسا قہقہہ لگایا جس سے ذرا سا بھی شک نہ رہا کہ یہ احمق ہی نہیں بلکہ احمقوں کا سرغنہ ہے۔ اس کی آواز سے مجھے اس کی عمر کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔

"آپ کے اگلے ایک یا دو دانت نہیں ہیں شاید!" ــــ میں نے کہا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" ــــ اس نے پوچھا۔

"آپ بات کرتے ہیں تو آپ کے منہ سے ہوا نکلتی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے آپ کی بہت ساری پھونک نکل چکی ہے۔"

"میں اتنا بوڑھا تو نہیں" ــــ اس نے کہا ــــ "ابھی تو میں جوان ہوں!"

"ایک بات بتائیں" ــــ میں نے کہا ــــ "بوڑھے اتنے ٹھرکی کیوں ہوتے ہیں؟"

وہ پہلے کی طرح ہنسا اور ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی پھر ایک اور بچے کی آوازیں آنے لگیں۔ شور سا مچ گیا اور یہ شخص غصے میں بولا ــــ "اوئے کیا ہو گیا ہے تمہیں خبیثو.... اوئے تو کہاں مر گئی ہے؟ اتنی ضروری بات کر رہا ہوں ٹیلیفون پر" ــــ پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ ٹیلیفون بند ہو گیا۔

مجھے وہ انگریزی فلم یاد آ گئی۔ میں آج کہتی ہوں کہ میری بیٹی فلمیں نہ دیکھا کرے لیکن نوجوانی میں میری اپنی حالت یہ تھی کہ میں ایک انگریزی فلم کی نقل کر رہی تھی۔ میں نے اتنی زیادہ فلمیں کبھی نہیں دیکھی تھیں جتنی آج کی نسل دیکھتی ہے۔ کوئی اچھی سی انگریزی فلم آتی تھی تو وہ میں

اپنی سہیلیوں کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔ اوسطاً دو فلمیں ایک مہینے میں۔ میری امی کو یہ بھی پسند نہیں تھا۔ مجھے روکتی ٹوکتی رہتی تھیں اور میری سہیلیوں کی ضد پر اجازت بھی دے دیا کرتی تھیں۔

اس ایک آدمی کے ساتھ رانگ نمبر کے ذریعے بات ہوتی تو میں نے اسے ایک دلچسپ شغل بنا لیا۔ میں نے آپ کو وہ سارے مکالمے نہیں سنائے جو اس آدمی کے ساتھ فون پر ہوتے تھے۔ میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکی کہ اُس کے بولنے کا طریقہ کیا تھا۔ وہ ڈرتا بھی تھا اور بیوقوفوں کی طرح بولتا تھا۔ میری جس بات کا اُس کے پاس جواب نہیں ہوتا تھا اس پر وہ ہنس پڑتا تھا۔ وہ FLIRT کر رہا تھا جسے سیدھی سادی زبان میں ٹھرک جھاڑنا کہتے ہیں۔ آواز سے اُس کی عمر پچاس سال سے بھی زیادہ لگتی تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد گھر کے آدمی دو تین گھنٹوں کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔ میں نے ٹیلیفون اپنے کمرے میں رکھنا شروع کر دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ کسی سہیلی کا فون آجاتا ہے تو سب گھر والے بے آرام ہوتے ہیں۔ گھر والے میرے اس بہانے کو سچ سمجھ گئے۔ ٹیلیفون کا سب سے زیادہ استعمال میں ہی کیا کرتی تھی۔ کبھی ایک سہیلی کو کبھی دوسری کو۔ کلاس فیلو لڑکیوں کے فون آتے بھی رہتے تھے۔

ایک روز دوپہر کے وقت گھر والے اپنے اپنے کمروں میں سو گئے تو میں نے ویسے ہی ایک نمبر ملایا۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کا نمبر ہے۔ آگے سے ایک لڑکی بولی۔ آواز سے جوان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کوئی اور نمبر بول کر پوچھا کہ یہ وہی نمبر ہے؟ آگے سے یہی جواب ملنا تھا کہ رانگ نمبر ہے۔ میں نے "ساری" کہہ کر لڑکی سے نام پوچھا۔ وہ بھی لڑکی تھی اس لئے اُس نے بے تکلفی سے بات کرنے میں ہرج نہ سمجھا۔ اُس نے اپنا نام بتا کر مجھ سے نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بھی صحیح بتا دیا اور اپنا ٹیلیفون نمبر بھی دے دیا۔

"کیا آپ پڑھتی ہیں؟" ــــ میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں پڑھتی ہوں!" ــــ اُس نے کچھ اور ہی انداز میں جواب دیا ــــ "میری ساس اور میرے خاوند نے میرے لئے کالج کھولا ہے اور میرے ماں باپ نے مجھے اس میں داخل کرا دیا ہے۔"

اُس نے اپنے خاوند اور اُس کے ماں باپ کو اور اپنے ماں باپ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ایسے ایسے الفاظ اور جملے بولے کہ مزہ آگیا۔ اُس نے یہ کوسنے سب میں برابر برابر تقسیم کئے۔ ایسا نہیں کیا کہ اپنے والدین کو تھوڑا اور سسرال کو زیادہ کہا ہو۔ اُس کے الفاظ اور جملوں اور اُس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہُوا کہ کسی پُرانے محلے کی رہنے والی ہے یا شہر کے قریب کے کسی گاؤں سے آئی ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسی باتیں کیں جو اس کے دل کو اچھی لگیں۔

"تم اب اپنے گھر میں ہو یا سسرال میں؟"

"اپنے گھر میں ٹیلیفون کہاں ہے!" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "سسرال میں ہوں۔ میری ماں 'اَوتری' کو ٹیلیفون ہی تو اچھا لگا تھا .... نہ پُتر! اُن کے گھر ٹیلیفون لگا ہُوا ہے .... رخصتی سے پہلے میری ماں میرے سسرال کی تعریفیں شروع کرتی تھی تو بسم اللہ پڑھنے کی بجائے سب سے پہلے یہ کہتی تھی کہ اُن کے گھر ٹیلیفون لگا ہُوا ہے .... میں نے تو کبھی اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور مجھے کہیں ٹیلیفون کرنے کی اجازت بھی نہیں۔ کسی کا فون آتا ہے تو ساس سُنتی ہے۔ آج میں گھر میں اکیلی ہوں تو فون اُٹھا لیا ہے اور اتنی باتیں بھی کر رہی ہوں۔"

وہ تو باتوں سے لبریز تھی۔ اُس کے دل میں اتنی زیادہ باتوں کی جگہ نہیں رہی تھی۔ میں نے ذرا سی ہمدردی اور دلچسپی ظاہر کی تو اُس کے دل سے شکوے، شکایتیں اور دُکھ چھلک چھلک کر نکلنے لگے۔

"تم نے شادی کر لی ہے؟" ــــ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"ابھی تک تو بچی ہوتی ہوں" ــــ میں نے جواب دیا۔

"ایک خیال رکھنا" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں یہ تو نہیں جانتی کہ

تم امیر لوگ ہو یا کیسے ہو، یہ سمجھ کر غلطی نہ کرنا کہ جس گھر میں روپیہ پیسہ ہے وہاں خوشی رہتی ہے۔ ایسے لوگوں سے بچنا جنہیں راستے میں اگر روپیہ پیسہ مل گیا ہو۔ میرے سسرال ایسے ہی ہیں۔ پرانا مکان جو ایک پرانے محلے میں تھا انہوں نے بیچ کر ایک کالونی میں پلاٹ خریدا اور ہاؤسنگ سوسائٹی سے قرضہ لے کر مکان بنا لیا ہے۔ اسے یہ لوگ کوٹھی کہتے ہیں۔ میرا خاوند ایسے محکمے میں ہے جہاں تھوڑی سی رشوت بھی آجاتی ہے۔ زیادہ نہیں تھوڑی سی۔ کبھی آؤ اور ہماری کوٹھی دیکھو۔ آٹھ مرلوں میں کوٹھی بنی ہے۔ میں حیران ہوں کہ انہوں نے ٹیلیفون کیوں لگوا لیا تھا۔ شاید شو بنانے کے لئے لگوایا تھا۔"

"تمہیں کیا تکلیف ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"پہلی تکلیف تو یہ ہوتی کہ میں نے بی۔ اے کیا تو میری شادی کر دی گئی" — اُس نے کہا — "میں بی۔ ایڈ یا ایم۔ اے کرنا چاہتی تھی۔ یہ بھی سوچا تھا کہ آگے نہ پڑھوں۔ نوکری کر لوں یا گھر میں ٹیوشن پڑھایا کروں میرے جہیز کا مسئلہ تھا نا۔ میرے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تو اُس کی بیوی اور بیوی کی ماں نے اُس پر ایسے تعویذ کئے یا کوئی جادو چلایا کہ میری بھابی نے ہمارے گھر آتے ہی لڑائیاں جھگڑے شروع کرا دیے۔ خدا نے اُس کی کھوپڑی میں ایسا حرام مغز ڈال دیا تھا کہ سیدھی سادی بات میں ہیرا پھیری کر کے اس کو ایسی شکل دے دیتی تھی کہ ہم میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ یہ غلط فہمیاں لڑائی جھگڑے کی وجہ بنتی گئیں۔ میرا بھائی اپنی بیوی کو سچا سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھائی ہمارے ساتھ لڑائی کر کے ہم سے الگ ہو گیا۔"

"گھر آیا ہو گا!"

"توبہ کرو جی!" — اُس نے کہا — "وہ تو ہمارے ساتھ مرنا جینا ختم کر گیا ہے۔ وہی ہمارا سہارا تھا۔ میرے ابو ریٹائر ہو گئے ہیں۔ تین پرائیویٹ کمپنیوں میں پارٹ ٹائم کام کرتے ہیں تو گھر کا گزارہ چلتا ہے۔ میں کہتی تھی کہ بی اے کر لیا ہے تو ہاتھ پاؤں ہلا کر اپنے جہیز کا بوجھ اپنے باپ کے

کندھوں سے اُٹھا لوں لیکن یہ لوگ رشتہ لینے آ گئے۔ خدا نے مجھے شکل ذرا اچھی دے دی ہے اور رنگ بھی صاف ہے۔ وہ رشتہ کرانے والی ایک مائی کے ذریعے آئے تھے....

"میری ماں اُن کے گھر چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ زمین پر پاؤں نہیں رکھتی تھی۔ اُن کی زبان پر دو ہی لفظ چڑھے ہوتے تھے — 'کوٹھی ہے۔ ٹیلیفون لگا ہوا ہے' — پھر وہ اس بات پر خوش تھی کہ وہ کہتے ہیں جہیز نہیں چاہیئے۔ میرے ابو نے قرضہ اُٹھایا۔ کچھ زیور میری ماں کا تھا، کچھ اور بنوایا۔ تھوڑے سے کپڑے اور تھوڑی سی چیزیں دو ٹرنکوں میں ڈال کر مجھے رخصت کر دیا۔ آج ایک سال سے اُوپر عرصہ ہو گیا ہے، مجھے یہ طعنے مل رہے ہیں کہ اپنے ساتھ تُو لائی کیا تھی؟ میں گھر میں اونچی بات کہہ بیٹھوں تو ساس کہتی ہے، تو کس شیخی پر بات کرتی ہے؟ تیرے ماں باپ کو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ہم نے تجھے تین کپڑوں میں قبول کر لیا تھا۔"

"تمہارا خاوند تو تمہارا خیال رکھتا ہو گا!"

"وہ میرا خیال رکھے تو اُس کی ماں اُسے گھر سے نکال دے" — اُس نے کہا — "ماں کا احترام تو ہوتا ہے اور نیک اولاد ماں کا حکم مانتی ہے لیکن یہ ماں تو گھر میں مارشل لاء لگا کے رکھتی ہے۔ بیٹا اس کی مرضی کے خلاف بات کر بیٹھے تو اُسے سب سے پہلی بات یہ کہتی ہے کہ تُو تو ہے ہی حرام کا۔ اس کے بعد اتنی بکواس کرتی ہے جو مرد ہی کر سکتے ہیں۔"

اُن دنوں صدر ایوب خان کا مارشل لاء لگا ہوا تھا جس نے عوام پر دہشت طاری کی ہوئی تھی۔ اس لئے مارشل لاء ایک اصطلاح بن گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ حکم مانو اور زبان بند رکھو۔ اس لڑکی نے بھی اپنی ساس کے لئے مارشل لاء کا لفظ استعمال کیا۔ اپنے خاوند سے تو وہ بہت ہی تنگ تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ مرد کو ایسا بزدل نہیں ہونا چاہیئے۔

"تم مردوں کی بات کر رہی ہو" — اُس نے کہا — "میں اپنے خاوند کی بات کر رہی ہوں۔ وہ نام کا مرد ہے۔ جرأت مردوں میں ہوتی ہے۔

اس بے چارے کے پاس جذبات تو ہیں ہی نہیں۔ اس کا وطیرہ یہ ہے کہ میرے پاس ہوتا ہے تو ماں کے خلاف بولتا ہے اور جب اُس کی ماں میرے خلاف بولتی ہے تو اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم کسی اور سے محبت کرتی ہو" ـــــ میں نے کہا۔

"محبت کہہ لو" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "یا کچھ اور کہہ لو۔ ایک لڑکا دل کو اچھا لگتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ میں اُسے اچھی لگتی ہوں لیکن اُس کے والدین کو ہم جہیز کہاں سے دیتے؛ وہ اپنے لڑکے کی بہت زیادہ قیمت مانگتے تھے" ـــــ وہ چُپ ہو گئی پھر بولنے لگی ـــــ "میں نے کتنی بیوقوفی کی ہے۔ تمہارے ساتھ نہ جان نہ پہچان اور میں نے اتنی بکواس کر ڈالی۔ میری مجبوری دیکھو۔ کوئی سننے والا نہیں اس لئے تمہارے ساتھ ہی بک بک شروع کر دی۔"

"اچھا کیا ہے نا!" ـــــ میں نے کہا۔

میں کچھ اور کہنے لگی تھی کہ وہ گھبرا کر بولی ـــــ "اچھا، خدا حافظ۔ ڈائن آگئی ہے۔ اُس نے دیکھ لیا تو کہے گی کہ فون میں نے کیا تھا۔"

فون بند ہو گیا۔ ہم نے پنتالیس منٹ سے زیادہ باتیں کی تھیں۔ میں یہ نہیں بتا رہی کہ اس لڑکی کی باتوں نے مجھ پر کیا اثر چھوڑا۔ وہ عمر غیر ذمہ داری والی تھی۔ طبیعت لااُبالی تھی۔ میں نے دل پر اس لڑکی کے دُکھوں کا بوجھ نہ پڑنے دیا۔ باتیں سُن کر تنہائی کی بوریت دُور کر لی۔

تین چار دن گزر گئے تو اس طرح نمبر ملایا ـــــ "پانچ، چار، تین، دو، ایک" ـــــ ریسیور کسی نے اُٹھایا اور ہیلو کی آواز آئی۔ میں نے کوئی اور نمبر بولا تو اُس نے کہا ـــــ "رانگ نمبر" ـــــ کوئی آدمی تھا۔

"آپ کا نمبر کیا ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"میرے نمبر کو کیا کریں گی آپ؟" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "آپ کو جو نمبر چاہیئے یہ وہ نہیں ہے۔"

"اپنا نمبر بتا دیں گے تو کیا ہو جائے گا؟" ـــــ میں نے کہا۔

"نہیں بتاؤں گا تو آپ کا کیا نقصان ہو گا؟" ـــــ اُس نے کہا۔

"میں آپ کی اتنی پیاری آواز سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں گی" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اتنی سُریلی آواز ہے آپ کی۔"

"میری آواز سُریلی ہے؟" ـــــ اُس نے پوچھا ـــــ "معلوم ہوتا ہے تمہارے گھر نیا نیا فون لگا ہے۔ اگر میری آواز سُریلی ہے تو تم کوّے کو کوئل کہتی ہو گی۔"

"آپ نے شاید اپنی آواز کبھی نہیں سُنی" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کبھی آئینے کے سامنے بیٹھ کر بولنا اور اپنی آواز دیکھنا۔"

"محترمہ!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "آواز سُنی جاتی ہے دیکھی نہیں جاتی... اچھا، اب سچ بتاؤ، تم نے جان بوجھ کر یہ نمبر ملایا ہے یا ویسے ہی چھیڑ خانی کر رہی ہو؟"

"آپ پریشان ہو رہے ہیں؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "ایسا تو نہ کہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ مرد لوگ کسی جوان عورت کی آواز سُنتے ہیں تو اُن کی ساری پریشانیاں دُور ہو جاتی ہیں۔"

"کبھی میرے گھر آکر جوان عورت کی آواز سُننا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "بولتی ہے تو پچھلی پریشانیاں دُور ہو جاتی ہیں اور نئی لگ جاتی ہیں۔"

"اچھا اچھا!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ کی بیوی بھی ہے۔"

"اور چار بچے بھی!" ـــــ اُس نے کہا۔

"پھر آپ کو میری دل لگی سے خوش ہونا چاہیئے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ تو بہت پریشان رہتے ہوں گے .... آپ فیملی پلاننگ کیوں نہیں کرتے؟"

"پلاننگ کرتا رہتا ہوں اور فیملی بنتی رہتی ہے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "تین مہینوں بعد پانچواں بچہ ہو گا .... آپ شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں" ـــــ میں نے جواب دیا ـــــ "اور شادی کروں گی بھی نہیں۔"

"نہ ہی کریں تو اچھا ہے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "پاکستان میں کم از کم ایک آدمی تو سُکھی رہے گا .... اچھا، خدا حافظ۔"

"یہ کیا؟" — میں نے کہا — "میں ابھی بات کر رہی ہوں اور آپ خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ دیکھیں تو میں آپ کو لفٹ کرا رہی ہوں، آپ قبول ہی نہیں کر رہے۔"

"ایک کی لفٹ قبول کی تھی" — اُس نے کہا — "دس سال ہو گئے ہیں سزا بھگت رہا ہوں .... عمر قید!" — اور اُس نے دھماکے سے ریسیور رکھ دیا۔

اچھا شغل رہا۔ ایک بیوی بولی تو وہ خاوند سے تنگ اور ایک خاوند بولا تو وہ بیوی کے ہاتھوں دُکھی۔ دُکھی بھی اتنا کہ کسی عورت کی آواز بھی سُننے کا روادار نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اپنے معاشرے کی ریسرچ کی جائے اور دیکھا جائے کہ کوئی کسی سے راضی بھی ہے یا سب ایک دوسرے سے ناراض ہیں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں دن میں کئی کئی نمبر ملاتی۔ بیشک مجھے ٹیلیفون کرنے کی آزادی تھی لیکن یہ احساس تو مجھے تھا کہ بل بہت ہی زیادہ بنے گا اور یہ گھر کے اخراجات پر ناروا بوجھ ہو گا۔ میں نے تین چار دنوں بعد ویسے ہی ایک نمبر ملایا۔

"ہاں بھئی!" — اُدھر سے آواز آئی — "کون اے!"

میں نے ویسے ہی ایک نمبر بول کر پوچھا کہ یہ نمبر ہے؟

"او نئیں اوتے بہنا" — بھاری سی آواز نے پنجابی میں کہا — "رانگ نمبر مل گیا ای۔ بند کر۔"

"آپ کا نمبر کیا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"رانگ نمبر کا کی، رانگ نمبرا" — اُس نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا — "بندہ کبندہ دیکھ کے رانگ نمبر ملایا کر" — اور اُس نے فون بند کر دیا۔

اس کے بعد ایک مہینے کے دوران چار بار ویسے ہی نمبر ملاتے۔ چاروں نے رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا۔

جو لوگ گھروں اور دفتروں میں فون کرتے رہتے ہیں انہیں یہ تجربہ کئی بار ہُوا ہو گا کہ نمبر ملا رہے ہیں اور باتیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ دو آدمی

یا دو عورتیں یا ایک آدمی اور ایک عورت باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کے نمبر کا ان کے نمبر کے ساتھ پیچا لڑ جاتا ہے۔ باتیں کرنے والوں کو پتہ نہیں چلتا کہ ایک اور نمبر ان کے ساتھ مل گیا ہے اور کوئی اور خدا کا بندہ اُن کی باتیں سُن رہا ہے۔

مجھے ایسا تجربہ پہلی بار ہُوا۔ میں نے ابھی تین ہندسے ڈائل کئے تھے کہ ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ آواز سے وہ جوان لگتی تھی۔ اُس کی عمر کا میرا اندازہ پچیس چھبیس سال تھا۔ وہ پہلے سے بول رہی تھی اس لئے میں نے پہلا جُملہ ادھورا سُنا۔

"....تو کیا کرے گا، تم اپنی بیوی کا خیال رکھو" — یہ کہہ کر اُس نے اپنی آواز دبالی جیسے راز کی بات کی جاتی ہے۔ بڑی دھیمی آواز میں کہنے لگی — "اُس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کرتے رہا کرو۔ جب کبھی میرا نام لے تو مجھے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا کرو، اور سُنو.... یہ ضرور کہا کرو کہ انیس تمہاری جُوتی کے برابر بھی نہیں۔ وہ تو تمہاری نوکرانی لگتی ہے۔"

"ہاں ہاں سن لیا" — آدمی بولا — "انیس! یہ بتاؤ کس روز آؤں۔ مہینہ پورا گزر گیا ہے۔"

"وہ تو اگلے مہینے دورے پر جائے گا" — انیس بولی۔

"دن کو آجاؤں؟" — آدمی نے کہا۔

"نوکرانی کو کہاں گولی ماروں گی؟" — انیس نے کہا — "ہاں، ٹھہرو ....نوکرانی ایک روز کی چھٹی مانگ رہی تھی۔ میں اُسے کل یا پرسوں چھٹی دے دوں گی۔ تم کل نو بجے صبح کے بعد فون کرنا .... ایک اور بات بتاؤں! اس بدبخت آدمی کو شک ہو گیا ہے اور مجھے شک ہے کہ اس نے نوکرانی کو مجھ پر جاسوس لگایا ہُوا ہے۔ دل میں آتی ہے کہ اس کی ماں سے کہوں کہ شادی کرنے سے پہلے اپنے اس بیٹے کو شادی کے قابل تو بنا لیتیں۔"

اس کے بعد ان دونوں میں جو مکالمے ہُوتے ہیں وہ میں لکھ نہیں سکتی۔ میں محاورۃً نہیں بول رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹھنڈے کمرے میں میرا

پسینہ پھوٹ آیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ دونوں بیہودہ باتیں کر رہے تھے بلکہ اس لئے کہ میرا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا کہ ایک خاوند اپنی بیوی کے ساتھ بددیانتی کر رہا تھا اور ایک بیوی اپنے خاوند کو دھوکہ دے رہی تھی۔ آپ مجھے کہہ سکتے ہیں کہ تم کہاں کی شریف زادی تھیں جو غیر مردوں کے ساتھ بے حیاؤں کی طرح باتیں کرتی تھیں اور چھیڑ خانی کو تم نے شغل بنا رکھا تھا۔

میں اس کا یہ جواب دوں گی کہ میں شرارت کر رہی تھی مگر یہ عورت بدمعاشی کر رہی تھی۔ بدمعاشی بھی ایسی جو سن کر ہی میرا پسینہ پھوٹ آیا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ چار بیویوں کے اکلوتے خاوند اور جب جی چاہے بیوی کو ایک دو تین کہہ کر گھر سے نکال دینے والے سرتاج اور ایک پر دوسری اور دوسری پر ایک اور بیوی لے آنے والے مجازی خدا مجھے معاف نہیں کریں گے۔ راہ جاتی عورتوں کو ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھنے والے اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے والے مومنین بھی مجھے نہیں بخشیں گے لیکن میں نے جو بات شروع کر دی ہے یہ تو میں پوری سنا کے چھوڑوں گی۔

یہ بہت پرانی بات ہے کہ میں نے ٹیلیفون پر کسی کے خاوند اور کسی کی بیوی کو آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتے سنا تھا۔ چوبیس پچیس سال پہلے سمجھ لیں۔ میں دو مہینے پہلے کا واقعہ سناتی ہوں۔ میری بیٹی اپنی ایک سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میں اُسے اطلاع دینا چاہتی تھی کہ اُس کا ماموں اُسے شام ساڑھے چھ بجے اُس کی سہیلی کے گھر سے پک اپ کر لے گا۔ میں اُس کی سہیلی کے گھر کا نمبر ڈائل کر رہی تھی کہ درمیان میں ہی پیچا لڑ گیا۔

"... نام نہ لو اُس کا" — ایک آدمی کہہ رہا تھا — "مجھے ایسے دوست نہیں چاہئیں۔"

"کیوں؟" — دوسری طرف سے ایک آدمی بولا — "کیا ہوا؟ اُس نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے؟"

"دوست ایسے ہوتے ہیں؟" — پہلا آدمی کہنے لگا — "آج پانچ

سو روپے کا نقصان دے گیا ہے۔"

"نہ یار!" — دوسرے نے پوچھا — "وہ میرا بھی تو دوست ہے۔ وہ ایسا تو نہیں..."

"ایک آدمی کا کام پھنسا ہوا تھا" — پہلے نے کہا — "تم تو جانتے ہو۔ میں نے خود فائل دبائی ہوئی تھی۔ میں نے ایک ہزار کہا تھا۔ وہ کہنے لگا جناب غریب آدمی ہوں، سو دو سو لے لو۔ آخر پانچ سو پر راضی ہو گیا۔ کل اُس نے پانچ سو روپے لے کر آنا تھا لیکن وہ ہمارے اس یار کو ساتھ لے آیا۔ ہمارا یار تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا کہ یہ اپنا عزیز ہے۔ ابھی اس کا کام کرو، نکالو کیس۔ بس بھائی میرے، وہ زبردستی اور راہ خدا کام کرا گیا۔ کاٹ گیا نا میرا پیٹ... تم اُسے کچھ سمجھاؤ یار! اس طرح نہ کیا کرے۔"

"اُسے پتہ نہیں تھا" — دوسرے نے کہا — "پتہ ہوتا تو ایسے نہ کرتا۔"

"اُسے یہ تو پتہ تھا کہ بغیر فیس کے کام نہیں ہوتا" — پہلے نے کہا — "ہم پبلک کے باپ کے نوکر ہیں کہ مفت کام کرتے رہیں۔"

"ٹیلیفون پر ایسی باتیں نہ کیا کرو" — دوسرے نے کہا۔

"تمہارا کام کسی نے مفت نہیں کیا کبھی" — پہلے نے کہا — "میں نے تمہیں ایک بات نہیں بتائی تھی۔ سات آٹھ روز گزرے تھانے سے فون آیا کہ تمہارا چھوٹا بھائی حوالات میں بند ہے۔"

"کون؟... سہیل؟"

"ہاں یار، سہیل!" — پہلے نے کہا۔

"کیوں؟" — پہلے نے پوچھا — "کسی کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی؟"

"نہیں یار!" — پہلے نے کہا — "میں نے اپنے صاحب کو بتایا۔ اُس نے کہا کہ تھانیدار اپنا ہی آدمی ہے۔ اُس نے میرے سامنے تھانیدار کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے پھر تھانیدار کو کہا کہ یہ کوئی ایسا جرم نہیں کہ ضرور ہی مقدمہ بنے گا، چھوڑ دو، پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ صاحب نے مجھے کہا کہ تمہارا بھائی لڑکیوں کو چھیڑتے ہوتے پکڑا گیا

ہے۔ جاؤ، میں نے تھانیدار کو کہہ دیا ہے۔ اپنے بھائی کو جوتے ضرور مارنا .... میں تھانے چلا گیا۔ تھانیدار کو اپنے صاحب کے فون کا حوالہ دیا اور کہا کہ میرے بھائی کو چھوڑ دے ....

"تھانیدار نے کہا کہ آپ کا بھائی ہر روز لڑکیوں کے کالج کے باہر کھڑا ہو جاتا اور کسی نہ کسی لڑکی کے پیچھے چل پڑتا اور بس سٹاپ تک اُسے تنگ کرتا تھا۔ آج ایک کانسٹیبل نے اُسے پکڑ لیا ہے۔ وہ اب حوالات میں ہے۔ اُس نے آپ کے دفتر کا فون نمبر دیا تھا۔ میں نے آپ پر مہربانی کی کہ آپ کو اطلاع دے دی .... میں نے اپنے صاحب کی سفارش ڈالی اور منّت سماجت کی کہ میرے بھائی کو چھوڑ دے۔ اُس نے مجھے لیکچر دینا شروع کر دیا۔ کہتا تھا کہ ہماری اس نسل کا اخلاق بہت بگڑ گیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی اخلاقی حالت کو سُدھاریں ....

"میں اُس کی منّتیں کر رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ آپ نے سفارش ایسے آدمی کی ڈالی ہے جسے میں ٹال نہیں سکتا لیکن میں نے تو کیس تیار کر لیا ہے۔ میں اُوپر والوں کو کیا جواب دوں گا۔ بڑی مشکل سے وہ مانا لیکن کہنے لگا کہ یہ دو ہزار کا کام تھا لیکن آپ کے صاحب کو میں ناراض نہیں کر سکتا۔ لائیں، نکالیں کچھ۔ تھانے کی مٹھائی لے آئیں .... جانتے ہو مٹھائی کتنے کی پڑی؟ دو سو روپے تھانیدار نے لئے، ایک سو روپیہ اُس کے اسسٹنٹ تھانیدار نے لیا، پچاس روپے ایک ہیڈ کانسٹیبل نے، پچاس روپے پکڑنے والے کانسٹیبل نے لئے اور پچاس روپے تھانے کی مٹھائی کے لئے دیئے۔ دوڑ دوڑ کر میں نے یہ رقم اکٹھی کی تھی۔"

"اپنے صاحب کو بتانا تھا" — دوسرے نے کہا۔

"بتایا تھا" — پہلے نے کہا — "صاحب نے خوش ہو کر کہا کہ پھر تو تمہارا بھائی سستا چھوٹا۔ تھانیدار نے میرے کہنے کا لحاظ کیا ہے ورنہ وہ کم از کم تین ہزار لیتا اور نیک چلنی کی ضمانت بھی لے لیتا۔"

وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہے اور میں سُنتی رہی۔ آخر ایک نے

کہا — "اچھا بھائی! کل آجانا" — دوسرے نے کہا — "یار، تم ہی آجانا .... اچھا" — میں بول پڑی — "اچھا، خدا حافظ!"

"یہ کون ہے؟" — ایک نے کہا۔

"کسی عورت کی آواز تھی" — دوسرے نے کہا۔

دونوں نے باری باری ہیلو ہیلو کہنا شروع کر دیا۔

"آپریٹر ہو گی۔"

پھر دونوں فون بند ہو گئے۔

یہ تو اَب کی بات ہے، میں آپ کو اُس وقت کی باتیں سُنا رہی تھی جب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اُس آدمی اور اُس عورت کا راز و نیاز اور بیہودہ باتیں سُنیں تو مجھ پر ایسا اثر ہُوا کہ مجھے ٹیلیفون بُرا لگنے لگا۔ سات آٹھ دن گزر گئے تو ایک روز دوپہر کے وقت میرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔ اُس نے بھی ہیلو کہا۔ وہ کوئی آدمی تھا۔

"کون؟" — اُس نے پوچھا۔

"آپ کون؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے نمبر بتا کر پوچھا کہ یہی نمبر ہے؟

"یہی نمبر سمجھ لیں" — میں نے کہا — "کس سے بات کرنی ہے؟"

"میرا خیال ہے رانگ نمبر مل گیا ہے" — اُس نے کہا۔

"رانگ نمبر پر بات کرتے زیادہ پیسے تو نہیں لگتے" — میں نے کہا۔

"لیکن کسی عورت کے ساتھ بات کرنا اچھا نہیں لگتا" — اُس نے کہا۔

"میں عورت نہیں ہوں" — میں نے کہا — "نوجوان لڑکی ہوں۔"

"وہ تو آپ کی آواز سے پتہ چل رہا ہے" — اُس نے کہا — "جتنی آپ کی آواز پیاری ہے اگر آپ اتنی ہی خوبصورت ہیں تو پھر میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ پاکستان کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی ہیں اور آپ زندہ دل بھی ہیں۔"

"یعنی مس پاکستان" — میں نے کہا۔

"کیا آپ مس ہیں؟" — اُس نے پوچھا — "آپ مسز نہیں؟"

"ابھی نہیں" — میں نے کہا — "اور آپ؟"

"یہ ہم فون پر نہیں بتائیں گے" — اُس نے کہا — "یہ بتائیں مسز بننے کا کب تک ارادہ ہے؟"

"جب کوئی اپنی پسند کا مل گیا" — میں نے کہا — "میں اپنی پسند میں آزاد ہوں۔ میں شکل وصورت نہیں دیکھوں گی، رنگ روپ بھی نہیں دیکھوں گی، روپیہ پیسہ اور جائداد بھی نہیں دیکھوں گی، صرف یہ دیکھوں گی کہ آدمی زندہ دل ہو۔"

"پھر ملاقات ہو جاتے" — اُس نے کہا۔

"ہو جاتے گی" — میں نے کہا — "لیکن مجھے آپ غلط سمجھ لیں گے۔"

"یہی میں آپ سے کہنے لگا تھا کہ مجھے غلط نہ سمجھ لینا" — اُس نے کہا — "ملاقات سے میرا مطلب کچھ اور ہے۔ کہتے ہیں خدا نے جوڑے بنا تے ہوتے ہیں۔ اس پہ غور کریں کہ میں نے کوئی نمبر ملایا تھا تو آپ سے جا نمبر ملا۔ میں تو اس کا یہ مطلب لیتا ہوں کہ خدا نے پہلے ہی ہمارا نمبر ملایا ہُوا ہے۔"

"آپ کی عمر کتنی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"یہ خود دیکھ لینا" — اُس نے کہا — "میں اپنے متعلق کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔ مجھے آپ کی زندہ دلی اچھی لگی ہے۔ آپ مجھ میں یہی خوبی دیکھیں گی۔"

"شادی سے پہلے سب یہی کہتے ہیں" — میں نے کہا — "بعد میں سب تنگ کرتے ہیں۔ بیویوں کو ملازم سمجھ لیتے ہیں۔"

"میں ایسا نہیں" — اُس نے کہا — "آپ موقع دیں اور آزمائیں۔"

"فرض کریں ہماری شادی ہو جاتی ہے" — میں نے کہا — "پھر آپ میری مرضی پر چلا کریں گے؟"

"بالکل آپ کی مرضی پر!"

"جو کہوں گی وہ مانیں گے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں کہتا ہوں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا" — میں نے کہا — "آپ خاوند بن کر اپنا حکم چلائیں گے۔"

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں" — اُس نے کہا۔

"میں کہوں گی قلابازی لگاؤ تو آپ قلابازی لگائیں گے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں کہتا ہوں کہ آپ کے اشاروں پر ناچوں گا" — اُس نے کہا۔

"نہیں جناب!" — میں نے کہا — "میں کسی آدمی کے ساتھ شادی کروں گی۔ میں نے اپنے گھر میں بندر نہیں پالنا۔ آپ تو پکے اُلو کے پٹھے ہیں" — اور میں نے فون بند کر دیا۔

اس رانگ نمبر کے بعد پھر میرا یہی شغل شروع ہو گیا۔ میں نے چھ سات مہینے یہ شغل جاری رکھا۔ اگر میں ہر کال کی گفتگو سنانے لگوں تو ایک کتاب بن سکتی ہے۔ اتنے زیادہ نمبروں میں تین چار نمبر ایسے ملے جنہوں نے "رانگ نمبر" کہہ کر یا یہ کہہ کر آپ کو غلط نمبر مل گیا ہے فون بند کر دیا۔ صرف ایک آدمی ایسا ملا جو سب سے زیادہ مختلف تھا۔ میں نے ایک نمبر ملایا تو یہ آدمی بولا۔ میں نے وہی باتیں شروع کر دیں جس قسم کی باتیں دوسروں کے ساتھ کیا کرتی تھی۔ انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ صرف ہوں ہاں کرتا رہا۔ میں نے اُسے بہت چھیڑا۔

"آپ تو بولتے ہی نہیں" — میں نے تنگ آکر کہا — "خدا کی قسم، میں بہت خوبصورت لڑکی ہوں۔ آپ شاید اس تصور میں گم ہو گئے ہیں کہ اس لڑکی کی شکل وصورت کیسی ہے؟"

"نہیں" — اُس نے کہا — "میں اس سوچ میں گم ہو گیا ہوں کہ یہ کیسی لڑکی ہے.... لیکن اس میں تم بے قصور ہو۔ اولاد ویسی ہی ہوتی ہے جیسے والدین ہوتے ہیں۔ ایک بچے کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بچہ کس قسم کے خاندان کا ہے۔ میں نے بڑے اونچے رتبوں والے آدمی دیکھے ہیں۔

اونچے سوشل سٹیٹس والے بھی دیکھے ہیں لیکن صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیچھے اندھیرا ہے اور یہ کالی کوٹھڑیوں سے نکل کر آئے ہیں۔ اپنی حرکتوں سے انسان اپنی فیملی بیک گراؤنڈ ظاہر کر دیا کرتا ہے۔"

"میں آپ کو اپنی فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤں؟" — میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ تو معلوم ہو گئی ہے" — اس نے کہا — "تمہاری کوٹھی ہو گی۔ کار ہو گی۔ تمہارے والد صاحب بڑے افسر ہوں گے۔ شاید جاگیردار ہوں۔ سرکاری خوشامدی بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہارے گھر میں دولت ہو گی۔ تمہارے گھر والے اردو، پنجابی اور انگریزی کو ملا کر بات کرتے ہوں گے۔ تمہارے بچے تھینک یُو اور ٹاٹا کہتے ہوں گے۔ تمہارا خاندان پاکستان کی بجائے پاکستان پر حکومت کرنے والوں سے محبت کرتا ہو گا .... اگر آپ کو اپنے خاندان کی ان خوبیوں پر فخر ہے تو پھر آپ کی اخلاقی حالت یہی ہونی چاہیے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ مولوی ہیں" — میں نے کہا — "یا آپ کا دل مُردہ ہو چکا ہے۔"

"مولوی مُردہ دل نہیں ہُوا کرتے لڑکی!" — اس نے کہا — "کسی مولوی سے بات کر کے دیکھنا۔ میرا دل ابھی مُردہ نہیں ہُوا۔ ابھی تو عمر کے صرف تیس سال پورے کئے ہیں۔"

"شادی شدہ ہیں؟"

"بڑی بُری طرح شادی شدہ ہوں" — اس نے جواب دیا — "بیوی اوّل درجے کی جاہل اور پسماندہ ہے۔"

"او ہو!" — میں نے بناوٹی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا — "پھر تو آپ کی ازدواجی زندگی بڑی تکلیف دہ ہو گی۔ کیسے گزارہ چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا" — اس نے جواب دیا — "گھر میں امن اور سکون رہتا ہے۔ پیار اور محبت ہے۔"

"پھر آپ بھی اوّل درجے کے جاہل اور پسماندہ ہوں گے" — میں نے

کہا — "کیا یہ ٹیلیفون آپ کے گھر میں ہے؟"

"جی محترمہ!" — اُس نے کہا — "یہ میرے گھر کا فون ہے۔"

آج سے پچیس سال پہلے جس گھر میں ٹیلیفون ہوتا تھا اُسے تعلیم یافتہ اور امیر گھر سمجھا جاتا تھا۔

"آپ نے اپنی بیوی کو جاہل اور پسماندہ کیوں کہا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"تم نے مجھے جاہل اور پسماندہ کیوں کہا ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

میں کوئی جواب سوچ رہی تھی کہ وہ بول پڑا۔

"جن نظروں سے تم جیسے لوگ لوگوں کو دیکھتے ہیں میں نے اُن نظروں کے مطابق بات کی ہے" — اُس نے کہا — "تمہاری سوسائٹی کے پیمانے اور ناپ تول ہم سے الگ ہوتے ہیں۔"

"آپ کے پیمانے کیسے ہیں؟" — میں تو چھیڑ خانی کے موڈ میں تھی اس لئے جو مُنہ میں آتا کہہ دیتی تھی۔

"ہمارے پیمانے کچھ ایسے ہیں" — اُس نے کہا — "کہ اپنی جس حرکت پر تم خوش ہو رہی ہو اُسے ہم بے حیائی اور بے شرمی کہتے ہیں۔"

"پاکستان کے آدمی خواہ ان کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوتی ہوں، بے حیا اور بے شرم لڑکیوں کو دیکھ کر رالیں ٹپکانے لگتے ہیں" — میں نے کہا — "آپ عجیب آدمی ہیں۔ میں آپ کو لفٹ کرا رہی ہوں اور آپ ...."

"میرے گھر میں اتنی اچھی بیوی ہے" — اُس نے کہا — "مجھے کسی طوائف کی لفٹ کی ضرورت نہیں .... اگر تم اپنا ریٹ اور ٹھکانہ بتا دو تو میں اپنے ایک دو دوستوں کو تمہارا گاہک بنا دوں گا۔ میں تمہاری اور کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔"

یہ چوٹ مجھے بہت سخت پڑی۔

"اور جو کچھ کہنا ہے کہہ لیں" — میں نے کہا — "طوائف نہ کہیں۔"

"میں جانتا ہوں تم طوائف نہیں ہو" — اُس نے کہا — "طوائفوں

کے گھروں میں ٹیلیفون نہیں ہوتے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ کسی طوائف کے قریب سے گزرو تو وہ اسی طرح اشارے کیا کرتی ہے جیسی باتیں تم کر رہی تھی"

"اگر آپ کو میری باتیں اچھی نہیں لگتیں تو فون بند کیوں نہیں کر دیتے؟" —میں نے کہا۔

"جب تمہارا نشہ پورا ہو جائے گا تو میں فون بند کر دوں گا" — اُس نے کہا —"ایک بات تمہیں بتا دیتا ہوں.... تمہارا انجام بہت بُرا ہو گا۔"

میں نے "اچھا، خدا حافظ" کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں نے کہا ہے کہ صرف یہ ایک آدمی دیکھا جس نے اپنے آپ کو قائم رکھا۔ آج ایسے آدمی کو لاکھوں میں ایک کہا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے معاشرے کے ہر شعبے کے آدمی کے ساتھ باتیں کیں۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور نوجوان لڑکوں سے لے کر ضعیف بوڑھے بھی تھے۔ ایک عورت کی آواز سُن کر بوڑھے بھی جوان ہو جاتے تھے۔ آج کل تو حالت اور زیادہ خراب ہو گئی ہے لیکن آپ مجھے اپنی رائے دینے کا حق نہیں دے سکتے کیونکہ میں خود آدمیوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرتی رہی ہوں۔

اس شغل کے دوران ایک ڈاکٹر کے ساتھ بات ہوئی۔ میں نے اُسے کہا —"معاف رکھنا، رانگ نمبر مل گیا ہے۔"

"تو کیا ہُوا؟" — اُس نے کہا —"کیا رانگ نمبر پر بات نہیں ہو سکتی؟"

میں نے ملایا ہی غلط نمبر تھا اور جس کسی نے بولنا تھا اُسے میں نے پریشان کرنا تھا، اُلّو بنانا تھا۔

"میری جگہ کوئی آدمی ہوتا تو آپ ٹھاہ کر کے فون بند کر دیتے" — میں نے کہا۔

"کیا مرد کیا عورت، میرے لیے سب برابر ہیں" — اُس نے کہا —"میں ڈاکٹر ہوں۔ ضرورت پڑتی ہے تو میں عورتوں کے کپڑے سرکا کر

اُن کے جسم کو دیکھا کرتا ہوں اور مردوں کو بھی ننگا کر لیا کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں دونوں جسم ایک جیسے ہوتے ہیں۔ آپ کتنا کچھ پڑھی ہوئی ہیں؟"

"ابھی ابھی بی۔اے کیا ہے" — میں نے جواب دیا۔

"پھر تو آپ جانتی ہیں کہ ڈاکٹر کو مسیحا کہتے ہیں" — اُس نے کہا — "مسیحا کے لئے مرد اور عورت، امیر اور غریب، مسلمان اور غیر مسلم سب برابر ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی مرد مجھے فون کرتا، خواہ یہ رانگ نمبر ہی ہوتا، میں اُسے کہتا کہ فون بند نہ کرنا، میرے ساتھ باتیں کرو۔"

"اگر کسی ہیجڑے کا رانگ نمبر مل جاتا تو؟" — میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

"یہ تو اور زیادہ اچھا ہوتا" — ڈاکٹر نے کہا —"میں اس وقت یہ چاہتا تھا کہ کوئی میرے دل کو اور اعصاب کو سہلا دے۔ صرف ہیجڑے ایسی باتیں کر سکتے ہیں کہ مرتے ہوتے آدمی کی بھی ہنسی نکل جاتی ہے۔"

"دل اور اعصاب کو سہلانے کی کیا ضرورت آ پڑی ہے؟" — میں نے پوچھا —"کیا اپنے کسی مرض کا علاج آپ کے پاس نہیں ہے؟"

"میرے مرض کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے" — اُس نے جذباتی سے لہجے میں کہا —"میں دوسروں کے روگ اپنے سینے میں ڈال لیا کرتا ہوں، لیکن میرے روگ کو کوئی نہیں سمجھتا۔ میں مریضوں کو اپنا روگ نہیں دکھا سکتا۔ آج دل پر ایسا بوجھ آ پڑا ہے کہ یہی جی چاہتا ہے کہ کوئی ذرا سی دیر خوشگوار سی باتیں کرے۔ میرے پاس تو جو آتا ہے، اپنے دُکھ لے کے آتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ میں اُسے دُکھ اور درد سے نجات دلا دوں۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ذرا سی دیر میرے ساتھ باتیں کر لیں پھر میں کل آنے والے مریضوں کے روگ اور دُکھ سُننے کے قابل ہو جاؤں گا۔"

اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے میں جذباتی ہی کہوں گی، لیکن وہ واقعی دُکھی معلوم ہوتا تھا۔ میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ میں اُس کے بولنے کے انداز سے متاثر ہوئی۔

"مجھ سے یہ تو پوچھ لیں کہ میں کون ہوں" —— میں نے کہا —— "میری عمر کیا ہے اور میں کس قسم کی لڑکی ہوں۔"

"آپ جو کوئی بھی ہیں" —— اُس نے کہا —— "جوان ہیں یا بوڑھی، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں بے تکلف سا آدمی ہوں۔ آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ کی آواز میں مٹھاس ہے اور کوئی ایسا تاثر ہے جس نے مجھے سکون سا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ گالیاں بھی دیں گی تو وہ بھی میٹھی لگیں گی۔ آپ کی آواز سے میں آپ کی عمر کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔"

"بتائیں" —— میں نے پوچھا —— "کتنی ہے؟"

"کم از کم بیس سال" —— اُس نے کہا —— "زیادہ سے زیادہ تئیس سال .... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آپ نڈر اور بے باک ہیں۔ سچ بتائیں، میں نے عمر غلط تو نہیں بتائی؟"

"جھوٹ نہیں بولوں گی" —— میں نے کہا —— "آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ عمر تئیس سال سے کم ہے .... اچھا ڈاکٹر صاحب! اب یہ بتائیں کہ آپ کے سینے میں کیا روگ ہے" —— میں نے ایسے لہجے میں کہا جس میں ذرا سی بھی سنجیدگی نہیں تھی —— "محبت میں ناکامی کے سوا اور کیا دُکھ ہوگا۔"

"اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا!" —— اُس نے کہا —— "محبت کھیل نہیں۔"

"کبھی محبت کی ہے؟"

"نہیں محترمہ!" —— اُس نے کہا —— "میں نے کہا ہے محبت کھیل نہیں۔ میں محبت کرنا چاہتا ہوں لیکن کھیلوں گا نہیں۔ محبت کروں گا اور ساری عمر کا رفیق ہوں گا۔ میں مکالمے بولنے والی اور آہیں بھر بھر کر فلمی گیت گانے والی اور چھُپ چھُپ کر ملاقاتیں کرنے والی محبت کا قائل نہیں۔ میں جس کے دل میں محبت دیکھوں گا اُسے اپنا آپ پیش کر دوں گا۔ اپنا جسم، اپنی جان، اپنی ...."

"اپنی ٹُوٹی اور اپنا تھرمامیٹر" —— میں درمیان میں بول پڑی۔

اُس نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا جو مجھے لاؤڈ سپیکر کی آواز جیسا اونچا سنائی دیا۔ میں نے ریسیور کان سے ہٹا لیا۔

"مجھے اسی زندہ دلی کی ضرورت ہے" —— اُس نے کہا —— "خدا کی قسم، آپ نے مجھ پر بڑا کرم کیا ہے۔ آپ پہلی لڑکی ہیں جس نے میرا قہقہہ نکالا ہے۔ اس طرح ہنسے ہوئے ایک عمر گزر گئی ہے۔"

"آپ کی کتنی عمر گزری ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"تیسواں سال گزر رہا ہے" —— ڈاکٹر نے جواب دیا —— "اگر میں ایسی ہی ڈیپریشن میں پڑا رہا تو تیسواں سال گزرنے سے پہلے ہی شاید میں خود گزر جاؤں گا۔"

"اللہ نہ کرے" —— یہ الفاظ میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گئے۔

"آپ کو میرے گزر جانے کا غم نہیں ہونا چاہیئے" —— اُس نے کہا —— "اگر آپ نے دعا دی ہے تو آپ کا شکریہ، لیکن مجھے دعاؤں کی نسبت اُس سچے پیار کی ضرورت ہے جو مرجھاتی ہوئی روح کو تر و تازہ کر دیتا ہے۔"

"کیا آپ مجھ سے محبت کرنا پسند کریں گے؟" —— میں نے اُسے بیوقوف بنانے کی خاطر پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" —— اُس نے پوچھا۔

"راحیلہ" —— میں اپنا نام بتا کر چونک اُٹھی کیونکہ میں اُسے اپنا صحیح نام نہیں بتانا چاہتی تھی لیکن بے اختیار میرے مُنہ سے صحیح نام نکل گیا۔

"اچھا نام ہے" —— ڈاکٹر نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا —— "لیکن راحیلہ! تمہیں اپنے نام جیسا اچھا ہونا چاہیئے۔ میں آپ کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کر رہا نہ ہی میں آپ کو اس قسم کی باتیں کرنے پر اکساؤں گا حالانکہ میں خود بے تکلفی سے بات کرنے والا آدمی ہوں اور میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ آپ اپنے ان الفاظ میں سنجیدہ اور دیانتدار نہیں ہیں۔"

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں اس شخص سے متاثر ہو چکی تھی اور

یہ اثر اتنا گہرا چلا گیا تھا کہ جب اُس نے یہ کہا تھا کہ تیس برس گزرنے سے پہلے میں خود ہی گزر جاؤں گا تو میرے مُنہ سے اپنے آپ ہی نکل گیا تھا اللہ نہ کرے۔ پھر میں نے اسی طرح بے ساختہ اُسے اپنا صحیح نام بھی بتا دیا تھا۔ اُس کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے اُسے اُکسانے اور چھیڑنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ ریزرو رہا۔ میں مان گئی کہ بڑی مضبوط شخصیت اور کردار کا آدمی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے ساتھ کم از کم ایک گھنٹہ باتیں ہوتی تھیں۔ میں اتنی زیادہ باتیں یعنی ہر ایک مکالمہ لکھ نہیں سکتی۔ اپنا یہ تاثر بتا دیتی ہوں کہ میں اُس کے ساتھ سنجیدگی سے باتیں کرنے لگی تھی۔

"آپ نے مجھ سے میرا فون نمبر نہیں پوچھا" — یہ میں نے اُس وقت کہا جب وہ خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

"نہیں پوچھوں گا" — اُس نے کہا — "میں لڑکیوں کے فون سُن لیا کرتا ہوں، خود کبھی کسی خاتون کو فون نہیں کیا۔ ذرا سوچئے، میں آپ کو فون کروں، ریسیور آپ کے والد صاحب یا کوئی بھائی اُٹھا لے تو میں کیا کہوں گا۔ اگر میں نے یہ کہا کہ راحیلہ سے بات کرنی ہے تو آپ کی کیا عزت رہ جائے گی .... اگر آپ چاہیں تو میرا نمبر نوٹ کر لیں۔"

"کر لیتی ہوں۔"

میں نے اُس کا نمبر نوٹ کر لیا۔

اس کے بعد کی میں تفصیل نہیں سناؤں گی۔ سنانے والی بات یہ ہے کہ میں نے اُسے ہر روز ٹیلی فون کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ہماری بے تکلفی ایک دوسرے کو دیکھے بغیر شروع ہو گئی۔ آپ بے تکلفی کا مطلب غلط نہ سمجھیں۔ اگر میرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو اُس نے مجھے ٹوک دیا۔ پھر آپ عام فہم زبان میں یہ کہہ لیں کہ ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ یہ محبت اتنی زیادہ شدت اختیار کر گئی کہ میں نے اُسے ملنے کا ایک طریقہ اختیار کیا۔

اُس نے اپنے کلینک کا اتا پتہ تو بتا ہی دیا تھا۔ میں ایک شام

وہاں مریض بن کر جا پہنچی۔ یہ اُس کی پندرہ مرلے کی کوٹھی تھی۔ اسی کے دو بیرونی کمروں میں اُس نے اپنا کلینک بنا رکھا تھا۔ میں نے مریضوں کی تعداد دیکھی تو پتہ چلا کہ اس کی اچھی خاصی پریکٹس چلتی ہے۔ میری باری آئی تو مجھے اُس کے کمرے میں داخل کیا گیا۔

ایک خوبرو جوان آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر جو تبسم تھا وہ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ میں اُس کا نام لکھنا نہیں چاہتی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آپ فلاں ڈاکٹر ہیں؟

"کیا آپ نے میرا باہر بورڈ نہیں دیکھا؟" — اُس نے پوچھا — "یا کیا آپ مجھے ڈاکٹر نہیں سمجھتیں؟"

"میں آپ کی تعریف سُن کر آئی ہوں" — میں نے کہا — "میں نے آپ کا نام اس لئے پوچھا ہے کہ بعض جگہوں پر دو دو یا تین تین ڈاکٹر پریکٹس کرتے ہیں۔"

"میں اکیلا ہوں" — اُس نے کہا — "کہیئے کیا تکلیف ہے؟"

"دل میں کچھ گڑبڑ ہے" — میں نے کہا۔

"ارے" — اُس نے کہا — "کیا اسی عمر میں دل میں گڑبڑ ہو گئی ہے؟ یہ تو بوڑھوں کی بیماری ہے .... گڑبڑ سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ مجھے کوئی علامت بتائیں۔"

"دل کی یہ بیماری اسی عمر میں لگتی ہے" — میں نے کہا۔

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکی۔

"راحیلہ!" — اُس نے کہا — "خدا کی قسم، تم راحیلہ ہو۔ میں نے اب آواز پہچانی ہے۔"

آپ مجھے جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں کہہ لیں، میں اعتراف کرتی ہوں کہ اپنے آپ ہی میرا ایک ہاتھ اُس کی میز پر سرکتا ہُوا اُس کے ہاتھ تک جا پہنچا جو میز پر تھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کے اور میرے ہاتھ نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔

پھر یُوں ہُوا کہ ایک نکاح خواں نے ہمیں رشتۂ ازدواج میں جکڑ دیا۔

یہ سول میرج نہیں تھی، نہ یُوں ہُوا تھا کہ میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔ یہ باقاعدہ شادی تھی۔ میں نے اپنی والدہ کے ساتھ بات کی تھی۔ میرے والدین نے اور میرے بھائیوں نے ڈاکٹر کو دیکھا تھا، گھر بلایا تھا اور اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا۔ پھر اُس کے والدین ہمارے گھر آتے تھے اور یوں یہ شادی بزرگوں نے کرائی تھی۔

میں نے اُس کی کوٹھی میں جاکر دیکھا تو پتہ چلا کہ آدمی باذوق ہے۔ میں اُس کی ذات میں ڈوب گئی۔ اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ کچھ نشے میں ہو یا آپ اسے مخمور آواز کہہ لیں۔ بہت پیاری باتیں کرتا تھا۔ اُس کا یہ انداز مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اُسے بتا دیا کہ رانگ نمبر پر فون کرنا میری ہابی تھی۔

ایک سال یوں گزر گیا جیسے ایک خوبصورت خواب چند منٹوں میں دیکھ لیا جاتا ہے۔

چھ مہینے اور گزرے تو میری یہ بچی پیدا ہوئی جو اب جوانی میں داخل ہو چکی ہے۔ میرا گھر پیار اور محبت سے لبریز ہو گیا۔

شادی کا دوسرا سال بھی گزر گیا۔ ایک روز اطلاع ملی کہ میری خالہ پتے کی تکلیف کی وجہ سے ایک ہسپتال میں داخل کر لی گئی ہے۔ میں اُسے دیکھنے گئی۔ اُسے الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر اُسے دیکھنے آئی تو میری والدہ نے بڑے فخر سے میرے متعلق لیڈی ڈاکٹر کو بتایا کہ اس کا خاوند ڈاکٹر ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے نام پوچھا جو اُسے بتایا گیا۔ اُس نے یوں چونک کر میری طرف دیکھا جیسے وہ خوش نہ ہوتی ہو۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اُس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "میں انہیں جانتی ہوں۔ بڑے اچھے ڈاکٹر ہیں۔"

وہ میری خالہ کو دیکھ کر کمرے سے نکلی، لیکن دروازے میں رُک گئی۔ میری طرف دیکھ کر اُس نے سَر کا ہلکا سا اشارہ کیا اور باہر نکل گئی۔ میں اُس کے پیچھے گئی۔ اُس نے مجھے سَر کے اشارے سے باہر بلایا تھا۔ کمرے سے ذرا دُور لے جاکر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ ڈاکٹر کے ساتھ وقت کیسا گزر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا گزر رہا ہے۔ پھر اُس نے پوچھا کہ شادی کب ہوتی تھی۔ میں نے بتایا کہ دو سال ہو گئے ہیں۔

"ایک سال اور" ـــ لیڈی ڈاکٹر نے سرگوشی میں کہا۔

"ایک سال اور؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ ہے کہ ایک سال بعد تم اپنے والدین کے گھر ہو گی" ـــ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ـــ "اور ڈاکٹر کے گھر میں چوتھی بیوی ہو گی۔"

مجھے چکر سا آ گیا۔ یہ لیڈی ڈاکٹر مجھ سے بڑی تھی اور جوان بھی تھی اور خوبصورت بھی تھی۔ میری تو زبان ہی بند ہو گئی تھی۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں نے اپنا فرض سمجھا ہے کہ تمہیں آنے والے خطرے سے پہلے ہی خبردار کر دوں" ـــ اُس نے کہا ـــ "اگر تم اُس سے زیادہ ہوشیار بلکہ فریب کار ہو تو اُس کی کوٹھی اپنے نام لکھوا لو، لیکن وہ اتنا چالاک آدمی ہے کہ وہ تمہارے والدین کی جائیداد اپنے نام لکھوا لے گا۔"

"ڈاکٹر صاحبہ!" ـــ میں نے ذرا غصیلے سے لہجے میں کہا ـــ "آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ آپ شاید اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں جو نہیں ہو سکی۔"

"میں شادی کرنا نہیں چاہتی تھی" ـــ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ـــ "بلکہ اُس کے ساتھ میری شادی ہو گئی تھی۔ میں اُس کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی کو اُس نے دو سال رکھ کر طلاق دی اور گھر سے نکال دیا تھا۔ مجھے اُس نے یہ بتایا تھا کہ اُس کی ابھی تک شادی نہیں ہوتی۔ میں بھی اُس کی محبت میں گرفتار ہو کر اُس کی کوٹھی میں جا پہنچی تھی۔ دو سال بعد پتہ چلا کہ یہ تو

خوبصورت عورتوں کا شکاری ہے۔ میرے بعد اُس نے مجھ جیسی اور تم جیسی اور لڑکیوں کو بھی پھانسنے کی کوشش کی۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اُس کے کلینک میں عورتیں زیادہ آتی ہیں؟ اس کے علاوہ وہ نشئی ہے۔"

"نہیں" — میں نے تڑپ کر کہا — "اگر وہ شراب پیتا ہے یا چرس پیتا ہے یا ایسا کوئی اور نشہ کرتا ہے تو اُس کے مُنہ سے بدبُو آنی چاہیئے جو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کی۔"

"پاگل لڑکی!" — لیڈی ڈاکٹر نے کہا — "نشہ صرف شراب اور چرس کا ہی نہیں ہوتا۔ وہ نشے والی گولیاں کھاتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ویلیم کا عادی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ویلیم ذہنی مریضوں کو دی جاتی ہے اور اس میں نشہ ہوتا ہے۔ اس کی کوئی بدبُو نہیں ہوتی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ مجھے طلاق دینے کے بعد وہ ہائی پوٹینسی کی ویلیم اور اس سے بھی تیز گولیوں کا عادی ہو گیا ہے۔ کیا تم نے دیکھ نہیں لیا کہ وہ نشے کی حالت میں رہتا ہے؟ میں تمہیں یہ بتا رہی ہوں کہ ابھی تم بڑی اچھی عمر میں ہو۔ ابھی سے اپنا کوئی انتظام کر لو۔"

آج مجھے یاد نہیں کہ میں اس لیڈی ڈاکٹر کی باتیں سن کر واپس خالہ کے کمرے میں گئی تھی یا نہیں اور میں ہسپتال سے کس طرح اپنے گھر تک پہنچی تھی۔ یہ خیال بار بار آتا تھا کہ اس لیڈی ڈاکٹر نے میرے خاوند کو کسی دشمنی کی بنا پر رُسوا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن آنے والے چند دنوں میں ہی اُس کی ہر بات سچّی معلوم ہونے لگی تھی۔

میں نے اپنے خاوند کے ساتھ اس معاملے کی کوئی بات نہ کی۔ ارادہ کیا کہ اسے چوری چُھپے دیکھوں گی۔ ایک روز میں اُسے یہ بتا کر کہا کہ میں اپنے والدین کے گھر جا رہی ہوں اور دو تین روز بعد واپس آؤں گی، وہاں سے آ گئی۔ رات کو کلینک بند ہونے کے وقت میں اپنے والدین کے گھر سے نکلی اور اُس کے کلینک جا پہنچی۔ مریض کوئی بھی نہیں تھا۔ دروازے پر جو نوکر کھڑا تھا اُس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اندر ہیں۔ میں اندر جانے

لگی تو نوکر نے کہا کہ ذرا ٹھہر جائیں، ڈاکٹر صاحب ایک آدمی کا معائنہ کر رہے ہیں۔

میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھُل گیا۔ نوکر کے روکنے کے باوجود میں اندر چلی گئی۔ میرا خاوند اپنی کرسی پر نہیں تھا۔ دوسرے کمرے کو اُس نے انسپکشن روم بنایا ہُوا تھا۔ اس کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو یہ بھی کھل گیا۔ میری نظر انسپکشن ٹیبل پر پڑی۔ وہاں ایک جواں سال مریضہ لیٹی ہوئی تھی اور ڈاکٹر صاحب اس کے ساتھ جو حرکتیں کر رہے تھے وہ آج بھی ذہن میں آتی ہیں تو کانپ جاتی ہوں۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔ میں وہاں سے نکل آئی اور چکراتی ہوئی اُس گھر سے نکل آئی جو میرا اپنا گھر تھا، جہاں میں دلہن بن کر آئی تھی، محبت کا تحفہ لے کر آئی تھی اور جہاں میں نے اپنی محبت کی یادگار پہلی بچی کو جنم دیا تھا۔

رات کو ڈاکٹر میرے والدین کے گھر آیا۔ اُس کے چہرے پر نہ پچھتاوا تھا نہ ایسا تاثر جو پکڑے جانے پر چہرے پر ہونا چاہیئے تھا۔ وہ میرے کمرے میں آیا اور مجھے اس بات پر قائل کرنے کے لئے عجیب و غریب کھوکھلے اور جذباتی مکالمے بولنے لگا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔

میں اپنی محبت کی ماری ہوئی اپنے آپ کو یہ فریب دینے لگی کہ واقعی مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں دو تین روز ناراض رہ کر اُس کے گھر چلی گئی۔ وہ مجھے لینے آیا تھا لیکن میرے ذہن سے وہم اور خدشے مٹ نہ سکے۔ دو تین روز ہی بعد جب مریض جا چکے تھے، مجھے اس کے کلینک کے کمرے سے اُس کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ اپنی کوٹھی کا ہی کمرہ تھا۔ ایک دروازہ اندر کو بھی کھُلتا تھا جو بند رکھا جاتا تھا۔ میں نے اس دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ وہ کسی عورت کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا۔

"بیوی کو بڑی مشکل سے منایا ہے" — وہ کہہ رہا تھا — "ہاں ہاں، ایسے ہی کریں گے .... کمرے کا انتظام ہو جائے گا، لیکن دن کے

وقت ..... کہہ تو رہا ہوں ..... آؤں گا آؤں گا۔"

اب تو کوئی شک نہ رہا۔ کچھ دنوں بعد میں نے اُسے ویلیم گولیاں کھاتے دیکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا وہ میں اس لئے بیان نہیں کر سکتی کہ میرے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ لکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

اُس نے بھی دیکھ لیا کہ میں نے اُس کی کرتوت جان لی ہے تو وہ بھی مجھ سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ میں نے ایک روز اُسے بٹھا لیا اور اُسے بتایا کہ میں نے اُسے کہاں کہاں پکڑا ہے اور کیسی کیسی باتیں سنی ہیں۔ میں نے پہلی بار اُس پر یہ انکشاف کیا کہ اس کالونی کی تین معزز عورتیں مجھے کہہ چکی ہیں کہ اپنے خاوند کو کچھ سمجھاؤ، یہ تو دُور دُور تک بدنام ہو گیا ہے۔

"دیکھو راحیلہ!" ___ اُس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا ___ "میری ذاتی زندگی میں دخل دینے کی کوشش مت کرو۔ میں نے آج تک تم سے نہیں پوچھا کہ جنہیں تم فون کرتی رہتی تھیں، اُن میں سے کتنے آدمیوں سے ملی تھیں اور تم نے کتنے آدمیوں کے ساتھ ایسی ہی محبت کا اظہار کیا تھا جیسا میرے ساتھ کیا تھا۔"

"میں تمہاری طرح بدکار نہیں تھی" ___ میں نے غصے سے پھٹتے ہوئے کہا۔

"چلو میں ہی بدکار ہوں" ___ اُس نے کہا ___ "تو اس کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ طلاق لو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔"

"اور تم چوتھی بیوی کو گھر لے آؤ!" ___ میں نے کہا۔

"میں اگر اکٹھی چار بیویاں گھر لے آؤں تو تم مجھے روک نہیں سکتیں" ___ اُس نے کہا۔

میرے لئے سب راستے بند ہو گئے تھے۔ صرف اپنے والدین کے گھر کا راستہ کھلا تھا۔ میں بچّی کو اٹھا کر اپنے گھر آ گئی۔ میرے پیچھے پیچھے تحریری طلاق بھی آ گئی۔ مجھے دوسری شادی کے لئے کہا گیا۔ مجبور بھی کیا گیا۔ میں نے آخر اپنے گھر والوں سے کہا کہ مجھے وہ بوجھ سمجھتے ہیں تو جس طرح میں اُس گھر سے نکل آئی ہوں اسی طرح اس گھر سے بھی نکل جاؤں گی۔ یہ ڈاکٹر میری

پہلی اور آخری محبت تھا، لیکن میں کسی ہوس کار کی ہوس کا کھلونا نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ میں ٹیلیفون کے ذریعے جو گناہ کرتی رہی ہوں، خدا نے مجھے اُس کی سزا دی ہے۔

عمر چالیس سال سے اُوپر چلی گئی ہے۔ میں اُسی گھر میں بیٹھی ہوں جہاں پیدا ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کو مرے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔

دینا ناتھ سے دین محمد تک

سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ میں ہندو سے مسلمان کیوں ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں پرانے زمانے کا بی۔اے ہوں۔ اُس زمانے میں تعلیم صحیح معنوں میں تعلیم ہوتی تھی۔ اُس دَور کا میٹرک پاس لڑکا آج کے ایم۔اے کی برابری کرتا ہے۔ ایک تو مجھ پر اس تعلیم کا اثر تھا کہ میرا ذہن ضرورت سے زیادہ روشن ہو گیا اور میں انقلاب پسندی کا قائل نہیں بلکہ مریض ہو گیا۔ مجھ میں انتہا پسندی پیدا ہو گئی۔ سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے اور اس پر سمندر پار کی ایک قوم نے قبضہ جما رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے مذہب، اسلام اور عیسائیت کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔ اپنا مذہب چھوڑنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن کچھ واقعات ایسے ہو گئے جنہوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنا مذہب چھوڑ دوں۔

میں آپ کو جو دلچسپ اور فکر انگیز کہانی سنانے لگا ہوں وہ بہت پہلے دَور کی ہے۔ جب میں بی۔اے کی ڈگری لے چکا تھا۔ میں مسلمان اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا تھا۔ پہلے میں آپ کو مذہب کی تبدیلی کا واقعہ سناتا ہوں۔ میں کٹر ہندو ہوا کرتا تھا۔ ۳ جون ۴۷ء کے روز تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا۔ میں رہنے والا تو جہلم کا ہوں لیکن میرے باپ نے لاہور میں بڑا اچھا کاروبار جما رکھا تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا۔ اس وجہ سے میں لاہور میں ہی رہتا تھا۔

تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ ہی لاہور میں اس طرح کی وارداتیں ہونے لگیں کہ رات کو کوئی اکیلا دوکیلا مسلمان ہندوؤں کو نظر آ جاتا تو وہ

اُسے قتل کر دیتے تھے اور اگر کوئی ہندو مسلمانوں کے ہاتھ چڑھ جاتا تو اُسے خنجر مار کر ہلاک کر دیتے تھے۔ میں ہندو تھا۔ ہمارے سیاسی لیڈر اور مندروں کے پنڈت ہمیں یہی ایک سبق دیتے تھے کہ پاکستان کے قیام کا اعلان تو ہو گیا ہے لیکن یہ ہر ہندو کا مذہبی فرض ہے کہ وہ پاکستان کو اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے۔ ہمارے بعض سیاسی لیڈر تو یہاں تک کہتے تھے کہ اب بھی وقت ہے، انگریزوں کو مسلمانوں کی قتل و غارت سے اتنا مجبور کر دو کہ وہ اپنا فیصلہ تقسیم کا واپس لے لیں۔ میں بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والا ہندو تھا۔

اُس وقت تک میرے دو بیٹے پیدا ہو چکے تھے۔ ایک کی عمر تیرہ سال دوسرے کی پندرہ سال تھی۔ ایک رات دونوں اکٹھے میرے باپ کے بتائے ہوئے کسی کام سے باہر نکل گئے۔ دو گھنٹے بعد سات آٹھ ہندو ان کی لاشیں اُٹھائے ہوئے میرے گھر لے آئے۔ دونوں کو خنجروں، چاقوؤں سے قتل کیا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ انہیں مسلمانوں نے قتل کیا ہے مگر پندرہ بیس روز بعد مجھے کسی نے بتایا کہ یہ کسی دوسرے محلے کے ہندوؤں کے ہی ہاتھوں اس دھوکے میں قتل ہوتے ہیں کہ یہ مسلمان ہیں۔ میرے لڑکے مسلمان لڑکوں کی طرح شلوار قمیض پہنا کرتے تھے۔ اسی دھوکے میں مارے گئے۔

میں تو پاگل ہو گیا۔ پھر ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان ایک نیا ملک بن گیا۔ ہندوستان سے مسلمان اِدھر آنے لگے۔ ہمیں اُدھر جانا پڑا۔ میں جب ہندوستان میں داخل ہوا تو مسلمانوں کی لاشوں نے میرا استقبال کیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کے بچوں اور عورتوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ہزارہا جوان مسلمان لڑکیوں کو ہندو اور سکھ اُٹھا کر لے گئے تھے۔

میرے دو بیٹے پہلے ہی اس آزادی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اب میں لاکھوں مسلمانوں کی لاشیں صرف اس لئے بکھری ہوئی دیکھ رہا

تھا کہ انہوں نے اپنا الگ وطن بنا لیا تھا۔ میرے دل و دماغ سے مذہب نکل گیا۔ میں نہ ہندو رہا نہ سکھ نہ مسلمان۔ اپنے بیٹوں کی موت نے پہلے ہی میرا دماغ خراب کر رکھا تھا۔

پانچ چھ سال تک میں نے اور میرے باپ نے دِلّی میں اپنا کاروبار خوب چلا لیا۔ میرے دماغ میں جو انقلاب پسندی تھی وہ اور زیادہ ہو گئی۔ میں مذہبی علوم کا مطالعہ پہلے سے زیادہ کرنے لگا۔ میرے باپ نے تجارتی حلقوں میں اچھا نام پیدا کر لیا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے تجارتی حلقوں میں یہ مسئلہ اکثر بحث کا موضوع بنا رہتا تھا کہ پاکستان کو تجارتی سطح پر کس طرح نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ ہماری حکومت بھی اسی لائن پر سوچتی رہتی تھی۔ ہماری حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی صنعت و تجارت کا ایک وفد دُنیا کے پسماندہ مُلکوں میں بھیجا جائے اور ہندوستانی مال کی منڈی بنائی جائے۔ میں چونکہ گریجوئیٹ تاجر تھا اس لئے مجھے بھی اس وفد میں شامل کر لیا گیا۔ ہم سب سے پہلے مسلم ممالک میں گئے۔

میری خواہش تھی کہ خانہ کعبہ دیکھوں لیکن پتہ چلا کہ وہاں کے شہر میں کسی غیر مسلم کو جانے کی اجازت نہیں۔ اُس وقت تک اسلام میرے خیالوں پر غالب آ گیا تھا۔ ہمارا وفد جدّہ میں تھا تو میری ملاقات ایک مسلمان عالم سے ہوئی۔ وہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اس اتفاقیہ ملاقات نے میری زندگی کا رُخ پھیر دیا۔ تین چار دنوں میں ہی اُنہوں نے اسلام کو میری رگ رگ میں اُتار دیا۔ یہ عالم دس سال سے جدّہ میں ہی رہتے تھے اور ہر سال حج کرنے جاتے تھے۔ میں نے اُن کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اُنہوں نے میرا نام دینا ناتھ سے دین محمد رکھ دیا اور مجھے کہا کہ میں اگر جدّہ میں ہمیشہ کے لئے رہنا چاہوں تو وہ میرے لئے نوکری یا کاروبار کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں۔ دِلّی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ میرے دو بیٹے مارے جا چکے تھے اور میری بیوی نیم پاگل ہو گئی تھی اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ وفد جب آگے جانے لگا تو میں نے جانے سے انکار کر دیا۔

یہ سنانے کی ضرورت نہیں کہ مَیں نے جدہ میں کس طرح شہرت حاصل
کی اور میرے محترم مُرشد نے مجھے وہاں کس طرح آباد کیا۔ صرف یہ بتا دیتا
ہُوں کہ جب عربوں کو پتہ چلا کہ میں تعلیم یافتہ اور مال دار تاجر ہوں اور میں
نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے تو اُنہوں نے میری بہت
مدد کی۔ اب میں جدہ میں تو نہیں لیکن جہاں بھی ہوں مَیں عرب مسلمان
کہلاتا ہوں کیونکہ میں عربی عربوں کی طرح بولتا ہُوں۔ پاکستان اور ہندوستان
کے مسلمان جو یہاں رہتے ہیں وہ مجھے ہندوستانی مسلمان کہتے ہیں۔ اللہ کا
بڑا کرم ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ کئی محتاجوں کی روزی کا ذریعہ
بنا ہُوا ہُوں۔

اب میں آپ کو اصل کہانی سناتا ہوں۔ یہ کہانی اُس دَور کی ہے
جب میں دینا ناتھ ہُوا کرتا تھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں جنون اور خبط
کی حد تک انقلاب پسند تھا۔ اُس دَور میں انگریزوں نے یہ کبھی سوچا بھی نہ
تھا کہ انہیں اس ملک سے نکلنا پڑے گا۔ ہندوستان پر ان کی گرفت
پوری طرح مضبوط تھی۔ سیاسی لیڈر سیاسی میدان میں بیان بازیاں کرتے
رہتے تھے۔ کچھ مغز پھرے مجھ جیسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ انگریز بیان
بازیوں کے ذریعے ہمیں آزادی نہیں دے گا۔ ہم لوگ مسلح اور زمین دوز
کارروائیاں کرنے کے قائل تھے۔ یہ سب میری طرح پڑھے لکھے اور
گریجویٹ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت
ناکام رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انگریز فوجی لحاظ سے اتنا مضبوط ہو گیا تھا کہ اسے
کھلے میدان کی جنگ میں شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔
انگریز کو زمین دوز تباہ کار کارروائیوں سے پریشان کیا جا سکتا تھا۔
یہ وہ لوگ تھے جنہیں انگریزوں نے اپنی زبان میں TERRORIST
یعنی دہشت پسند کہا تھا۔ ان ہندوستانی نوجوانوں نے چند ایک الگ
الگ گروہ بنا لئے تھے۔ آپ نے بھگت سنگھ اور دت کے نام تو سُنے

ہوں گے۔ یہ بھی ایسے ہی ایک دہشت پسند گروہ کے افراد تھے۔ ہر
گروہ نے اپنا اپنا نام رکھ لیا تھا۔ ان میں "ریشمی رومال تحریک" زیادہ
مشہور ہوئی تھی۔

جس طرح میں انقلابی ذہن کا نوجوان تھا، اسی طرح میرے تین چار
انقلاب پسند دوست تھے۔ ہم جذباتی بھی تھے۔ انگریزوں کو دیکھ دیکھ کر
ہم کُڑھتے رہتے تھے۔ ہم سات آٹھ لڑکوں نے اپنا ایک گروہ بنا لیا۔ میں
اُس وقت لاہور میں تھا۔ میں بی۔ اے پاس کر چکا تھا اور میری شادی
بھی ہو گئی تھی۔ میرے گروہ میں پانچ مسلمان اور چار ہندو تھے۔ جہلم چونکہ
میرا آبائی شہر تھا، اس لئے وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ دو دوست جہلم شہر
کے بھی میرے گروہ میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں اپنے طور پر پہلے ہی
اپنے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ وہ ایک منصوبے پر کارروائی کرنا چاہتے
تھے لیکن انہیں ساتھی نہیں مل رہے تھے۔

آپ کو معلوم ہو گا کہ جہلم ایک چھاؤنی ہے۔ انگریزوں کے دَور میں یہ
بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ میرے جہلم والے دوستوں نے یہ پروگرام بنایا تھا
کہ وہاں کی ایک میگزین کو دستی بم سے اُڑانا ہے۔ فوج میں میگزین اُس
سٹور یا گودام کو کہتے ہیں جہاں ہر طرح کا اسلحہ بارُود رکھا ہُوا ہوتا ہے۔ اس
پر دن رات مسلح سپاہیوں کا بڑا سخت پہرہ ہوتا ہے۔ جہلم میں ایسی ہی
ایک میگزین تھی جسے اُڑانے کے لئے میرے جہلم والے دوستوں نے
یہاں تک انتظام کر لیا تھا کہ فوج کے ایک سکھ حوالدار کے ساتھ
گہری دوستی پیدا کر لی تھی۔ وہ سکھ بھی دہشت پسند ذہن کا تھا۔ اُس نے
میرے دوستوں سے کہا تھا کہ جب میگزین پر اُس کی گارڈ ڈیوٹی لگے گی
تو وہ میرے دوستوں کو بتا دے گا اور رات کو میگزین تک پہنچا دے
گا۔ میرے دوستوں نے دو دستی بم بھی کہیں سے حاصل کر لئے تھے۔ اُنہوں
نے یہ پروگرام مجھے بتایا اور کہا کہ میں اُن کا ساتھ دوں۔ مجھے اُن کا یہ
پروگرام بہت پسند آیا۔

میں واپس لاہور گیا اور اپنے گروہ کے ساتھیوں کو یہ ساری پلاننگ بتائی۔ دو مسلمان نوجوان میرے ساتھ جہلم چلنے کو تیار ہو گئے۔ میرے ہندو ساتھی مُنہ موڑ گئے۔ میں نے ایک بنگالی سے ایک پستول خرید لیا تھا جو میں نے بغیر لائسنس اپنے گھر رکھا ہُوا تھا۔ میرے مسلمان دوستوں نے خنجر رکھے ہُوئے تھے۔ میں نے ان دونوں سے کہا تھا کہ جہلم میں ان کی رہائش کا میں بڑا اچھا انتظام کر دوں گا۔

ایک روز ہم تینوں جہلم پہنچ گئے۔ وہاں سے صرف ایک ہندو جس نے سکھ حوالدار کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا تھا ہماری پارٹی میں شامل ہُوا۔ اس طرح ہماری پارٹی میں دو ہندو اور دو مسلمان شامل تھے۔ ہمارے جہلم والے دوست نے ہمیں وہ میگزین دُور سے دکھائی۔ دو دنوں بعد ہمارے اس دوست نے ہمیں کہا کہ کل رات گیارہ بجے سکھ حوالدار نے جو جگہ اُسے بتائی ہے اُسے وہاں پہنچنا ہے۔ ہم چونکہ جذباتی اور انقلابی ذہن کے تھے اور ہماری کوئی ٹریننگ نہیں تھی اس لئے ہم اس کام کو بہت آسان سمجھ کر بہت خوش ہوتے لیکن خدا نے اُسی رات ہمارے پروگرام پر پانی پھیر دیا بلکہ آپ یوں کہیں کہ خدا نے ہمارے پروگرام پر سیلاب پھیر دیا۔ اُس رات دریائے جہلم میں سیلاب آ گیا۔

۱۹۲۳ء کے وقت کے لوگ ابھی زندہ ہوں گے۔ انہیں اُس سال کا وہ سیلاب یاد ہو گا۔ بوڑھے بزرگ کہتے تھے کہ اس سے پہلے ایسا سیلاب کبھی نہیں آیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے آج تک ایسا سیلاب نہیں دیکھا۔ جہلم کے لوگ اس سیلاب کو تا قیامت نہیں بھول سکیں گے۔ دریا کے کنارے تو شہر کا کوئی مکان بچا ہی نہیں تھا۔ آدھا شہر سیلاب کی زد میں آ گیا تھا۔ یہ سیلاب نہیں اللہ کا قہر تھا۔

چار پانچ دن بعد سیلاب کا زور ٹوٹ گیا۔ سکھ حوالدار کی گارد کی ابھی مزید دو دن ڈیوٹی میگزین پر تھی۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ خدا نے سیلاب بھیج کر ہمارے لئے بڑا اچھا موقع پیدا کر دیا تھا۔ فوج سیلاب کے متاثرہ شہری

اور دیہاتی علاقوں میں چلی گئی تھی۔ اس طرح فوج کی توجہ اُس طرف ہو گئی تھی۔

سکھ حوالدار نے ہمیں اگلی رات گیارہ بجے کا وقت دیا اور جگہ بھی بتا دی۔

ہم چاروں دوست دو دستی بم کپڑوں کے اندر چھپائے مقررہ وقت سے کچھ پہلے گھر سے چلنے لگے تو ہمارا چوتھا دوست جو ہندو تھا نہیں پہنچا تھا۔ ہم نے اس کا انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا۔ ہم اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ہم تینوں، دو مسلمان اور ایک ہندو یعنی مَیں چل پڑے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جس نے پلاننگ کی تھی اور جس نے ہمیں لاہور سے بلایا تھا، وہی غائب تھا۔ ہمیں مقررہ جگہ معلوم تھی۔ ہم وہاں پہنچ گئے لیکن سکھ حوالدار وہاں نہیں تھا۔ میرے ایک مسلمان دوست نے کہا کہ بھائیو یہ کوئی چکر معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا اصل ساتھی بھی غائب ہے اور سکھ حوالدار کا بھی پتہ نہیں۔

میں ان سب میں زیادہ جوشیلا تھا۔ میں نے کہا کہ ہمیں کوئی دھوکہ نہیں دے گا۔ سکھ حوالدار پر تو مجھے پورا بھروسہ تھا۔ اتنے میں سکھ حوالدار آ گیا۔

"میرے دوستو!" —— سکھ نے گھبرائے ہُوئے لہجے میں کہا —— "میں بڑی مشکل سے مُہلت نکال کر آیا ہوں۔ تم جن قدموں سے آئے ہو انہی قدموں واپس چلے جاؤ۔"

"کیوں سردار جی؟" —— میں نے کہا —— "بس اتنی سی یاری تھی معلوم ہوتا ہے تمہیں حوالداری زیادہ پیاری ہے۔"

"تمہارا چوتھا ساتھی کہاں ہے؟" —— سکھ حوالدار نے پوچھا ——

"وہ جو شیر بنا پھرتا تھا۔"

"اُسے گولی مارو سردار جی" —— میرے ایک مسلمان دوست نے کہا —— "ہم تین کافی ہیں۔"

"اُسے کوئی گولی نہیں مار سکتا" —— سکھ حوالدار نے کہا —— "اُس نے تم سب کو گولی مروانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ

مجھے وقت سے پہلے پتہ چل گیا ہے۔ ہمارے انگریز میجر کمپنی کمانڈر نے ہمیں آج دن کو کہا تھا کہ ملک میں دہشت پسندوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس میگزین پر بھی حملہ ہوگا۔ اگر میگزین تک کوئی دہشت پسند پہنچ گیا تو تمام گارد کا کورٹ مارشل ہوگا۔ تین چار راتیں صرف سنتری نہیں بلکہ پوری گارد جاگتی رہے۔ میجر صاحب کے حکم سے میگزین پر ڈبل سنتری لگا دیئے گئے ہیں۔ میں نے شام کو تمہارے غیر حاضر دوست کو دُور سے دیکھا تھا۔ وہ ہمارے میجر صاحب کے دفتر سے نکل رہا تھا۔ کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ یہ مُخبری اُس نے کی ہے اور اُس نے انگریز بادشاہ سے جھولی بھر کر انعام لیا ہوگا۔ وہ ہم سب کو پہلے ہی پکڑوا سکتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں عین موقعہ پر پکڑوانا چاہتا ہے۔ میرے پاس اب وقت نہیں، تم بھاگو۔"

ہم وہاں سے کھسک آئے۔ دوسرے دن ہم اُس دوست سے ملے جو رات غیر حاضر تھا۔ اُس نے اپنی غیر حاضری کی وجہ یہ بتائی کہ شام کو اُس کے پیٹ میں ایسا مروڑ اُٹھا کہ وہ چارپائی سے ہلنے کے بھی قابل نہ رہا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں گزشتہ رات میگزین کی طرف روانگی سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اُس کے گھر گیا تھا۔ اُس کے باپ نے بتایا تھا کہ وہ شام سے بہت پہلے کا گھر سے نکلا ہُوا ہے اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اُس کے جھوٹ کا دوسرا ثبوت یہ تھا کہ اُس کے چہرے پر مجھے بیماری کے اتنے شدید حملے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم تینوں دوست پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ ہم باتوں باتوں میں اُسے شہر کے اُس علاقے میں لے گئے جسے سیلاب نے کھنڈر بنا کر ویران کر دیا تھا۔

اُس نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ میگزین کو تباہ کرنے کا نیا پروگرام بنانا ہے۔ کہیں دُور چل کر بیٹھتے ہیں۔ ہم ایک مکان کے کھنڈر کے اندر چلے گئے۔ اندر جا کر میں نے پیچھے

سے اُس کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لی اور خوب دبائی۔ میرے مسلمان ساتھیوں نے اُس کے پیٹ میں بڑی زور زور سے گھونسے مارے۔ ایک منٹ میں وہ مر گیا۔ ہم وہاں سے نکل آئے۔

اب ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ میگزین کو تباہ کریں یا یہ خیال ذہن سے نکال دیں۔ سکھ حوالدار کے ساتھ بات کرنا بہت ضروری تھا لیکن دو دن تک اُس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تیسری رات کا واقعہ ہے کہ میرے دونوں مسلمان ساتھی میرے گھر آئے۔ اتفاق سے انہیں ہم نے مسلمانوں کے ایک ایسے گھر میں ٹھہرایا تھا جن کا تعلق پولیس کے ساتھ بھی تھا۔ انہیں وقت سے پہلے پتہ چل گیا کہ ہمارے مقتول دوست کو ایک ہندو اور دو مسلمانوں نے جو لاہور سے آئے ہوئے ہیں قتل کیا ہے۔ صبح تک پولیس ان تینوں کو گرفتار کر لے گی۔ میرے یہ دونوں مسلمان دوست مجھے بتائے بغیر رات ہی رات بھاگ کر لاہور پہنچ سکتے تھے لیکن اُن کی وفاداری دیکھو کہ میرے بغیر وہ نہ گئے۔ وہ میرے پاس آ گئے اور کہنے لگے کہ گھر سے نکلو اور ہمارے ساتھ چلو۔

میں آپ کو تفصیل سے نہیں سُنا رہا کہ پولیس کو ہمارا سراغ کس طرح ملا تھا اور میرے مسلمان دوستوں کو کس طرح بروقت علم ہو گیا۔ اگر میں یہ تفصیل سنانے لگوں تو یہ کہانی بہت ہی لمبی ہو جائے گی۔

میں گھر والوں کو بتائے بغیر ان دوستوں کے ساتھ نکل کھڑا ہُوا۔ میں اُس وقت پکا ہندو ہُوا کرتا تھا لیکن میرے سینے پر نقش ہو گیا کہ میرے اپنے ہندو بھائی نے مجھے اتنا بڑا دھوکہ دیا ہے جس کا انجام سزائے موت تھا لیکن مسلمان دوستوں کو میری جان کا اتنا خیال تھا کہ میرے بغیر وہ فرار نہ ہوئے۔

ہم سوچنے لگے کہ کہاں جائیں۔ میں نے کہا کہ لاہور گئے تو پولیس وہاں بھی پہنچ جائے گی۔ تمہارے ایڈریس تو یہاں کسی کو معلوم نہیں۔ میرا ایڈریس معلوم کرنا پولیس کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ تم اگر لاہور چلے جاؤ

تو بچ بچا سکتے ہو۔ میں نہیں بچ سکتا۔ بہتر ہے کہ تم لاہور جاؤ۔ میں کہیں اور نکل جاتا ہوں۔

میرے ان مسلمان دوستوں نے قسم کھا کر کہا کہ ہم تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ تمہارے ساتھ رہیں گے۔ ہم نے دریا کے ساتھ ساتھ کشمیر کی طرف نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نوجوانی کا دور تھا۔ ہم عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ سوچتے تھے۔ ہم نے کوئی خاص پلاننگ نہ کی اور رات کو ہی دریا کے کنارے کنارے شمال کی طرف چل پڑے۔ پندرہ سولہ میل دور نکل گئے۔ سیلاب اتر گیا تھا۔ کیچڑ اور پھسلن تھی۔ صبح کی اذانوں کے وقت ہم ایک بیڑی پتن پر پہنچ گئے۔ چھوٹی سی ایک کشتی جس میں پار جانے والے دو چار دیہاتی بھی ہمارے ساتھ بیٹھے تھے جانے کو تیار کھڑی تھی۔ دریا میں ابھی تک جوش و خروش تھا۔ ہمیں پار جانا تھا لیکن دریا ہمیں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ دو ملاحوں نے بہت زور لگا کر کشتی پار لگائی۔

کشتی میں جو دیہاتی مسافر جا رہے تھے، وہ کسی پیر کی باتیں کر رہے تھے اور اس کی ایسی ایسی کرامات سناتے تھے جن پر کم از کم میں یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ یہ پیر ہر طرح کی مراد پوری کرتا ہے اور بے اولاد عورت صرف ایک بار سلام کرنے چلی جائے تو اس کی گود ہری ہو جاتی ہے۔ میرا ایک مسلمان ساتھی بڑا سخت پیر پرست تھا۔ حالانکہ وہ ایف۔ اے پڑھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ چلو اس پیر کو سلام کرنے چلتے ہیں اور اس سے مدد مانگتے ہیں۔ میں نے اس لئے اس کی مخالفت نہ کی کہ وہ برا منائے گا حالانکہ پیر پرستی کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

کشتی سے اتر کر ہم نے ملاحوں کو پیسے دیئے اور دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف چل پڑے۔ پانچ چھ میل دور گئے تو وہاں میلے کا سماں دیکھا۔ وہ کچے کچے مکانوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ایک مکان پر ہم نے بہت سے سبز جھنڈے لہراتے دیکھے۔ بے شمار لوگ وہاں گھوم پھر رہے تھے۔ ہمیں اب بھوک نے بھی ستانا شروع کر دیا تھا۔ ہم نے وہاں کچھ چھابڑیوں

والے بھی دیکھے۔ کچھ کھانے پینے کے لئے ہم ادھر ہی چلے گئے۔ وہاں سے پکوڑے اور جلیبیاں مل گئیں۔ میرا ایک ساتھی تنور سے روٹیاں بھی لے آیا۔

ہم جب کھا پی چکے تو میرا پیر پرست دوست ضد کرنے لگا کہ چلو پیر صاحب کو سلام کرتے ہیں۔ ہم اس کا دل رکھنے کے لئے اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ کچا سا ایک مکان تھا۔ لوگوں نے اس مکان کے سامنے اور ڈیوڑھی میں ہجوم کر رکھا تھا۔ پیر کے کوئی خاص مرید تھے جو ہر کسی کو اندر نہیں جانے دے رہے تھے۔ ہمیں ڈھولکی اور چمٹا بجنے کی آواز باہر سنائی دے رہی تھی۔ لوگوں کی عقیدت مندی دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی برگزیدہ پیر معلوم ہوتا ہے۔

ہم دروازے تک پہنچے تو ایک آدمی نے ہمیں روک کر پوچھا کہ کیا کام ہے؟ میرے پیر پرست دوست نے کہا کہ کام کچھ بھی نہیں صرف سلام کرنا ہے اور پیر صاحب کے پاؤں چھو کر واپس آ جائیں گے۔ اس نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اس کمرے میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک آدمی ڈھولکی اور دوسرا چمٹا بجا رہا تھا۔ ہم اگلے کمرے میں چلے گئے۔ سامنے فرش پر گدے اور پھولدار چادریں بچھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ تکیے لگے ہوتے تھے۔ ایک آدمی بیٹھا تھا جس کا رنگ گندمی تھا لیکن بڑا ہی تندرست آدمی تھا۔ وہ اچھا خاصا پہلوان لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی خوب پھبتی تھی۔ میرے پیر پرست دوست نے تو اس کے آگے باقاعدہ سجدہ کیا۔ پیر کے ہاتھ چومے۔ ہم دونوں نے بھی ویسے ہی کیا۔ پیر نے جلالی سے لب و لہجے میں پوچھا، کہاں سے آتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہم لاہور سے صرف آپ کو سلام کرنے آئے ہیں۔ پیر بہت خوش ہوا۔ اس نے ہمیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی عورت روتی ہوئی اندر آئی۔

"آ گئی ہو اپنے بھائیوں کو موت سے بچانے کے لئے؟" ۔۔۔ پیر

نے اُس کی مراد سُننے سے پہلے ہی کہا۔

عورت کچھ دیر تو حیرت سے پیر کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی ——"یا سرکار! میں نے تو بتایا ہی نہیں کہ میں کیوں آئی ہوں"۔

"تم جب گھر سے نکلی تھیں تو میں نے تمہاری صورت دیکھ لی تھی" پیر نے کہا —— "میرے اندر سے آواز آئی تھی کہ اس عورت کے دو بھائیوں کو سزائے موت کا حکم ہو گیا ہے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اُنہوں نے ایک انسان کو قتل کیا ہے۔ وہ انسان بھی انہی جیسا تھا"۔

عورت بچّوں کی طرح رونے لگی اور کہنے لگی کہ سرکار میرے یہی دو بھائی ہیں۔ میں اپنا پورا زیور آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی۔ انہیں پھانسی سے اُتار لیں۔

"تم اگر اپنی جان بھی دے دو تو بھی وہ بچ نہیں سکتے" —— پیر نے کہا۔

پیر کے پاس دو آدمی بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ اُٹھے اور عورت کو دھکیلتے ہوتے باہر لے گئے۔ ہم وہیں بیٹھے رہے کیونکہ میرا پیر پرست دوست وہاں سے اُٹھنے پر ابھی راضی نہیں تھا۔ ذرا ہی دیر بعد ایک اور عورت اندر آئی جو دراصل ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے ساتھ مریل سا ایک آدمی تھا جو اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا۔ پیر نے اس لڑکی کو دیکھتے ہی جلالی لہجے میں کہا —— "جا، دوسرا خاوند کر لے۔ یہ خاوند تیری گود ہری نہیں کر سکتا"۔

خاوند پیر کے پاؤں پر گر پڑا۔ پیر کے اپنے ایک آدمی نے پیر سے کہا —— "سرکار! اس بے چارے کے حال پر رحم کریں۔ آپ کے دربار میں کس چیز کی کمی ہے!"

پیر نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہت دیر بعد آنکھیں کھولیں اور نشئی سے لہجے میں بولا —— "موکل (جن) رات کو آئیں گے۔ اسے رات کو لانا" —— اور اُس نے دونوں کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

خاوند اپنی بیوی کو ساتھ لے گیا۔ میں نے اپنے دوستوں کو اُٹھنے اور چلنے کا اشارہ کیا جو اس پیر نے دیکھ لیا۔ اُس نے جلالی انداز میں اشارہ کیا کہ ہم بیٹھیں رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت کو دو آدمی اندر لاتے۔ انہوں نے بھی پیر کے قدموں میں سجدہ کیا اور ایک نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ اس عورت پر جنات کا قبضہ ہے۔ وہ عورت چہرے پر اُداسی اور پریشانی کے آثار لئے ہوتے چُپ چاپ بیٹھی پیر کو دیکھ رہی تھی۔ پیر نے اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ سانولے رنگ اور نہایت معمولی قسم کے نقش و نگار والی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پیر اس عورت کو نہیں کہے گا کہ چونکہ اُس کے جن رات کو آتے ہیں اس لئے وہ رات کو آتے۔

پیر نے حکم دیا —— "انگیٹھی لاؤ"۔

دو آدمی دوسرے کمرے کی طرف اُٹھ دوڑے۔ وہ جب واپس آتے تو ایک کے ہاتھ میں انگیٹھی کی بجائے پانی سے بھری ہوئی سلابچی تھی جو اُس نے پیر اور سائلوں کے درمیان رکھ دی۔ پیر نے آنکھیں بند کر کے مُنہ ہی مُنہ میں کچھ کہا جو ہم نہ سمجھ سکے۔ اچانک پیر نے فرش پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ دھماکے سے ہم سب بدک گئے۔ پھر پیر جس گدّی پر بیٹھا ہُوا تھا اُس پر بڑی تیزی سے ہاتھ پھیرنے لگا اور کچھ بڑبڑاتا بھی رہا۔ اُس نے عورت کو پانی والی سلابچی کے قریب بٹھا لیا اور تھانیداروں کے رُعب سے بولا —— "اوئے! ادھر دیکھ اوئے" —— عورت نے سر اُٹھا کر پیر کی طرف دیکھا۔ پیر نے سلابچی کی طرف اپنا ہاتھ زور سے جھٹکا۔ پانی کی سطح پر بے شمار شرارے اُٹھے۔ عورت اور اُس کے ساتھ کے آدمی جو سلابچی کے قریب بیٹھے ہوتے تھے اُچھلے اور پیچھے جا پڑے۔

پیر نے عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے بڑے رُعب سے کہا —— "اِدھر آ اوئے، کہاں سے آیا ہے تُو؟ تُو جانتا نہیں یہ کس کی ولایت ہے؟ جو پانی کو آگ لگا سکتا ہے وہ تجھے خشک لکڑی کی طرح

جلا دے گا" ـــــ پیر نے عورت کے ساتھ کے آدمیوں سے کہا ـــــ "جاؤ، لے جاؤ اسے۔ اگر یہ کافر پھر تمہارے گھر آیا تو میرے پاس آجانا۔"

ایک آدمی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب سے ہاتھ نکال کر پیر کے گھٹنے کے نیچے لے گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے پیر کے گھٹنے کے نیچے اُس کا نذرانہ رکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ اُس نے کتنے پیسے رکھے تھے۔

میں وہاں بیٹھے بیٹھے تنگ آگیا۔ میں نے پیر صاحب سے کہا کہ ہمیں جانے کی اجازت دیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں ہندو ہوں۔

"میرے پاس وقت نہیں ہوتا کہ کسی کو اپنے پاس بٹھاؤں" ـــــ پیر نے کچھ اور ہی کیفیت میں ہم سے کہا ـــــ "لیکن میں تم تینوں کو کچھ دیر بٹھانا چاہتا ہوں۔ تم تینوں مجھے تعلیم یافتہ لگتے ہو۔ انگریزی تعلیم نے یہاں کے لوگوں کے دماغ خراب کر دیئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کو کچھ بتاؤں اور سمجھاؤں تاکہ ہمارا مذہب خراب نہ ہو۔ میری جو کرامات تم نے دیکھی ہیں یہ اللہ کی دین ہے۔ اللہ میرا دوست ہے۔ میں یہاں اپنے اللہ کے اشارے پر دریا کے کنارے ایک خاص قسم کی عبادت کے لئے آیا تھا لیکن یہ دیہاتی لوگ بے چارے اپنے مسئلوں اور مصیبتوں میں اس طرح پھنسے ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی مددگار نہیں۔ انہیں معلوم نہیں کس نے میری کرامات کی خبر دے دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دُور دُور سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میں نے ان لوگوں کی خاطر اپنی عبادت قربان کر دی ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ راہ مولا کر رہا ہوں۔ تم جیسے پڑھے لکھے نوجوان ان باتوں میں یقین نہیں رکھتے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنے اللہ کے ان کرشموں کو دیکھو اور لوگوں کو بتاؤ کہ انگریزی تعلیم سے اور انگریزی دوائیوں سے بچو۔ انگریزی دوائیوں میں انگریزوں نے ایسا اثر ملا دیا ہے جس سے دل سے ایمان نکل جاتا ہے۔"

اُس نے اس طرح بہت سی لمبی چوڑی باتیں کیں۔ ہم نے اُسے روکا ٹوکا نہیں، نہ کوئی سوال کیا، اس لئے اُس کی زبان بے لگام ہو کر بولتی چلی

گئی۔ میں تین مذہبوں کا گہرا مطالعہ کر چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت سی بے بنیاد اور خلافِ عقیدہ باتیں کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ یہ شخص ایک اُستاد، فریب کار اور عیار ہے۔ اُس نے زیادہ زور انگریزی دوائیوں پر دیا۔ اس سے اُس کا مطلب یہ تھا کہ لوگ کسی بھی بیماری کا علاج دوائیوں سے نہ کرائیں اور ہر بیماری کو وہ شر شرار یا آسیب سمجھ کر اُس کے پاس آجایا کریں۔

میں آپ کو آدھی صدی پہلے کی کہانی سنا رہا ہوں جب انسان پیدل چلتا تھا۔ ہوائی جہاز نیا نیا آیا تھا اور اس کی انتہائی رفتار ایک سو میل تھی۔ آج انسان اتنی تیز رفتار سے چاند تک پہنچ گیا ہے جو تصور میں بھی نہیں آسکتی لیکن پاکستان اور ہندوستان میں پیروں اور پنڈتوں کی فریب کارانہ سائنس ابھی تک چل رہی ہے۔ پاکستانی اور ہندوستانی مسلمان مشرقِ وسطیٰ اور انگلینڈ میں لاکھوں کی تعداد میں پہنچ گئے ہیں۔ اب پیر بھی وہاں جا پہنچے ہیں۔ اس لحاظ سے میری یہ آپ بیتی قدیم ہوتے ہوئے بھی جدید ہے۔

"تم نے دیکھا ہے یہ کیا قیامت کا سیلاب آیا تھا" ـــــ پیر نے ہمیں لیکچر دیتے ہوئے کہا ـــــ "میں جب یہاں آیا تو میں نے لوگوں کو خبردار کر دیا تھا کہ یہاں سے تین چار دن کے لئے نکل جاؤ۔ اللہ کا قہر آرہا ہے۔ اب تم خود دیکھ رہے ہو کہ اس گاؤں کا ایک بچہ بھی سیلاب میں ضائع نہیں ہوا اور مکان بھی محفوظ ہیں۔ دراصل یہ سیلاب اس زمین کو دھونے کے لئے آیا تھا جس پر مجھے یہ خاص عبادت کرنی تھی۔ سیلاب گزر گیا ہے۔ اب نہیں آئے گا لیکن اُوپر سے روزانہ لوگ ڈرے سہمے ہوئے میرے پاس آتے اور کہتے ہیں کہ سیلاب پھر آرہا ہے۔ میں انہیں تسلیاں دیتا ہوں کہ اب سیلاب نہیں آئے گا لیکن ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ میں آج ان کی تسلی کے لئے سیلاب کو باندھ رہا ہوں۔ تم تینوں گاؤں میں ہی رہنا۔ معلوم نہیں کس وقت اشارہ ہو جائے اور میں دریا کی طرف چل پڑوں۔ میں جب دریا کی طرف جاؤں تو تم بھی آجانا۔ اس کے بعد اپنے

گھروں کو چلے جانا۔"

ہم وہاں سے آ گئے۔ دُور دُور سے لوگ چلے آ رہے تھے۔ ہمیں اس پیر کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم مفرور دہشت پسند تھے جن کے لئے انگریز بادشاہ نے سزائے موت بغیر مقدمے کے لکھ رکھی تھی۔ ہم چوکنے تھے کہ وہاں سی۔ آئی۔ ڈی وغیرہ کا آدمی تو نہیں۔ ہماری

کوئی منزل نہیں تھی۔ میرے ایک مسلمان دوست نے کہا کہ چلو یہاں سے نکل چلیں لیکن میرا ارادہ کچھ اور ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں جذباتی اور انتہا پسند تھا۔ اس کے ساتھ مذہب کی تعلیم نے بھی میری سوچوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ اس ملک کے لوگ صرف انگریز کے غلام نہیں بلکہ یہ اصل غلام پیروں، پنڈتوں، سنتوں، مہنتوں اور ملاؤں کے ہیں۔ اگر انگریز ہندوستان کو آزاد کر بھی گئے تو یہ فریب کار لوگ اس ملک کے لوگوں کے ذہنوں کو پسماندہ ہی رکھیں گے۔ میں کم از کم اس پیر کو ننگا کرنا چاہتا تھا۔

ہمارا پیر پرست دوست مجھ سے لڑنے پر آ گیا۔ دوسرا مسلمان دوست میرا ہم خیال تھا۔ ہم ایک ہی منزل کے مسافر تھے۔ ہمارا راستہ ایک تھا، اس لئے ہم آپس میں لڑ نہیں سکتے تھے۔ ہم بحث میں اُلجھ گئے۔ دراصل ہم تینوں ہی مغز پھرے تھے۔ ہم نے آپس میں فیصلہ کیا کہ آج رات سچ اور جھوٹ کو سامنے لے آئیں گے۔

ہم ایک جگہ بیٹھے ہوتے تھے۔ اتنے میں گاؤں میں ہڑبونگ مچ گئی۔ معلوم ہُوا کہ پیر صاحب سیلاب کو باندھنے کے لئے دریا پر جا رہے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو دیکھا وہ سیلاب کی طرح دریا کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ پیر نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر بڑی بلند آواز میں دریا سے کہا ——— "اگر تیرا ایک بھی قطرہ کنارے سے باہر آیا تو ہم تجھے آگ لگا دیں گے" ——— پیر کے ہاتھ میں لاٹھی نما عصا تھا۔

اُس نے عصا پانی پر مارا تو وہاں سے شرارے اُٹھے۔ اُس نے عصا اُوپر اُٹھایا تو عصا کے ساتھ شرارے چمک رہے تھے۔ پھر اُس نے بایاں ہاتھ دریا کی طرف جھٹکا تو دریا سے شرارے نکلے۔ پیر نے لوگوں کی طرف دیکھا اور سخت غصے میں بولا ——— "بھاگو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اب یہ دریا اپنے ہی پیٹ میں گم ہو جائے گا۔"

پیر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ لوگ اُس پر مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ہر کوئی جُھک کر اُس کے پاؤں پکڑتا تھا، کوئی اُس کے ہاتھ چُومتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوگ راستے میں لیٹے ہوئے ہیں اور پیر اُن کے اُوپر چلا جا رہا ہے۔

اگر آپ میں سے کوئی صاحب یہ کہیں کہ میں مبالغے سے کام لے رہا ہوں تو لاہور کے شہریوں سے پوچھ لیں کہ جب پچھلے سال پیر سپاہی لاہور ایئرپورٹ پر اُترا تھا تو لاہور کے لوگ کس طرح پاگل ہو کر ایئرپورٹ کی طرف اُٹھ دوڑے تھے۔ میں نے سُنا ہے کہ بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگ بھی ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں اُٹھائے وہاں پہنچ گئے تھے۔ پچاس سال پہلے تو لوگ صحیح معنوں میں ان پڑھ اور پسماندہ تھے۔

ہم تینوں نے لوگوں میں گھوم پھر کر اُن کی باتیں سُنیں۔ لوگ خدا اور رسولؐ کو بھول چکے تھے۔ ایک آدمی کی زبان سے یہ الفاظ بھی ہم نے سُنے کہ یہ ضرور امام مہدی ہے۔ لوگوں کی یہ عقیدت مندی دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا۔

ہم رات کے انتظار میں گھومتے پھرتے رہے کہ ہم نے وہ جوان

عورت جو اولاد لینے آئی تھی اکیلی کھڑی دیکھی۔ مَیں نے جرأت کی اور اس کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھ سے خدا کی قسم لے لو، قرآن کی اور رسولؐ کی قسم لے لو، میں تمہیں اپنی سگی بہن سمجھتا ہوں اور میں تمہاری عزت بچانا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ پیر تمہیں اولاد دے گا؟

"ہاں، ہاں کیوں نہیں دے گا" ——— لڑکی نے بلا جھجک کہا ——— "اتنا

ہٹا کٹا مشٹنڈا آدمی ہے۔ اولاد کیوں نہیں دے گا لیکن مجھے اپنے خاوند کی اولاد چاہئے۔"

میں لڑکی کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ اَن پڑھ ضرور تھی لیکن اُس نے جب باتیں کیں تو میں نے صاف طور پر دیکھا کہ اس کا دماغ روشن ہے اور اسے اپنی عزت اور آبرو کا بہت خیال ہے۔ میں آپ کو وہ ساری باتیں نہیں سناؤں گا جو میرے اور اس کے درمیان ہوئیں۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لیں کہ وہ جانتی تھی کہ کسی پیر کے تعویذ، پھونک اور دَم سے کسی عورت کی گود ہری نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی پیر کسی عورت کو بچہ دیتا ہے تو اُس بچے کا باپ وہ پیر ہی ہوتا ہے۔ اُس نے کہا کہ جب تک وہ اس شخص کی بیوی ہے وہ بچے کی ماں نہیں بن سکتی۔ اس کی ماں یعنی اس عورت کی ساس اُسے تین مختلف پیروں کے پاس لے گئی تھی۔ ہر ایک پیر نے اُسے تنہائی میں آنے کو کہا اور ہر پیر بلندیوں سے اُتر کر بدکار مرد کی پستیوں میں آگیا لیکن یہ لڑکی اپنی عزت بچا کر بھاگتی رہی۔ اب وہ اپنی ساس، سسر اور اپنی ماں کے ڈر سے یہاں آگئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہاں سے کس طرح بھاگے۔

میں حیران ہوا کہ کوئی دیہاتن لڑکی اتنی بے تکلف اور آزاد خیال بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ میری عمر کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ عورت اگر اپنی آبرو اور اپنے ایمان کے تحفظ کے لئے اُٹھ کھڑی ہو تو وہ مردوں کے منہ پھیر دیتی ہے۔ یہ عورت انہی عورتوں میں سے تھی۔ وہ میری ہمدردی اور میرے اخلاق کو سمجھ گئی تھی۔ اُس نے مجھے عجیب سی ترسی ہوئی اور پیاسی نگاہ سے دیکھا اور کہنے لگی کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو؟

میں اس سوال کا جواب دینے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنی مہم آسان ہوتی نظر آئی۔ میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ بات کی اور چند منٹ میں ہم نے ایک پروگرام طے کر لیا۔ میں نے اس لڑکی سے کہا کہ ہم تمہیں دیکھتے رہیں گے۔ تم بھاگنے کی نہ سوچو۔ رات کو تم پیر کے پاس چلی جانا۔ جو کچھ بھی

وہ کہے وہ مان لینا۔ ہم پہنچ جائیں گے اور تمہاری آبرو بالکل محفوظ رہے گی۔

ہم نے پیر کا خفیہ کمرہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ جس مکان میں اُس نے بیٹھک بنا رکھی تھی، اس کے ساتھ ایک ہی کمرہ تھا۔ اس لڑکی کا خاوند کھانے کی کوئی چیز اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر ہم ایک طرف ہٹ گئے۔

ہم نے دن کا باقی حصہ اس لڑکی پر نظر رکھی شام تک باہر کے آئے ہوئے لوگ واپس چلے گئے۔ ہمیں پتہ چلا کہ کچھ لوگ اس گاؤں کے گھروں میں رات بھر کے لئے رُک جاتے ہیں اور یہ سلسلہ گاؤں والوں کے لئے آمدنی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ پھر بھی گلیوں میں روشنی تھی کیونکہ لوگوں نے جگہ جگہ مشعلیں جلا کر رکھی ہوئی تھیں۔ جس مکان میں پیر رہتا تھا اُس کی منڈیر پر لوگوں نے بیسیوں دیئے جلا کر رکھے ہوئے تھے۔ یہ عقیدت مندی کا اظہار تھا۔

ہم نے لڑکی کو پیر کی بیٹھک میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہاں جو دو آدمی دروازے پر کھڑے تھے، انہوں نے اس لڑکی کے خاوند سے کچھ کہا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ ہم نے شام سے پہلے پیر کی بیٹھک کے ساتھ والے کمرے کا پچھواڑا دیکھ لیا تھا۔ دیہات کے لوگ اسی طرح کے کچے کچے اپنے ہی بنائے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ ایک کواڑ کا دریچہ ضرور رکھتے تھے جس کی کوئی مضبوط چٹخنی نہیں ہوتی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم نے جو پروگرام بنایا ہے وہ اس طرح پورا ہو جائے گا جس طرح ہم نے سوچا ہے لیکن مجھے کچھ ایسا یقین تھا کہ ہم ایک بہت بڑے کفر کے خلاف کچھ کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہم کامیاب ہوں گے۔ انسان کوئی گناہ کرنے جائے تو وہ کتنا ہی دلیر کیوں نہ ہو اُس کے دل پر ایک خوف چھایا رہتا ہے۔ میرے دل میں خوف کی بجائے جرأت آگئی تھی۔ جرأت کا اندازہ تو آپ اس سے ہی کر سکتے ہیں کہ ہم انگریزوں کا بارُود خانہ تباہ کرنے کے لئے چل پڑے تھے اور ان کے مخبر کو ہم قتل کر آئے تھے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں حماقت کی حد تک دلیر تھا۔ یہی حال میرے دونوں مسلمان دوستوں کا تھا۔

ہم اُس مکان کے پچھواڑے چلے گئے اور میں نے دریچے کے کواڑ کے ساتھ کان لگاتے لیکن میں نے دیکھا کہ لکڑی کے ایک چھوٹے سے کواڑ میں چھوٹی انگلی جتنی چوڑی درز تھی۔ میں نے درز میں سے جھانکا۔ پیر صاحب کو میں نے صرف ایک قمیض میں دیکھا۔ اُس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ شراب کے نشے میں ہے۔ وہ لڑکی کو شراب دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے کپڑے نوچ رہا تھا۔ لڑکی ڈری سہمی ہوئی اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے رہی ہو گی کہ میں وعدے کے مطابق ابھی تک نہیں پہنچا۔ پیر نے بدمستی میں لڑکی کی قمیض پھاڑ ڈالی۔

میں جوتشی نہیں تھا کہ مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ اس کمرے میں کیا ہو گا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب کوئی عورت پیر کے پاس اپنی مُراد لے کر جاتی ہے تو وہاں کیا ہوتا ہے۔ میرے پاس پستول تھا۔ ایک خنجر بھی تھا۔ ایک ایک خنجر میرے دونوں دوستوں کے پاس تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور دونوں ہاتھوں کا گھونسہ بنا کر ہتھوڑے کی طرح کواڑ پر مارا۔ کواڑ دھماکے سے کُھل گیا۔ دریچہ اتنا کُھلا تھا کہ ایک آدمی آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں اندر گیا۔ پیر نے بدک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے پستول کی نالی اُس کی طرف کر دی اور اپنی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی جو اُس کے لئے اشارہ تھا کہ وہ آواز نہ نکالے۔ میرے پیچھے میرے دونوں دوست دریچے میں سے کود آتے۔ ایک پستول اور تین خنجر دیکھ کر پیر کا نشہ اُتر گیا اور اُس کی کرامات بھی جواب دے گئیں۔ بیٹھک کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔

پیر نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اُس کی ہنسی فوراً غائب ہو گئی۔ دھیمی سی آواز میں اُس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟

"ہم پٹیالہ جیل سے بھاگے ہوتے ڈاکو ہیں" ——میں نے جواب دیا اور پوچھا —— "تم بتاؤ، تم کیا ہو؟ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمارے پیشہ ور بھائی

ہو۔ اگر جھوٹ بولو گے تو تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش دریا میں پھینک دیں گے۔"

اس نے شراب کی بوتل کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "خنجر اندر کر و یار! یہ لو دو دو گھونٹ پیو" —— اُس نے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "یہ بھی تمہارا ہی مال ہے۔"

"ہم تو پورا مال لیں گے" —— میرے ایک مسلمان دوست نے کہا —— "اب تک جو کچھ کمائی کی ہے ہمارے آگے رکھ دو۔"

اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ کہنے لگا —— "کچھ رحم کرو۔ جائز حصّہ لے لو اور یہاں سے کھسکو۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہارا ہی بھائی ہوں۔ میں نابھہ جیل سے بھاگا ہُوا ہوں۔ پیشی کے لئے عدالت میں لے گئے تھے۔ میں ہتھکڑی سمیت بھاگ نکلا۔"

اُس کے ساتھ اسی طرح باتیں کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی میں چارپائی کی ادوائن (رسّی) نکالتا رہا۔ وہ اُستاد تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ چارپائی کی ادوائن کا ہم کیا بنائیں گے۔ اُس نے ہماری منّت سماجت کی۔ میں نے اُسے کہا کہ اپنی یہ اُستادی ہمیں سمجھاؤ۔

اس نے کہا کہ استادی میں سمجھا دیتا ہوں۔ تم اُدھر کشمیر کی طرف چلے جاؤ اور یہی چکر چلاؤ۔ تمہارے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگ جائیں گے اور تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوئی جرأت بھی نہیں کرے گا۔ اُس نے اپنی استادی یوں بتائی کہ اُس کے پاس جب کوئی سائل آتا تھا تو اُسے پہلے ہی اُس کی مراد کا پتہ چل جاتا تھا۔ یہ سارا راز اُس ڈھولکی اور چمٹے میں تھا جو ڈیوڑھی میں ہر وقت بجتے رہتے تھے۔ تم جانتے ہو کہ ان دیہاتیوں کے تین چار ہی مسئلے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قتل کرتے ہیں اور پھانسی سے بچنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بے اولاد عورتیں اولاد مانگتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اپنے بیٹے کی شادی کرتے ہیں اور پیروں سے تعویذ لے کر اُسے پلاتے ہیں کہ وہ

اپنی بیوی اور ساس کی بات نہ مانے۔ ایک مسئلہ جوان لڑکیوں کا ہوتا ہے جو اُس جگہ شادی نہیں کرنا چاہتیں جہاں ماں باپ چاہتے ہیں۔

ہم نے چمٹے اور ڈھولکی کی تھاپ اور تال کے اشارے مقرر کر رکھے تھے۔ باہر دروازے پر کھڑا آدمی اندر آنے والے ہر سائل سے پوچھتا ہے کہ پیر صاحب کے ساتھ تمہارا کیا کام ہے۔ جب تک وہ اپنی مراد نہیں بتاتا اُسے اندر نہیں آنے دیا جاتا۔ اس آدمی کے اشارے پر ڈھولکی اور چمٹا پہلے خاص اشارہ دیتے ہیں۔ اس طرح سائل کو دیکھتے ہی مجھے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کیوں آیا ہے۔ اگر اشارہ سمجھنے میں غلطی ہو جاتے اور سائل کہہ بیٹھے کہ وہ تو کسی اور کام کے لئے آیا ہے تو میں اُسے زبان کے ایسے چکر دیتا ہوں کہ میرے مُنہ سے جو نکل جاتا ہے، وہ بھی اُس کی مُراد بن جاتی ہے اور جہاں تک پانی کو آگ لگانے کا تعلق ہے یہ فاسفورس کے پوڈر کا کمال ہے۔ میں نے اس کی خاصی مقدار رکھی ہوتی ہے۔

"اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں" — اُس نے کہا — "کہ تم نہ ڈاکو ہو نہ کسی جیل سے بھاگے ہو۔ تم تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ میں تمہارے خنجروں سے نہیں ڈرتا۔ میں صرف اس لئے ڈرتا ہوں کہ میں مفرور مجرم ہوں اور تم ابھی جا کر شہر سے پولیس کو لے آؤ گے۔"

ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں ادوائن سے باندھ دیئے اور مُنہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا اور پیر کی بیٹھک میں گئے۔ وہاں یہ منظر بنا ہُوا تھا کہ پیر کے چار خاص مرید شراب میں دُھت انتہائی فحش حالت میں ناچ کُود رہے تھے اور دو بڑی خوبصورت عورتیں چیخ چیخ کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ وہ بھی نشے میں تھیں۔ ان کے شور شرابے کا ہمیں یہ فائدہ ہُوا تھا کہ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کا پیر ساتھ والے کمرے میں کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس بے اولاد لڑکی کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ان بدمست غنڈوں نے ہمیں دیکھا تو گالیاں بکنے لگے لیکن پستول اور خنجر دیکھ کر وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ انہیں ہم نے کہا کہ ہم سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی

ہیں۔ تب ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "مائی باپ! سب مال آپ کا ہے۔ آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے۔"

"لاؤ مال نکالو" — میرے مسلمان دوست نے کہا۔

ذرا سی دیر میں ہمارے سامنے زیورات، روپے اور اٹھنیوں کے سکوں اور پانچ پانچ اور دس دس کے نوٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ ساری دولت ان لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی جنہیں اتنا بڑا دھوکا دے کر لی گئی تھی لیکن ہم اس علاقے کے مہاراجے نہیں تھے کہ یہ کام بھی کرتے۔ ہم تو خود مفرور مجرم تھے۔ اتنی دولت دیکھ کر مجھے غشی آنے لگی لیکن میں نے دماغ ٹھکانے رکھا اور دس دس اور پانچ پانچ روپے کے بہت سے نوٹ اُٹھا کر اپنے دوستوں کے حوالے کر دیئے۔ ہمارا جو خطرناک سفر شروع ہو گیا تھا اس کے لئے ہمیں پیسوں کی ضرورت تھی۔ ہمیں وہاں سے بھاگنا تھا۔

ان تینوں سے ہم نے ان کی اصلیت پوچھی تو پتہ چلا کہ ان میں بھی ایک نابھہ جیل کا مفرور ہے اور دو اسی علاقے کے جرائم پیشہ آدمی ہیں۔ ہمیں اب پوری رات گزارنی تھی۔ ہمیں ڈر یہ بھی تھا کہ یہ ایک پورا گروہ ہے۔ یہ سب ہم پر قابو پا سکتے ہیں یا دھوکہ دے کر بھاگ سکتے ہیں۔ ہم تینوں نے انہیں اس دھوکے میں رکھا کہ ہم رشوت قبول کر لیں گے لیکن ہمیں کچھ اور باتیں بھی بتائیں۔

مختصر یہ کہ ان کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہم نے رات گزار دی۔ اس علاقے کے جو تین آدمی تھے انہیں ہم نے کہا کہ ہمیں اس علاقے میں مخبروں کی ضرورت ہے، وہ ہمارا کام کرتے رہیں اور آزاد رہیں۔ اس سودا بازی نے انہیں ہمارا مرید بنا دیا۔ یہ دراصل اللہ کا فضل و کرم تھا کہ ہمارا ہر کام سیدھا ہوتا گیا۔ ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے تھے۔ دوسرے دن صبح صبح ان تینوں غنڈوں کو ساتھ لے کر فاسفورس برآمد کرائی۔ پھر لوگوں کو جمع کیا۔ بندھے ہُوئے پیر کو اُٹھا کر گاؤں کے باہر رکھا۔ لوگوں سے کہا کہ اس کے اُوپر دو تین گھڑے پانی پھینکو۔ فوراً دو گھڑے پانی کے آ گئے۔

ہم نے اپنے ہاتھوں بندھے ہوئے پیر کے اُوپر دونوں گھڑے انڈیل دیئے۔ اپنے ہاتھ خشک کر کے میں نے اُس پر فاسفورس چھڑکی۔ اُس کے جسم پر اور دائیں بائیں زمین پر جہاں پانی گرا تھا شرارے نکلے۔ لوگوں کا ہجوم اِردگرد کھڑا تھا۔ میں نے بلند آواز سے لوگوں سے کہا کہ اسے کہو کہ اس کے ہاتھ میں طاقت ہے تو اپنے آپ کو آزاد کروائے۔

پیر شرارے دیکھ کر بلبلاتا اور چیختا تھا۔ ہم نے اُسے وہیں رہنے دیا اور لوگوں کو دریا کے کنارے لے گئے۔ وہاں بھی فاسفورس پھینکی اور لوگوں کو دکھایا کہ پانی کو کس طرح آگ لگائی جاتی ہے۔ ہم نے پیر کی تمام فریب کاری اور ڈھونگ اور چھٹے کا راز لوگوں کو بتایا لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اکثر لوگ ہمیں قتل کرنے کو دوڑتے تھے کہ ہم نے اُن کے پیر کی بے ادبی کی ہے۔ کچھ تعداد لوگوں کی ایسی بھی جو کہتے تھے کہ یہ کوئی جعلی پیر ہے۔ اگر ہمیں ان لوگوں کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو اس مفرور ڈاکو کے مرید جو ابھی تک اِسے پیر سمجھتے تھے ہمیں قتل کر کے ہمارا قیمہ کر دیتے۔

ہم چونکہ خود مفرور تھے، اس لئے ہمیں وہاں سے کھسکنا تھا۔ اُس لڑکی کا ہمیں خیال ہی نہ رہا جس کے ذریعے ہم نے اتنا بڑا فراڈ بے نقاب کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس کا خاوند اُسے ساتھ لے کر چلا گیا ہو گا یا وہ لڑکی خود ہی بھاگ گئی ہو گی۔ ہم ہجوم میں سے نکلنے لگے۔ پیر کے حمایتی اور مخالف آپس میں اُلجھ رہے تھے۔ ہم نے موقعہ غنیمت جانا اور وہاں سے نکل آئے۔ ایک ہجوم وہاں تھا جہاں پیر زمین پر پڑا تھا۔ ہم اس ہجوم سے پرے پرے گاؤں کے اندر چلے گئے۔ گاؤں بالکل خالی تھا۔ ہر کوئی پیر کا اور نئی صورتِ حال کا تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ صرف ایک آدمی تھا جو ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ وہ لباس اور شکل وصورت سے دیہاتی نہیں لگتا تھا۔ میرے ایک مسلمان دوست نے مجھے کان میں کہا کہ اس شخص کو وہ بہت دیر سے دیکھ رہا ہے۔

میں نے پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ اگر وہ ہمارے تعاقب میں تھا تو وہ

یقیناً سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی تھا۔ ہم گاؤں سے نکل کر اُس علاقے کی طرف چلے گئے جہاں کھڈ زیادہ تھے اور جنگل تھا۔ ہم ایک نشیبی جگہ سے نکل کر ذرا اُوپر پہنچے تو وہ آدمی اچانک ہمارے سامنے آگیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ایک طرف مُڑ گیا۔ میرے ایک مسلمان دوست نے اُسے آواز دے کر بلایا۔ اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ وہ ہمارے تعاقب میں ہے۔ وہ ہنستا ہُوا ہماری طرف آیا۔ میں نے لپک کر اُس کا بازو پکڑا اور اُسے نشیبی جگہ میں گھسیٹ لیا تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ میں نے پستول نکال لیا۔ میرے دوستوں نے خنجر نکال لئے اور اُس سے پوچھا کہ وہ ہمارے پیچھے کیوں پھر رہا ہے۔

اُس نے ہمیں خراجِ تحسین پیش کیا کہ ہم نے ایک جعلی پیر کو بے نقاب کیا ہے لیکن ہم نہ مانے۔ تین آدمیوں کے مقابلے میں وہ کیا کر سکتا تھا۔ ہم نے اُس کی تلاشی لی تو اُس کے پاجامے کے نیفے سے اُڑسا ہُوا ریوالور برآمد ہُوا۔ اُس نے تھوڑی سی جھجک کے بعد بتا دیا کہ وہ سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہے۔ جہلم شہر میں ایک آدمی قتل ہو گیا ہے اور پتہ چلا ہے کہ قتل کے ملزم رات ہی رات کہیں بھاگ گئے ہیں۔ بیڑی پتن سے کسی سے پتہ چلا تھا کہ تمہارے حلیے کے تین آدمی یہاں سے دریا پار کر گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی ہو۔

"اپنا انجام تمہیں معلوم ہے؟" —— میں نے اُسے کہا —— "ہم تمہیں قتل کر کے یہیں پھینک جائیں گے .... کیا تم اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ بغیر وردی پولیس ہے؟"

وہ اناڑی معلوم ہوتا تھا۔ ہم تینوں بھی اناڑی ہی تھے لیکن اُس کے لئے بہت خطرناک تھے۔ اُسے تین مجرموں کے مقابلے میں اکیلا نہیں آنا چاہیئے تھا۔ ہم نے اُس کے ریوالور پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ ہمارے گھیرے میں مجبور اور کمزور کھڑا تھا۔ اُس نے جب اپنی حالت دیکھی تو منت سماجت کرنے لگا۔

"میں تمہارا دشمن نہیں" — اُس نے کہا — "میں سرکاری نوکر ہوں۔ بیوی ہے۔ تین بچے ہیں۔ میں مارا گیا تو وہ بھوکے مر جائیں گے۔"

"تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"میں اکیلا ہوں" — اُس نے کہا — "میں جانتا تھا کہ میں نے تمہاری نشاندہی کر دی یا تمہارا سراغ پا کر تمہیں گرفتار کرا دیا تو مجھے انعام ملے گا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تم صرف قاتل نہیں بلکہ تم چھاؤنی کا بارُود خانہ تباہ کرنے جا رہے تھے .... میرا ریوالور مجھے دے دو ورنہ انعام کی جگہ مجھے سزا ملے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے زندہ نہیں جانے دو گے لیکن میں منت کرتا ہوں کہ میرے بچوں پر رحم کرو۔"

اُس کے آنسو نکل آئے۔ مجھے معلوم تھا کہ ہم اگر اس کے سامنے مجبور اور کمزور ہوتے تو یہ ہم پر کسی قیمت پر رحم نہ کرتا۔ پھر بھی مجھے اس کے بچوں پر رحم آ گیا۔ وہ میرا ہندوستانی بھائی تھا اور میری طرح انگریزوں کا غلام تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ ہمیں کس طرح یقین دلا سکتا ہے کہ ہم اُسے چھوڑ دیں تو وہ واپس جا کر یہ رپورٹ نہیں کرے گا کہ ہم کدھر گئے ہیں؟ اُس نے کہا کہ اُس کے پاس قسموں کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

وہ اور زیادہ رونے لگا۔ میرے دونوں ساتھی اُسے قتل کرنے کے حق میں تھے۔ میں کہتا تھا کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔ مجھے یاد آ گیا ہے کہ یہ پیر اور اُس کا ایک مرید نابھہ جیل کے مفرور ہیں۔

"میری بات سنو" — میں نے سی۔ آئی۔ ڈی کے اس آدمی سے کہا — "ہم تم پر رحم کرتے ہیں اور تمہیں انعام بھی دیتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہے کہ ہم نے اس جعلی پیر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ تمہیں ایک خاص بات معلوم نہیں۔ فوراً اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچو اور پولیس کو ساتھ لے کر اس پیر اور اس کے مصاحبوں کو گرفتار کر لو۔ یہ پیر نہیں، یہ نابھہ کے علاقے کا ڈاکو ہے اور وہاں کی جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ اس کا ایک اور ساتھی بھی نابھہ جیل کا مفرور ہے۔ انہیں پکڑواؤ اور انعام حاصل کرو۔"

اُس کے آنسو خشک ہو گئے اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ میں نے اُس کا ریوالور اُسے دے دیا۔ اُس نے ہمیں کہا کہ جدھر جی چاہے نکل جاؤ۔ میں دھوکہ نہیں دوں گا۔

وہ چلا گیا۔ ہم اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ وہ گاؤں میں نہ گیا۔ جب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ہم وہاں سے شمال کی سمت چل پڑے۔

اگر میں یہ کہانی سناتا چلا جاؤں کہ ہم کہاں گئے، پھر کہاں سے کہاں پہنچے اور ہم نے کیا کیا اور پھر ہم واپس اپنے گھروں کو کس طرح اور کب واپس آئے تو اس کہانی کے لئے مجھے "حکایت" کے ایک سَو صفحے درکار ہوں گے۔ میں اس آپ بیتی کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔ ہم نے ڈیڑھ سال کشمیر میں مختلف جگہوں پر گزارا۔ میں جب واپس آیا تو میرا پہلا بچہ دو سال کا ہو چکا تھا۔ یہی بچہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں مارا گیا تھا۔

مجھے واپسی پر پتہ چلا تھا کہ یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ جہلم سے کچھ دُور ایک گاؤں سے ایک آدمی پکڑا گیا ہے جو اس علاقے کا مقبول پیر تھا لیکن وہ نابھہ جیل کا مفرور قیدی اور وہاں کا ایک خطرناک جرائم پیشہ تھا۔ اس کے ساتھ اسی علاقے کا ایک مفرور مجرم تھا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میں انگریزوں کے خلاف تو کوئی کارروائی نہیں کر سکا تھا لیکن یہ بھی بہت بڑا کام تھا کہ میں نے ایک بہت بڑی فریب کاری اور دھوکے سے لوگوں کو بچا لیا تھا۔

یہ پچاس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ جوان اور حسین دیہاتی لڑکی جسے خاوند اولاد کے لئے اس جعلی پیر کے پاس لایا تھا مجھے آج بھی اپنے سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی ایسے لگتا ہے جیسے وہ کہہ رہی ہے — "کسی پیر کے تعویذ، پھونک اور دم سے کسی عورت کی گود ہری نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی پیر کسی عورت کو بچہ دیتا ہے تو اس بچے کا باپ وہ پیر ہی ہوتا ہے" —

وہ آج بھی مجھ سے پوچھ رہی ہے — "تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

ان پچاس سالوں میں ایسی ہزاروں عورتوں کی عصمت" اولاد دینے

"والے پیروں" کے حجروں کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ وہ لڑکی اب میری عمر کی
ضعیف بوڑھی ہو گی۔ معلوم نہیں اُس کی گود ہری ہوتی تھی یا نہیں یا وہ زندہ
ہے یا پیروں کی فریب کار دنیا سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئی ہے۔ البتہ میں
یہ دیکھ رہا ہوں کہ پیر بھی موجود ہیں اور مرید بھی موجود ہیں۔ میں کبھی کبھی
سوچا کرتا ہوں کہ میں ہندو سے مسلمان ہُوا تھا مگر مسلمان ہندو نہ ہوتے
ہوتے ہندوؤں کی طرح توہم پرست کیوں ہیں؟

بندوق کی نالی اور سانپ کا زہر

پینتالیس سال پہلے کا وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے
اور وہ دن مجھے کل کی طرح یاد ہے۔ وہ منظر جب بھی ذہن کے پردے پر
آتا ہے تو میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور میری آنکھوں سے آنسوؤں
کی جھڑی برسنے لگتی ہے۔ شام کا وقت تھا اور میں اُس وقت رات کا کھانا
پکا رہی تھی۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ اُنیس سال تھی اور میری والدہ فوت
ہو چکی تھیں۔ والد صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ اچانک باہر سے کسی نے
گھبرائی ہوئی آواز میں میرے والد صاحب کو پکارا۔ یہ آواز سُن کر میرا دل بھی
دہل گیا اور مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ کسی نے خیریت سے آواز نہیں دی۔

"خان صاحب، جلدی باہر آئیں" ـــ والد صاحب ابھی اُٹھ ہی رہے
تھے کہ کسی نے دوبارہ آواز دی۔

والد صاحب تقریباً دوڑ کر دروازے تک پہنچے۔ میں بھی اُٹھ کر اُن
کے پیچھے ہی گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

"خان صاحب، جلدی چلیں" ـــ کوئی آدمی میرے والد صاحب سے
کہہ رہا تھا ـــ "آپ کا بیٹا زخمی ہو گیا ہے۔"

والد صاحب نے اطلاع لانے والے سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کیسے
زخمی ہُوا ہے، اُسے کس نے زخمی کیا ہے اور وہ اب کہاں ہے۔ اُنہوں
نے پلٹ کر مجھے بھی نہ بتایا اور وہیں سے چلے گئے۔ اگر میں باورچی خانے میں ہی
بیٹھی رہتی اور والد صاحب کے پیچھے دروازے تک نہ آتی تو مجھے پتہ نہ
چل سکتا کہ میرے والد صاحب کو کسی نے کیوں بلایا ہے۔

میں واپس پھر باورچی خانے میں آگئی اور کھانا پکانا چھوڑ کر بیٹھ گئی۔

زخمی ہونے والا میرا اکلوتا بھائی تھا اور مجھ سے دو سال بڑا تھا۔ اُس کے زخمی ہونے کی خبر نے مجھے پریشان کر دیا۔ زیادہ پریشانی اس لئے بھی ہو رہی تھی کہ مجھے پوری بات کا پتہ بھی نہیں چل سکا تھا۔ اُس وقت ہمارے گھرانوں میں پردے کا بڑا سخت رواج تھا ورنہ میں خود باہر جا کر کسی سے پُوچھ آتی۔

والد صاحب تھوڑی دیر بعد آ گئے لیکن وہ اکیلے نہیں تھے۔ اُن کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور تین چار آدمیوں نے ایک چارپائی اُٹھا رکھی تھی۔ والد صاحب کا سر جُھکا ہُوا تھا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لوگوں نے چارپائی ہمارے صحن میں رکھ دی۔ چارپائی پر میرا بھائی لیٹا ہُوا تھا۔ میں کمرے میں سے دیکھ رہی تھی۔ پردے کی وجہ سے باہر نہیں آ سکتی تھی۔

"تھانے لے چلیں؟" ـــــ ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا۔ پھر اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور ایک معزز سا آدمی بلند آواز میں بولا ـــــ "لاش تھانے لے چلو۔"

جُونہی میں نے لاش کا لفظ سُنا میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہُوا۔ اتنا ہی یاد ہے کہ میں بھائی کی لاش سے لپٹی ہوئی چیخیں مار رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بُزرگ سے آدمی نے مجھے اُٹھایا اور میں دوڑ کر والد صاحب کے سینے سے لگ گئی۔

"بابا جان!" ـــــ میں نے چیخ چیخ کر والد صاحب کو جھنجھوڑ ڈالا ـــــ "میرے بھائی کو کیا ہُوا ہے؟ اسے کس نے مارا ہے؟"

والد صاحب کی حالت اُس وقت غیر تھی۔ اُن کے مُنہ سے بھی کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ ایک آدمی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور مجھے تسلی دینے لگا۔

"صبر کرو بیٹی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "خدا کو یہی منظور تھا۔ باہر لڑکے ہاکی کھیل رہے تھے۔ کھیل ہی کھیل میں لڑائی ہو گئی اور تمہارا بھائی سلطان

کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔"

"کہاں ہے سلطان؟" ـــــ میں نے چِلّا کر کہا ـــــ "میں اُس کی بوٹیاں اُڑا دوں گی۔"

"بھاگ گیا ہے" ـــــ ایک اور آدمی نے کہا ـــــ "پکڑا جائے گا ... ہائے کیا خوبصورت جوان تھا تمہارا بھائی!"

پھر وہ لوگ میرے بھائی کی لاش کو اُٹھا کر لے گئے۔ والد صاحب بھی اُن کے ساتھ ہی چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد محلّے کی عورتیں آ گئیں اور میرے پاس بیٹھ کر میری دلجوئی کرنے لگیں۔ وہ اپنی طرف سے ایک انسانی فرض ادا کر رہی تھیں لیکن اُن کے الفاظ مجھے زہر لگ رہے تھے۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے مجھے تسلّی دے کر وہ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہوں۔ سچّی بات یہ ہے کہ مجھے کسی کے دلاسے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں غمزدہ تو تھی ہی نہیں۔ میرے اندر تو اُس وقت آگ بھڑک رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ مجھے تسلّی دینے کی بجائے کوئی آ کے یہ خبر سنائے کہ سلطان بھی قتل ہو گیا ہے۔

میں نے بھی اپنے دل میں عہد کر لیا کہ سلطان کو بھی میں اسی طرح قتل کروں گی اور جب اُس کی لاش اُس کے گھر جائے گی تو میں اُس کی بہنوں سے جا کر کہوں گی کہ صبر کرو۔

سلطان یا اُس کے گھر والوں سے میرے بھائی یا میرے والد صاحب کی کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ تو ہمارے ہی قبیلے کے لوگ تھے اور پنجاب کے اس شہر میں ہمارے قبیلے والوں کی تعداد بھی بہت تھوڑی تھی۔ ہم لوگوں کا آپس میں ملنا ملانا بھی تھا اور ہم ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں بھی شریک ہوتے تھے۔ سلطان کی بہنیں اکثر میرے پاس آیا کرتی تھیں اور اشاروں اشاروں میں مجھے یہ بھی بتا گئی تھیں کہ وہ سلطان کے لئے میرا رشتہ مانگنا چاہتی ہیں۔ بات صاف اس لئے ابھی تک نہیں ہو سکی تھی کہ میری والدہ زندہ نہیں

تھیں۔ بس والد صاحب اور بھائی تھا اور یہ بھائی بھی تقریباً میرا ہم عمر ہی تھا۔

میں کہانی سنانے سے پہلے اپنے بارے میں کچھ بتا دوں ہم لوگوں کا وطن افغانستان تھا اور ہم لوگ ایک دو پُشتوں سے پنجاب میں آکر آباد ہوتے تھے کیونکہ کابل میں سیاسی حالات اور حکومتوں کی تبدیلی کی وجہ سے افغانستان کی سرزمین ہمارے خاندان پر تنگ ہو گئی تھی۔ ہمارے ساتھ اور کچھ گھرانے بھی ہجرت کر کے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے اور ہم نے آکر پنجاب میں پناہ لی تھی۔ یہاں آکر ہماری حالت پہلے سے بگڑ گئی تھی لیکن ہم لوگ پھر بھی رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔ میرے والد صاحب نے مجھے اور میرے بھائی کو بہت اچھی تعلیم دلائی تھی۔ میں اگرچہ خاندانی روایت کے مطابق پردے کی پابندی کرتی تھی لیکن میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔

سلطان کا خاندان بھی اُن گھرانوں میں سے تھا جو ہمارے ساتھ افغانستان سے نکلے تھے۔ ہم لوگ اس شہر میں بالکل رشتہ داروں کی طرح رہتے تھے، لیکن سلطان نے تو وہ کام کر دکھایا تھا جو صرف دشمن کیا کرتے ہیں۔ اُس نے میرے اکلوتے بھائی کو قتل کر دیا تھا۔

تھانے میں کیس درج ہُوا اور سلطان خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ سُنا ہے کہ اُس نے جُرم کا اقرار کر لیا تھا۔ میرے والد صاحب کہتے تھے کہ وہ پھانسی سے نہیں بچ سکتا لیکن چاہے اُسے دس دفعہ پھانسی کی سزا ملتی، مجھے تو میرا بھائی واپس نہیں مل سکتا تھا۔ ہمارے گھر میں اب ویرانی کا راج تھا۔ والدہ پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔ بھائی قتل ہو گیا تھا۔ اب میں تھی اور باباجان تھے اور ہماری تنہائیاں تھیں۔ باباجان کا تو یہ حال تھا کہ اُن کی کمر میں خم پیدا ہو گیا تھا۔

سلطان کے والد صاحب ایک دفعہ باباجان سے ملنے آتے تھے اور اُنہوں نے اس بات پر افسوس کیا تھا کہ سلطان نے ظلم کیا ہے۔

"بھائی صاحب!" — انہوں نے میرے سامنے باباجان کے ہاتھ پکڑ

کر کہا تھا — "اُس نے جو کیا ہے اُس کی سزا اُسے مل جائے گی، لیکن ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہمارا خون ایک ہے، وطن ایک ہے اور ہم دونوں ہی ہندوستان میں پردیسی ہیں۔ اگر ہماری دُشمنی پیدا ہو گئی تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔"

سلطان کا والد خود چل کر ہمارے گھر آیا تھا اس لئے باباجان اُسے گھر سے نکال نہیں سکتے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ دُشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ باباجان نے سُلطان کے والد کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس شہر میں ہمارے اور بھی تین چار گھرانے آباد تھے۔ انہوں نے بھی آکر باباجان سے اسی قسم کی باتیں کیں اور یہی کہتے رہے کہ دُور پردیس میں آکر دشمنی پیدا کر لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

"تم لوگ مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو" — والد صاحب نے غصّے میں آکر کہا — "اگر میں تم میں سے کسی کے جوان بیٹے کو قتل کر دوں تو تم لوگ مجھے معاف کر دو گے؟"

ان لوگوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر ہُوا یُوں کہ سُلطان خان بری ہو گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بری نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس نے اتنے لوگوں کے سامنے قتل کیا تھا پھر بھی مجھے یاد نہیں کہ وہ کس طرح بری ہو گیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب سلطان خان ہمارے سامنے سے اکڑ کر گزرا کرے گا لیکن کسی نے اُس کی شکل بھی نہیں دیکھی، اتنا ضرور ہے کہ میرے باباجان کی کمر میں جو خم تھا وہ دُور ہو گیا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ باباجان اپنی پرانی بندوق نکال کر صاف کر رہے تھے۔

"یہ کیا باباجان!" — میں نے پوچھا — "شکار پر جانا ہے؟"

"ہاں" — اُنہوں نے سرد لہجے میں جواب دیا — "شکار پر جانا ہے.... شکار ہی سمجھو.... میرا خیال تھا کہ قانون میرے بیٹے کے قتل کا بدلہ لے لے گا لیکن قانون نے اُسے معاف کر دیا۔ میں افغان باپ کا بیٹا

ہوں۔ میں اُسے معاف نہیں کر سکتا۔ سلطان اب میرے ہاتھوں شکار ہو گا۔"

سلطان کا نام سُن کر میرے زخم ایک بار پھر تازہ ہو گئے۔ مجھے یاد آ گیا کہ میرا ایک بھائی تھا جو ایک خوبصورت جوان تھا اور وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے کیونکہ اُسے سلطان نے بے گناہ ختم کر دیا تھا۔ اب سلطان کو قتل ہونا تھا کیونکہ بابا جان اُسے معاف نہیں کر سکتے تھے۔

"بابا جان!" —— میں نے کہا —— "یہ بندوق مجھے دے دیں۔ میرے اندر بھی آگ بھڑک رہی ہے۔ سلطان کا شکار میں کروں گی۔"

"نہیں خُور بانو!" —— بابا جان نے کہا —— "یہ تمہارا کام نہیں۔"

"بابا جان!" —— میں نے مِنت کے لہجے میں کہا —— "مجھے آپ بیٹی نہ سمجھیں۔ میں بھی آپ کا بیٹا ہی ہوں۔"

لیکن بابا جان نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے بیٹے کے قتل کا بدلہ خود لینا چاہتے تھے۔ یہی اُن کے افغانی خون کا تقاضا تھا۔ اُن کی روایت کے مطابق قتل کا انتقام لینا فرض تھا۔ میں اگرچہ پنجاب میں پیدا ہوئی اور پنجاب میں ہی جوان ہوئی تھی اور میں نے سکول کی تعلیم بھی حاصل کی تھی لیکن اس کے باوجود میرے اندر بھی سلطان کو قتل کرنے کی خواہش بڑی شدید تھی اور میں چاہتی تھی کہ میں سلطان کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں۔ یہ افغانوں اور پٹھانوں کی روایت ہے۔

ایک اور بات بھی تھی جو میں بڑی شدت سے محسوس کرتی تھی۔ پہلے میری والدہ فوت ہوئی، پھر میرا بھائی قتل ہُوا اور اب میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ بابا جان سلطان کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جائیں۔ مجھے اپنے باپ سے بہت محبت تھی اور میں چاہتی تھی کہ اُن کی جگہ انتقام کے اس اندھے گہرے کنوئیں میں چھلانگ میں لگاؤں۔ میں نے یہی بات بابا خان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہ خُور بانو، نہ!" —— بابا جان نے کہا —— "میں ابھی زندہ ہوں۔

اگر میں بھی مارا گیا تو پھر تم بدلہ لینے کے لئے آزاد ہو گی۔"

میں نے کہا، کیا ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ سلطان خان بھی مارا جائے اور مارنے والا پکڑا بھی نہ جائے۔ میں نے بابا جان سے بات کی لیکن اُنہوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خفیہ طور پر وار کرنا بزدلوں کا کام ہے۔ میرے ذہن میں ایک اور بھی سکیم تھی جو بابا جان کے سامنے رکھنا چاہتی تھی لیکن اُس وقت انتقام کے جوش نے اُن کی حالت ایسی کر رکھی تھی کہ اگر میں وہ بات اُن کے سامنے کر دیتی تو وہ بندوق کی نالی کا رُخ میری طرف کر کے گولی چلا دیتے۔

سلطان کے والدین بھی ہماری طرح رئیس لوگ تھے۔ اُن کو بھی میرے والد کی طرف سے انتقام کا اندیشہ تھا اس لئے اُنہوں نے سلطان کو غائب کر دیا۔ جب بابا جان کو پتہ چلا کہ سلطان غائب ہے تو وہ بے چین ہو گئے۔ بڑی چھان بین کے بعد کھوج ملا کہ اُسے ایک اور شہر میں بڑی اچھی ملازمت دلا دی گئی ہے اور وہ وہاں رہ رہا ہے۔ بابا جان کی جان میں جان آئی۔ اب وہ جب چاہتے اُسے قتل کر سکتے تھے۔

اُن دنوں میرے بابا جان کی جو ذہنی حالت تھی اُسے میں ٹھیک طرح سے بیان نہیں کر سکتی۔ کبھی ایسے لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔ اُن کی زندگی کے معمولات ہی بدل گئے تھے۔ اب وہ بات بات پر جھنجھلا جاتے تھے۔ میرے ساتھ اُن کا بہت پیار تھا لیکن اب وہ مجھے بھی اکثر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

ایک بار بابا جان کو خفیہ طور پر خبر ملی کہ سلطان ایک دو دنوں کے لئے آ رہا ہے۔ اُنہوں نے سلطان کی خبر رکھنے کے لئے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس بار وہ سلطان کو زندہ نہیں جانے دیں گے۔ ہم لوگ شہر میں رہتے تھے اور ریلوے سٹیشن وغیرہ بھی شہر کے اندر ہی تھے اس لئے سلطان کو قتل کرنے کے لئے گھات نہیں لگائی جا سکتی تھی۔

اُس کو للکار کر ہی قتل کرنا تھا۔ سلطان کے آنے کی خبر سُن کر میرے اندر بھی ایک آگ سی سلگنے لگی۔ میرا جی چاہنے لگا کہ سلطان یا تو میرے ہاتھ سے قتل ہو یا آتے ہوئے راستے میں کسی حادثے کا شکار ہو کر مارا جائے، کم از کم باباجان کے ہاتھ سے قتل نہ ہو، نہیں تو میں اِس بھری دنیا میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔

سلطان کی قسمت میں کسی حادثے کا شکار ہونا نہیں لکھا تھا اس لئے وہ صحیح سلامت پہنچ گیا اور اس کی خبر باباجان کو بھی مل گئی۔

میں بیان نہیں کر سکتی کہ اُس وقت میری کیا حالت ہوئی یا قدرت نے میرے دل میں کیا بات ڈالی کہ میں نے باباجان کی غیر حاضری میں اُن کی بندوق اُٹھائی اور پڑوسیوں کے گھر میں جا کر چھپا دی۔ ہمارے پڑوسی پنجابی تھے اور وہ اچھے لوگ تھے۔ وہ ہمارے حالات سے بھی واقف تھے۔ اُنہوں نے اور کوئی بات نہ پوچھی اور بندوق اپنے پاس رکھ لی۔ اُسی شام باباجان گھر آئے۔ وہ ذرا جلدی میں تھے اور اُن کے انداز سے بھی بے قراری کا اظہار ہوتا تھا۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا۔ اُن کی نظریں عجیب سی تھیں۔ اس کے بعد وہ سارے گھر میں گھوم گئے۔ پھر نکلے اور تھوڑی دیر بعد پھر اندر آ گئے۔

"میری بندوق؟" — اُنہوں نے پوچھا۔

"یہیں کہیں ہو گی" — میں نے جھوٹ بولا۔

اُنہوں نے بڑی تیزی سے بندوق تلاش کی اور پھر گھر سے نکل گئے۔ کافی دیر کے بعد آئے تو اُن کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ اُنہوں نے میری طرف بھی نہ دیکھا اور جا کر کمرے میں بیٹھ گئے۔

"خیریت تو ہے باباجان!" — میں نے اندر جا کر پوچھا۔

"نکل گیا" — اُنہوں نے ایسے انداز میں کہا جیسے مجھ سے نہیں کسی اور سے باتیں کر رہے ہوں۔

"کون نکل گیا؟" — مَیں نے پوچھا۔

"سلطان بچ کر نکل گیا" — اُنہوں نے افسوس اور مایوسی کے ملے جُلے

لہجے میں کہا — "اب مجھے اُس کے پیچھے جانا پڑے گا۔"

سچی بات یہ ہے کہ اُس وقت مجھے بھی تھوڑی دیر کے لئے افسوس ہُوا کہ مَیں نے باباجان کی بندوق چھپا کر غلطی کی ہے۔ اگر وہ آج باباجان کے ہاتھ چڑھ جاتا تو میرے سینے میں سلگنے والی آگ بھی ٹھنڈی ہو جاتی۔ غلطی کا احساس اتنا زیادہ تھا کہ میں نے باباجان کے سامنے بھی اعتراف کر لیا کہ میں نے اُن کی بندوق خود چھپائی تھی۔

"او ظالم کی بچی!" — باباجان نے غصّے سے کہا — "یہ تُو نے کیا کیا؟ آج بڑا اچھا موقع تھا جو تُو نے گنوا دیا۔"

"باباجان!" — میں نے کہا — "جو آگ آپ کے اندر بھڑک رہی ہے وہی آگ میرے سینے میں بھی سلگ رہی ہے۔ میں آپ کو ایک بار پھر کہتی ہوں کہ سلطان کو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی۔"

"اور پھر پولیس تمہیں پکڑ کر تھانے لے جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ حُور بانو کا باپ بے غیرت ہے" — باباجان نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"نہیں باباجان!" — مَیں نے کہا — "ایسے نہیں ہو گا۔ پولیس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ سلطان ایسے طریقے سے قتل ہو گا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا اور ہمارا انتقام بھی پورا ہو جائے گا۔ میں نے بہت کچھ سوچ کر آپ سے یہ بات کی ہے۔"

باباجان میری اس سکیم کو نہ سمجھ سکے اور انکار کرتے رہے۔

"آپ کو پتہ ہے کہ بھائی کے مرنے سے پہلے سلطان کی بہنیں ہمارے گھر میں آیا کرتی تھیں" — مَیں نے کہا — "اور اُنہوں نے اشاروں اشاروں میں مجھے کہا تھا کہ وہ سلطان کی شادی میرے ساتھ کریں گی۔ آپ بھی کسی طرح میری شادی سلطان کے ساتھ کر دیں۔"

باباجان جُوں جُوں میری بات سُن رہے تھے اُن کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے جسم کا سارا خون اُن کے چہرے پر آ کر جمع

ہو گیا ہو۔ اُن کی آنکھیں بھی لال سُرخ ہو رہی تھیں۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کریں باباجان!"—— میں نے کہا —— "بیٹیاں اپنے باپ کے ساتھ ایسی بات نہیں کرتیں۔ میں یہ بات اس لئے کر رہی ہوں کہ سلطان میرے معصوم بھائی کا قاتل ہے اور اُس سے بدلہ لینا میرا فرض ہے۔ آپ کسی طریقے سے میری اُس کے ساتھ شادی کر دیں۔ پھر وہ میرے ہاتھ سے قتل ہو گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ نُور بانو نے سلطان کو قتل کر دیا ہے۔ میں بیوہ ہو کر آپ کے پاس واپس آجاؤں گی اور پھر ساری عمر آپ کی خدمت میں گزار دوں گی .... آپ کو اپنے پیدا کرنے والے کی قسم ہے باباجان! میری اس خواہش کو پورا کر دیں۔ میں اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ خود لوں گی۔"

بات تو میں نے کر دی تھی لیکن یہ بات انہونی تھی۔ باباجان تو بہت ہی زیادہ غصے میں تھے۔ ایک تو اس بات پر کہ میں نے اُن کی بندوق چھپا دی تھی اور دوسرے اس بات پر کہ میں اپنے دشمن کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کر رہی تھی لیکن میں نے اُنہیں ٹھنڈا کر لیا اور انہیں بڑے آرام سے سمجھایا کہ میری اس سکیم کا کیا مطلب ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے باباجان کو مجھ سے بے حد پیار تھا جس کا فائدہ یہ ہُوا کہ تھوڑی سی بحث کے بعد میری بات اُن کی سمجھ میں آگئی۔

لیکن مسئلہ اب یہ تھا کہ میری شادی سلطان سے ہو بھی تو کیسے۔ ظاہر ہے کہ ہم لوگ تو اس سے شادی کی بات نہیں چھیڑ سکتے تھے لیکن کہتے ہیں کہ خدا کو جو بات منظور ہو وہ ہو کر رہتی ہے۔ ہُوا یوں کہ سلطان کے بری ہونے کے بعد ہمارے قبیلے کے وہی معززین سلطان کے باپ کے ہمراہ ایک بار پھر ہمارے گھر آئے جو پہلے بھی آچکے تھے۔ اُنہوں نے آکر وہی درخواست کی کہ ہم سلطان کو معاف کر دیں اور بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دیں۔

"دیکھو سعد اللہ خان!"—— ایک بزرگ نے میرے باباجان سے کہا

—— "کسی نہ کسی کو تو مرنا ہی تھا۔ تمہارا بیٹا نہ مرتا تو سلطان مرجاتا۔ چوٹیں تو ایک دوسرے کو برابر کی لگی تھیں اور پھر یہ بھی سوچو کہ سلطان کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ لڑکے ہاکی کھیل رہے تھے۔ اُن کی لڑائی ہو گئی اور پھر تمہارے لڑکے کا وقت آگیا تھا۔ خدا کو اُس کی موت ایسے ہی منظور تھی۔"

"سلطان بھی تو بڑی دیر بے ہوش پڑا رہا تھا"—— سلطان کے باپ نے کہا —— "اُسے اُس کا دوست اُٹھا کر گھر لے آیا تھا تاکہ اُس پر کوئی بے ہوشی میں ہی وار نہ کر دے۔ ہوش میں آتے ہی وہ بھاگ گیا تھا لیکن پکڑا گیا۔ میرے نزدیک سلطان میں اور تمہارے بیٹے میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دونوں یہاں پردیسی ہیں۔ میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔"

وہ سب لوگ میرے باباجان کو اسی بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اس حادثاتی قتل کی وجہ سے دو گھرانوں میں جو پہلے ہی بے وطن ہیں، دشمنی پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ باباجان نے اُن کی منت سماجت اور کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے سُنتے رہے۔ اُن لوگوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ دونوں گھرانے اگر رشتہ داری میں منسلک ہو جائیں تو دشمنی ختم ہو جائے گی۔

"میں تمہارے بیٹے کا خون بہا دینے کے لئے بھی تیار ہوں"—— سلطان کے والد نے کہا —— "جو اسلام کے عین مطابق ہے اور میں ہاتھ جوڑ کر اپنے بیٹے کے لئے نُور بانو کا ہاتھ مانگ رہا ہوں تاکہ ہم بھائیوں کی طرح رہیں۔"

والد صاحب نے اُس وقت تو کوئی وعدہ نہ کیا۔ بس اتنا کہا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ سوچنے کی بات تو انہوں نے ویسے ہی کی تھی۔ ہر کام ہماری توقع کے مطابق ہو رہا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ پانچ ہزار روپے کے حق مہر پر میری شادی سلطان خان سے ہو گئی۔ ہم لوگوں میں حق مہر زیادہ رکھنے کا رواج ہے کیونکہ اس سے بیٹی کی قدر و قیمت کا صحیح احساس ہوتا ہے۔ مجھے محلّے کی لڑکیوں نے دُلہن

بنایا اور میں رخصت ہو کر سلطان خان کے ہمراہ چلی گئی۔

رخصتی سے پہلے جب ابّا جان نے مجھے گلے لگایا تو میں نے اُن کے کان میں کہہ دیا کہ میں انشاءاللہ جلد ہی بیوہ ہو کر واپس آؤں گی۔ لڑکیاں رخصت ہونے سے پہلے بہت روتی ہیں اور ان کے ماں باپ بھی روتے ہیں لیکن اُس روز میری آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ میں تو ایک مقصد کے لئے رخصت ہو رہی تھی اور وہ مقصد تھا اپنے خاوند سے اپنے مقتول بھائی کے خون کا بدلہ لینا۔ بھائی کی یاد آتے ہی میری آنکھیں نم ہو گئیں جسے لوگ یہ سمجھے کہ میں باپ کی جدائی کی وجہ سے رو رہی ہوں۔

یہ ذکر کرنا بے کار ہے کہ میری ساس اور میری نندوں نے میری پذیرائی کس طرح کی۔ وہ مجھے پہلے ہی بہت پسند کرتی تھیں اور اب اُن کے دل کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ مجھے ولیمے تک اپنے سُسرال میں رہنا تھا اس کے بعد سلطان کے ہمراہ اُس شہر میں چلے جانا تھا جہاں سلطان کی ملازمت تھی۔ ایک لحاظ سے یہ میرے لئے اچھا ہی تھا۔ اگر میں سُسرال میں ہی رہتی تو میرے لئے سلطان پر وار کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔

سہاگ رات ہر دُلہن کے لئے ارمان بھری رات ہوتی ہے اور اس رات کی یاد وہ ساری زندگی سینے سے لگائے رکھتی ہے لیکن اُس رات کے لئے میرا کوئی رومانی ارمان نہیں تھا۔ میرے دل میں سلطان کے لئے رومانی جذبات پیدا ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ میرے دل میں تو قہر بھرا ہوا تھا لیکن مجھے رومانوی اداکاری کرنی تھی۔

ایک بات میں آپ کو سچ سچ بتا دینا چاہتی ہوں۔ سلطان ایک خوبصورت اور دلکش نوجوان تھا اور کئی لڑکیاں اُس کے ساتھ شادی کرنے کی آرزو دل میں رکھتی تھیں۔ بھائی کے قتل سے پہلے میں بھی اُس کو بہت پسند کرتی تھی جب میں نے بابا جان سے کہا تھا کہ میری شادی سلطان سے کر دیں، میں اُس سے بھائی کا بدلہ لوں گی تو اُنہیں اس لئے غصہ آ گیا تھا کہ شاید میں ابھی تک سلطان کو پسند کرتی ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے بابا جان کو قائل کیا تھا۔ مجھے

معلوم نہیں کہ سلطان سے میری شادی پر لوگوں پر لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا لیکن عام لوگ یہی سوچتے ہوں گے کہ حُور بانو سلطان کی محبت میں اپنے بھائی کا قتل بھول گئی ہے۔ یہ تو میرا دل ہی جانتا تھا کہ اب سلطان کے لئے میرے دل میں کتنی نفرت تھی۔

سلطان نے میرا گھونگھٹ اٹھایا اور پلکیں جھپکاتے بغیر میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے بظاہر تو نظریں جھکا رکھی تھیں لیکن چور نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ پھر دفعتاً اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اُس نے میرا گھونگھٹ چھوڑ کر اپنا مُنہ دوسری طرف موڑ لیا۔ میں نے اُس کی ہچکی کی آواز سُنی اور اس کے بعد وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے گھونگھٹ اُٹھا دیا اور حیران حیران نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا رونا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ افغان بچہ تھا اور رونا دھونا افغانوں کا نہیں بلکہ بزدلوں کا کام ہوتا ہے۔ پھر معلوم نہیں اُسے کس بات پر رونا آ گیا تھا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ اُس کے دل میں اعتماد پیدا کرنے کے لئے اُسے دلاسہ دوں اور پوچھوں کہ اُسے کیا دُکھ پہنچا ہے لیکن میں باوجود کوشش کے مُنہ سے ہمدردی کے کلمات کہہ نہ سکی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُس سے اتنا ہی پوچھا کہ کیا بات ہو گئی ہے۔

اُس نے مُنہ موڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں ابھی تک ڈبڈباتی ہوتی تھیں۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے تمہارا بھائی یاد آ گیا ہے" ــــ سلطان نے بھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اُسے یاد کرنے کا یہ کون سا موقع ہے" ــــ میں نے دل میں چھپے ہوئے قہر کو چھپا کر بظاہر نرم اور ملائم لہجے میں کہا ــــ "اُس کی موت تمہارے ہاتھ سے لکھی تھی، وہ مر گیا ہے۔ اب اُسے یاد کرنے کا فائدہ!"

"میرا خدا گواہ ہے کہ میں اُسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا" —— سلطان نے کہا —— "وہ تو مجھے بھائیوں کی طرح عزیز تھا کیونکہ وہ تمہارا بھائی تھا اور تم جانتی ہو کہ میں تمہیں بچپن سے پسند کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس آبادی میں میرے اور تمہارے بھائی کے علاوہ ہمارے وطن اور قبیلے کا اور کوئی جوان نہیں تھا... بات صرف اتنی تھی کہ ہم دونوں مخالف ٹیم میں ہاکی کھیل رہے تھے۔ میری ہاکی اُس کے ٹخنوں پر لگی تو اُس نے غصے میں میرے کندھے پر ہاکی ماری۔ میں نے اُسے روکا تو بھی اُس نے مجھے مارا۔ پھر یوں ہُوا کہ اُس نے مجھے مارا اور میں نے اُسے مارا۔ وہ بھی گر پڑا اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔ میں ہوش میں آیا تو میں گھر سے بھاگ گیا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ میری ہاکی اُس کی کنپٹی پر لگی تھی جس سے اُس کی موت واقع ہو گئی۔

"جب مجھے پتہ چلا کہ تمہارا بھائی فوت ہو گیا ہے تو بھی میری آنکھوں میں اسی طرح آنسو آتے تھے لیکن تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اُس کی موت اگر میرے ہاتھ سے ہی لکھی تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے پولیس کو بھی ساری بات صحیح صحیح بتا دی تھی۔ عدالت میں بھی میں نے سچ بولا تھا۔ وہ تو میرے وکیل کا کمال تھا کہ عدالت نے مجھے بری کر دیا، لیکن حور بانو! میں تمہارا اور تمہارے باباجان کا مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

سلطان نے اور بھی بہت سی جذباتی باتیں کیں لیکن میرے دل پر اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہُوا اور وہ سہاگ رات گزر گئی۔ اس کے بعد مجھے سلطان کے ساتھ اُس شہر جانے کی تیاری کرنی تھی جہاں اُس کی ملازمت تھی۔ میں روانہ ہونے سے پہلے اپنے باباجان سے ملنے گئی اور اُنہیں یقین دلایا کہ میں اُن کا مشن پورا کر کے دم لوں گی۔

"بندوق یا پستول استعمال نہ کرنا" —— باباجان نے مجھے مشورہ دیا —— "گولی کی آواز لوگوں کو اکٹھا کر دیتی ہے اور پھر بچ نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں باباجان!" —— میں نے کہا —— "سلطان ایسے

طریقے سے قتل ہو گا کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔"

میں باباجان کو تسلی دے کر سلطان کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

وہ جس شہر میں ملازمت کرتا تھا وہاں اُس نے اپنے رہنے کے لئے بڑا اچھا مکان لے رکھا تھا اور رہتا بھی شاہانہ ٹھاٹھ سے تھا۔ اُس کی ملازمت بھی بڑی اچھی تھی کیونکہ ایک تو وہ پڑھا لکھا تھا اور دوسرے امیر ماں باپ کا بیٹا تھا جن کا اُٹھنا بیٹھنا حکومت کے انگریز اور دیسی افسروں کے ساتھ تھا۔

نئے مکان میں سلطان اور میں اکیلے تھے۔ ایک بوڑھا نوکر اور اس کی بیوی گھر کا کام کاج کرتے تھے اور شام کو چھٹی کر کے چلے جاتے تھے۔ رات کو سلطان اور میرے سوا گھر میں اور کوئی نہیں ہوتا تھا اور یہ موقع بڑا اچھا تھا۔

شادی سے پہلے مجھے ایک اور چیز کا خطرہ بھی تھا۔ وہ یہ تھا کہ سلطان مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے جاتے گا اور پھر بدسلوکی کر کے میری زندگی عذاب بنا دے گا، لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ میرے تو اپنے پروگرام تھے۔

پنجاب کے دیہات میں اُس وقت بھی یہی ہوتا تھا اور اب بھی کہیں کہیں ہوتا ہے کہ خونی دشمنی ختم کرنے کے لئے آپس میں رشتہ داریاں قائم کی جاتی ہیں اور لڑکیوں کے رشتے لئے دیئے جاتے ہیں لیکن دشمنی پھر بھی ختم نہیں ہوتی اور لڑکیاں شادی کے چھ ماہ بعد طلاق لے کر یا ویسے ہی لڑ جھگڑ کر ماں باپ کی دہلیز پر آ بیٹھتی ہیں۔ خاندانی دشمنی کا بدلہ معصوم لڑکیوں سے لیا جاتا ہے۔ بعض جگہ ان کو بیگار میں جوت دیا جاتا ہے۔ بعض خاوند اور اُن کے بھائی مارپیٹ کرتے رہتے ہیں اور جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ طعنوں کے ذریعے ہی لڑکی کی زندگی اتنی تنگ کر دیتے ہیں کہ وہ بھاگ کر ماں باپ کے گھر چلی جاتی ہے۔ میں نے بعض ایسی مثالیں

بھی سنی ہیں کہ صلح کے طور پر دشمنوں کی بیٹی کو بیاہ کر لے گئے اور پھر بدلے
کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے اُسے کسی بردہ فروش کے ہاتھ بیچ ڈالا اور
اُس کے ماں باپ کو ذلیل کرنے کے لئے مشہور کر دیا کہ وہ اپنے کسی
آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ میرا معاملہ کچھ اور تھا کیونکہ بدلہ لڑکے
والے نہیں بلکہ لڑکی والے لینا چاہتے تھے۔

اپنے نئے گھر میں میرے لئے کوئی کام نہیں تھا۔ سلطان میرے
دل بہلاوے کے لئے مجھے کتابیں رسالے وغیرہ لا کر دیتا رہتا تھا۔ میں
نے پاکستان بننے سے پہلے میٹرک کیا تھا۔ اس سے میرے علمی معیار کا
اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن میں فارغ وقت میں مطالعہ کی
بجائے صرف ایک چیز سوچتی رہتی تھی ——— سلطان کو کس طرح
ٹھکانے لگایا جائے!

سلطان کے رویے سے ایسے لگتا تھا جیسے اُسے میرے ساتھ
بہت محبت ہے۔ یہ تو شادی سے پہلے بھی مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے پسند
کرتا تھا۔ اب شادی ہو گئی تو بھی میرے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ کبھی کبھی
ٹھنڈی آہ لے کر میرے بھائی کا ذکر چھیڑ دیتا اور اداس ہو جاتا اور میرے
دل میں سلگنے والی آگ مزید بھڑکا دیا کرتا تھا۔

ایک بار اسی طرح رات کے کھانے کے بعد اُس نے میرے بھائی
کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اپنی اور اُس کی دوستی کا ذکر کرتا رہا اور تھوڑی دیر بعد
ہم لیٹ گئے۔ وہ خود تو گہری پُرسکون نیند سو گیا تھا لیکن اُس رات
مجھے نیند نہ آئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے طے کر لیا کہ آج رات ہی
فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔

میں نے نائٹ لیمپ کی مدھم سی روشنی میں دیکھا۔ سلطان پہلو کے
بل کروٹ لے کر سویا ہوا تھا۔ وہ دنیا اور مافیہا سے اس قدر بے خبر تھا
کہ مجھے احساس ہوا کہ سلطان کی زندگی اب مکمل طور پر میرے ہاتھ میں ہے۔
میں نے دو دن پہلے ہی ایک ناول پڑھا تھا۔ یہ ناول جرم و جاسوسی

کے موضوع پر تھا۔ اس میں قاتل سوتے ہوئے آدمی کی ناک پر سرہانہ رکھ کر
اسے اس قدر دباتا ہے کہ مقتول دم گھٹنے سے مرجاتا ہے اور بعد میں معلوم
ہوتا ہے کہ مقتول دم گھٹنے سے یا حرکت قلب بند ہونے سے طبعی موت
مرا ہے۔ قاتل صاف بچ نکلتا ہے۔

میں نے بھی قتل کی اسی ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے
نہایت آہستگی سے اپنے بستر پر سے تکیہ اُٹھایا۔ مجھے یقین تھا کہ سلطان
میرے سامنے مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ میں نے ادھر تکیہ اُٹھا کر اپنے
دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا اُدھر سلطان نے کروٹ بدلی اور
سوتے سوتے پیٹھ کے بل ہو گیا۔ میرے ہاتھ رُک گئے۔ ایک لمحے کے
لئے میری نظر دُھندلا گئی۔ مجھے شک سا ہوا جیسے وہاں سلطان نہیں
کوئی اور لیٹا ہوا ہو۔ پھر نظر کے آگے سے دُھند چھٹی تو وہاں لیٹا ہوا شخص
جو تھوڑی دیر پہلے سلطان تھا اُس کا چہرہ تحلیل ہونے لگا۔ جب میں نے
ذرا حوصلہ کر کے دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرا معصوم بھائی گہری نیند
سو رہا ہو۔ ایک دم میرا جسم پسینے میں نہا گیا اور میرے ہاتھ کانپنے لگے۔
میں باوجود کوشش کے تکیہ سلطان کی ناک پہ نہ رکھ سکی۔ میرے سارے
جسم پر کپکپی طاری تھی اور قتل کا ارادہ میرے دل سے نکل گیا تھا۔ ایسے
لگا جیسے میرا سارا جسم بے جان ہو گیا ہو۔

عین اُسی لمحے سلطان نے ایک اور کروٹ بدلی اور بیدار ہو گیا۔
اُس نے مجھے اپنے سرہانے بیٹھے دیکھا تو پریشان ہو گیا لیکن اُس کی
پریشانی میں خطرے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ صرف میرے جاگنے
پر پریشان تھا۔

"حور بانو!" ——— اُس نے پیار بھرے ملائم لہجے میں پوچھا ——— "کیا
بات ہے، نیند نہیں آ رہی؟"

مجھ پر اب جھنجلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ جہاں اس لمحے لاش ہونی
چاہیئے تھی وہاں سلطان بیٹھا تھا اور پیار سے میرا حال پوچھ رہا تھا۔ میں

ایک لمحے کے لئے خوفزدہ ہو گئی۔

کیا اُسے شک ہو گیا ہے کہ میری نیّت کیا تھی؟

کیا میرا جرم میرے چہرے پر تو نہیں لکھا ہوا؟

کیا یہ جانتے ہوتے بھی کہ میں اسے قتل کرنا چاہتی ہوں، میرے ساتھ پیار سے پیش آرہا ہے؟

میں نے سلطان سے جھوٹ بولا کہ مجھے نیند نہیں آرہی۔ میرا لہجہ اور میری آواز کی کپکپی صاف چغلی کھا رہی تھی کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں لیکن اُس نے اس جھوٹ پر یقین کر لیا اور میرا دل بہلانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اسی میں ساری رات گزر گئی۔

میرے دل کی حالت عجیب تھی۔ کئی قسم کے خیالات آرہے تھے۔ ایک طرف تو اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہی تھی کہ میں موقع ملنے کے باوجود سلطان کو قتل نہ کر سکی، دوسری طرف دل ہی دل میں مطمئن تھی کہ سلطان زندہ ہے اور میں ایک جرم سے بچ گئی ہوں۔

ایسا کیوں ہوا تھا، اس کا جواب اب بھی میرے پاس نہیں ہے۔

پہلے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میرے اندر کسی گوشے میں سلطان کی محبت پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے میرا ہاتھ سلطان پر نہیں اُٹھ سکا، لیکن یہ محض خیال تھا۔ اپنے بھائی کے قاتل کے لئے میرے دل میں نفرت کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر وہ میرے ہاتھ سے بچ کیسے گیا؛ اس سوال کا جواب میرے پاس اب بھی نہیں ہے۔ اس واقعے کے بعد مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آنے لگا۔ میں ہر بات پر جھنجھلا جاتی تھی۔ بعض اوقات بغیر کسی وجہ کے سلطان سے بھی اُلجھ پڑتی تھی اور پھر اس بات کا انتظار کرتی تھی کہ وہ بھی میرے ساتھ لڑے گا، لیکن میرے غصّے کے جواب میں اُس کے انداز میں محبت بڑھ جاتی تھی۔

"حُور بانو!" ـــ ایک روز سلطان نے مجھ سے کہا ـــ "میرا خیال

ہے کہ گھر میں رہ رہ کر تمہاری صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ دنوں کے لئے اپنے باباجان سے مل آؤ۔ تھوڑی سی تبدیلی ہو گی تو تمہارا مزاج بحال ہو جائے گا۔"

میں انکار نہ کر سکی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے باباجان کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ میں کس منہ سے باباجان کے سامنے جاتی۔ میں ابھی تک اُن کے مقصد کی تکمیل نہیں کر سکی تھی۔ میں نے چپکے سے اپنی چیزیں سمیٹیں اور کچھ دنوں کے لئے اپنے شہر آگئی۔ رسمی طور پر اپنے سسرال بھی گئی لیکن زیادہ تر وقت باباجان کے پاس رہی۔ اس قیام کے دوران میں نے محسوس کیا کہ انتقام کا جذبہ اُن کے دل میں زیادہ زور پکڑ گیا ہے۔ وہ دراصل مجھ سے خفا تھے کہ میں نے اپنا وعدہ نہیں نبھایا۔

"حُور بانو!" ـــ ایک روز باباجان نے مجھ سے پوچھا ـــ "سچ بتانا کہیں تیرے دل میں سلطان کی محبت تو نہیں پیدا ہو گئی؟"

میں نے قسمیں کھا کھا کر اُنہیں یقین دلا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں لیکن مجھے ایسے لگتا تھا جیسے اُن کے دل میں جو بات ہے وہ ابھی صاف نہیں ہوئی۔

"میں بیوقوف تھا جو میں نے تیری بات مان لی" ـــ ایک روز باباجان نے کہا ـــ "اور اپنے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیئے۔ میں اب سلطان کو اپنے ہاتھ سے نہیں مار سکتا۔ اگر میں نے اُسے قتل کیا تو لوگ کہیں گے کہ سعداللہ خان ایک بے غیرت اور سفاک آدمی ہے جس نے اپنے داماد پر ہاتھ اُٹھایا اور اپنی بیٹی کو بیوہ کر دیا ہے۔ تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ بدلہ لے گی لیکن تُو نے اب کیا بدلہ لینا ہے۔"

میں نے باباجان کو بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ میرے دل سے بدلہ لینے کا خیال نہیں نکلا بلکہ میں تو موقع کی تلاش میں ہوں۔ باباجان کی بات سچی تھی کہ میں نے اُن کے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں اور اُنہیں بدلہ لینے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ اُن کی یہ بات سن کر مجھے اپنے اُوپر مزید غصہ آیا

اور میں جھنجھلاہٹ میں ہی کُڑھتی رہی۔

کچھ دنوں بعد سلطان آیا اور مجھے واپس لے گیا۔ واپس جا کر بھی میری جذباتی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اگر میں روزمرّہ کی تفصیلات لکھنے بیٹھوں تو آپ بوریت محسوس کریں گے۔ میں دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سلطان کے سامنے میں اُس کی بیوی تھی لیکن درحقیقت میں اُس کے خون کی پیاسی تھی۔

سلطان نے ایک بار مجھے بتایا کہ وہ مجھے ذرا سیر کرانا چاہتا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ شہر کے گھٹے ہوئے ماحول سے باہر نکل کر میں تازہ دم ہو جاؤں گی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہر بات میں یہی کوشش کرتا ہے کہ میں خوش رہوں۔ ایک اتوار کو اُس نے مجھے ساتھ لے کر باہر جانے کا پروگرام بنا لیا اور اپنی بندوق بھی ساتھ لے لی۔ جس علاقے میں ہم سیر کے لئے جا رہے تھے وہاں پرندوں کا شکار بہت ملتا تھا۔ سلطان نے بہت سوچا تھا کہ سیر کے ساتھ ساتھ شکار بھی کھیلیں گے اور تفریح ہو جائے گی۔

شہر سے ہم بس میں بیٹھ کر گئے تھے۔ آگے تھوڑی دُور تانگے میں سفر کیا۔ کھانے پینے کا سامان اور پھل وغیرہ ہم اپنے ساتھ ہی لے آتے تھے۔ سلطان کا خیال ٹھیک نکلا۔ شہر سے نکل کر میرے مزاج پر ما تی بہت اچھا اثر پڑا تھا۔ سلطان بھی طبیعت کے لحاظ سے خوش مزاج تھا۔ ہم ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کھایا پیا اور پرندوں کے شکار کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ سلطان نے ایک دو فائر کئے جو خالی گئے۔

پھر اُس نے بندوق مجھے پکڑا دی اور مجھے فائر کرنے اور شست باندھنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔ میں نے تھوڑی سی توجہ دی تو تھوڑے سے وقت میں ہی مجھے شست باندھ کر صحیح نشانے پر فائر کرنا آ گیا۔ میں نے ایک درخت کے چوڑے سے پتّے کو نشانہ بنایا اور پتّا چھلنی ہو گیا۔

سلطان میری نشانہ بازی کی مہارت پر حیران بھی ہُوا اور خوش بھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں افغانوں کی بیٹی ہوں اور نشانہ بازی تو میرے

خون میں شامل ہے۔ اُس نے بندوق میرے ہاتھ میں ہی رہنے دی اور میں اِدھر اُدھر پرندے دیکھ کر فائر کرتی رہی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہُوا کہ میری طبیعت کا بوجھل پن بالکل ہی ختم ہو گیا۔ سلطان اسی بات سے خوش ہو گیا تھا کہ میں شکار سے لُطف اُٹھا رہی ہوں اور اُس کے ساتھ ہنس کھیل کر باتیں کر رہی ہوں۔

سلطان کہنے لگا کہ وہ تھیلے میں سے ایک کارتوس نکال کر لے آتا ہے کیونکہ ہمارے پاس ایک دو کارتوس رہ گئے تھے۔ تھیلا ایک درخت کے پاس ہمارے سامان کے ساتھ پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا۔ سلطان بیٹھا تھیلا کھول رہا تھا۔ میری طرف اُس کی پُشت تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر میرا دماغ اُلٹی طرف چل نکلا۔

میری بندوق لوڈ تھی۔ میں نے سلطان کے سَر کی شست لے لی۔ وہ میری طرف پُشت کئے بیٹھا تھا اور درمیان میں ایک جھاڑی تھی۔ مجھے اُس کا سَر نظر آ رہا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اگر اُس کے سَر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیتی تو میرا مشن ایک سیکنڈ میں پورا ہو سکتا تھا۔ میں بعد میں کہہ سکتی تھی کہ جھاڑیوں کی اوٹ کی وجہ سے سلطان مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ یہ قتل اتفاقیہ یا حادثاتی موت کا رنگ اختیار کر سکتا تھا۔

میں نے سلطان کے سَر کا نشانہ لیا۔ میرا نشانہ تھوڑی دیر میں ہی اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ سلطان اب بچ نہیں سکتا تھا۔ جب میں نے شست باندھ لی تو میں نے سیفٹی کیچ کو ہٹایا اور ٹریگر پر اُنگلی رکھ دی۔ اب ایک لمحے کا کھیل تھا لیکن معلوم نہیں کیا ہُوا کہ ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی اکڑ گئی اور میرا جسم اُسی طرح پسینے سے تر ہو گیا جس طرح پہلی بار ہُوا تھا۔ بندوق خود بخود نیچے جُھک گئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سلطان اُٹھا اور ہنستا ہُوا میری طرف آیا اور میرے قریب آ کر جب اُس نے میری طرف غور سے دیکھا تو ہنسی اُس کے ہونٹوں کے اندر ہی دب گئی۔

"کیا ہُوا حُور بانو؟" — اُس نے گھبرا کر پوچھا — "اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ کوئی درندہ یا سانپ تو نہیں دیکھ لیا؟"

میں اُسے کیسے بتاتی کہ درندہ اور سانپ تو میری ذات کے اندر ہے۔ میں ان سے کیسے گھبرا سکتی ہوں۔

"کچھ نہیں سلطان!" — میں نے کہا — "واپس چلو۔"

"آخر پتہ تو چلے کہ کیا ہُوا ہے" — اُس کے لہجے میں تشویش تھی — "ابھی تو تم مزے سے شکار کھیل رہی تھیں۔"

میں نے اُسے بگڑ کر کہا کہ فوراً واپس چلو۔ اُس نے نہایت سعادتمندی سے میرے ہاتھ سے اپنی بندوق لے لی اور ہم واپس چل پڑے۔

مجھے ایک بار پھر اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ عین وقت پر میں اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی تھی۔

اس کے بعد کی داستان ذرا طویل ہے جو میں مختصر کر کے سناتی ہوں۔ مجھے اب پچھتاوے کی آگ بُری طرح جلا رہی تھی۔ سلطان میرے سامنے ہوتا تھا تو میں معلوم نہیں کیوں اُسے معاف کر دیتی تھی لیکن اُس کی غیر موجودگی میں کھولتی رہتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میں جھنجلاہٹ کا شکار ہو گئی۔ اس سے گھر کی فضا بھی خراب ہونے لگی۔ میں بات بات پر سلطان سے اُلجھ پڑتی تھی۔ میں ایک دو بار باباجان سے بھی ملنے گئی۔ اُنہوں نے پُرانی بات دُہرائی تو میری جھنجلاہٹ اور بڑھ گئی لیکن سلطان کا ردِ عمل روز بروز بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ میں جتنا اُس سے لڑنے کی کوشش کرتی وہ اتنا ہی زیادہ برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کرتا۔ میں کوشش کرتی تھی کہ اپنے مزاج کو قابو میں رکھوں لیکن غصے کے سیلاب کے آگے بند باندھنا میرے لئے ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

اس کے بعد بھی ایک دو بار مجھے بڑا سنہری موقع ملا مگر میں اس سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ ایک بار سردیوں کے دن تھے۔ ہم رات کو سخت پتھر کے کوئلے کی انگیٹھی جلا کر سوتے تھے۔ اس کوئلے کے بارے میں مشہور تھا

کہ اگر کمرے کا روشندان وغیرہ کھُلا نہ ہو تو آدمی اس کی گیس سے کمرے کے اندر ہی دم گھُٹ کر مر جاتا ہے۔ میں نے دو تین دفعہ ایسا کیا کہ شام کو ہی روشندان بند کر دیتے۔ میرا خیال تھا کہ رات کو باہر نکل جاؤں گی اور باہر سے دروازہ بند کر دوں گی تاکہ سلطان اندر ہی دم گھٹنے سے مر جائے۔ میں نے ایک دفعہ ایسے ہی کیا لیکن پتہ نہیں کیا ہُوا کہ میں پھر واپس آ گئی اور سلطان کو جگا کر کہا کہ انگیٹھی اُٹھا کر باہر رکھ دو۔

مَیں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں کہ میں پڑھی لکھی لڑکی تھی اور میرا تعلق ایک شائستہ اور تعلیم یافتہ خاندان سے تھا اور میرے خاندان کا تعلق افغانستان کے سابق شاہی خاندان سے تھا لیکن میں جس چتا میں جل رہی تھی اس نے مجھے ہر چیز بُھلا دی تھی۔ اس کا مجھے اور بھی افسوس تھا۔ سلطان نے بھی اب زیادہ دیر گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بعض اوقات رات دس بجے کے بھی بعد آتا تھا۔ یہ پاکستان بننے کے تھوڑا ہی عرصہ پہلے کی بات ہے۔

ایک روز میرے دروازے پہ دستک ہوئی۔ صبح کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر تقریباً میری ہی عمر کی تین لڑکیاں کھڑی تھیں۔ اُنہوں نے بڑی شائستگی سے میرا حال احوال پوچھا اور اندر آنے کی اجازت لی۔ وہ کوئی ضروری بات کرنے آئی تھیں۔ میں نے اُنہیں اندر بٹھایا۔ وہ کسی کالج کی طالبات تھیں۔

"آپ ہماری ہم عمر ہیں" — ایک لڑکی نے کہا — "آپ اگر شادی شُدہ نہ ہوتیں تو کالج میں ہمارے ساتھ ہوتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ الیکشن ہو چکے ہیں اور مسلمان پاکستان کے نام پر مر مٹنے کی قسم کھا چکے ہیں۔ لڑکیاں بھی مردوں سے پیچھے نہیں۔ ہم بھی جلوس نکالنے کا فیصلہ کر چکی ہیں اور آپ کو اپنے ساتھ شامل کرنے آئی ہیں۔"

میں نے اُنہیں ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ میں اپنے خاوند سے اجازت لے کر انہیں جواب دوں گی۔

"ضرور اجازت لیں" — ایک نے کہا — "آپ کو فوراً اجازت مل جائے گی۔ ہم آپ کے خاوند شہزاد سلطان کو اچھی طرح جانتی ہیں۔ وہ آپ کو نہیں روکیں گے۔"

"آپ کیسے جانتی ہیں؟"

"وہ بھی مسلم لیگ کے جاں نثار ورکر ہیں" — انہوں نے جواب دیا — "پاکستان کی خاطر انہوں نے اپنی سرکاری ملازمت کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ اپنے دفتر سے چھٹی کرنے کے بعد رات دیر تک مسلم لیگ کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ہمیں اُن کے بارے میں یقین تھا اسی لئے آپ کے پاس آئی ہیں۔"

پہلے تو میں سمجھتی تھی کہ سلطان میرے سلوک کی وجہ سے دیر سے گھر آتا ہے۔ اب معلوم ہُوا کہ وہ بھی مسلم لیگ کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ یہ میرے دل میں اُس کے خلاف بیٹھی ہوئی نفرت تھی کہ یہ بات سُن کر بھی اُس کے لئے میرے دل میں کوئی جگہ پیدا نہ ہوئی۔ میں نے اُن لڑکیوں کو ٹال کر فارغ کر دیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اُن دنوں میرے ذہن پر ایک ہی دُھن سوار تھی اس لئے میں نے پاکستان کی جدوجہد میں کوئی دلچسپی نہ لی اور دوسری بار جب وہ لڑکیاں میرے پاس آئیں تو میں نے اُنہیں صاف جواب دے دیا۔ میں نے اس بات کا ذکر بھی سلطان سے نہ کیا۔

ان باتوں کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو ہے تو بڑی بے شرمی والی لیکن میں اس کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں۔ میں نے شادی کے تین چار سالوں میں پوری کوشش کی کہ میں سلطان کے بچے کی ماں نہ بنوں اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہی۔

ایک روز سلطان ذرا دیر سے آیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُسے دو آدمی گھر چھوڑنے آئے تھے کیونکہ وہ زخمی تھا۔ مسلم لیگ والوں نے باہر ہی کسی ڈاکٹر سے اُس کی مرہم پٹی کروا دی تھی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ سلطان نے بتایا کہ آج شہر میں بڑا زوردار جلوس نکلا تھا۔ اُس نے ٹوانہ وزارت کا ذکر بھی کیا جس کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ تحریکِ پاکستان کا آخری

دَور تھا۔ ۱۹۴۷ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ مہینہ فروری یا مارچ کا تھا۔

"لڑکیوں نے تو آج کمال کر دیا حُور بانو!" — سلطان نے کہا — "وہ مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئیں ... پولیس نے بھی ظالمانہ تشدّد کیا ہے۔ کتنے ہی آدمی مارے گئے ہوں گے .... کتنے ہی آدمی آج گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔"

میں نے اُسے دودھ کا گلاس لا کر دیا اور دل ہی دل میں دعا کی — "خدایا! کسی کی آئی اگر اسے آجاتی تو....!"

پاکستان بن گیا۔ ہمیں تو کہیں بھی ہجرت نہیں کرنی پڑی لیکن ہم دونوں ابھی تک بے گھر تھے۔ ہماری ناکام ازدواجی زندگی کے آٹھ سال گزر گئے تھے لیکن ہم ایک گھر میں رہتے ہوتے بھی بے گھر مسافروں کی طرح رہتے تھے۔ غصّے کی جو آگ میرے اندر کھولتی رہتی تھی اُس کے شعلے اب بلند ہونے شروع ہو گئے تھے۔ سلطان کی محبت بھی بڑھتی جا رہی تھی اور اب میری آواز اور چیخ و پکار محلّے کے دوسرے گھروں میں بھی پہنچنا شروع ہو گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم اس طرح کیوں ہوتی جا رہی ہو" — ایک بار سلطان نے مجھے کہا تو میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے دل کا راز پا گیا ہے لیکن اُسے کوئی اور شُبہ گزرا تھا۔ اُس نے اُسی طرح محبت سے کہا جس طرح وہ عام طور پر مجھے مخاطب کیا کرتا تھا — "خدا نے تمہاری گود ہری کر دی تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں کل ہی تمہیں لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔"

اگلے روز وہ مجھے جب لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا اُس نے میرا معائنہ کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں ماں بننا نہیں چاہتی۔ اُس نے سلطان کو بلا کر اور کوئی بات تو نہ کی اُسے ایک اور ڈاکٹر کا پتہ دے کر کہا کہ اسے وہاں لے جاؤ۔ سلطان مجھے گھر لے آیا اور اُس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے ویسے بھی اس دوسرے ڈاکٹر

کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ یہ دوسرا ڈاکٹر نفسیات کا ڈاکٹر بھی تھا۔

دوسرے ڈاکٹر نے بھی مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ اُس کی بہت سی باتوں کا جواب میں نے نہیں دیا اور گھر واپس آگئی۔

"جانتی ہو اس ڈاکٹر نے مجھے کیا کہا ہے؟"——اُس روز سلطان نے اپنے مخصوص پیار بھرے لہجے میں کہا——"ڈاکٹر کہتا ہے کہ مریضہ کے اندر کوئی پچھتاوا، کوئی غصہ ہے جس نے اب جڑ پکڑ لی ہے اور اگر اس کا علاج نہ ہُوا تو مریضہ مکمل طور پہ ذہنی مریضہ بن جائے گی۔ اس ڈاکٹر نے تم سے اگلوانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن تم نے کوئی جواب نہیں دیا.... حُور بانو! میں نے اپنی ہر ممکن کوشش کر لی ہے کہ تمہیں خوش رکھوں لیکن اگر تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے تو صاف صاف بتا دو۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے دل سے پسند نہیں کرتیں۔ میں نے اس کے باوجود تمہیں ہر طرح محبت دی شاید اس سے میرے گناہ کا کفارہ ادا ہو جائے.... اگر تم مجھے نہیں بتاؤ گی کہ تمہارے دل میں کیا ہے تو میں سمجھوں گا کہ نو سال گزرنے کے بعد بھی تم نے مجھے اپنے بھائی کا خون معاف نہیں کیا۔"

"ہاں، میں نے اپنے بھائی کا خون معاف نہیں کیا"——میں بے قابو ہو گئی اور میں نے چلّا کر کہا——"اور نہ ہی مرتے دم تک معاف کروں گی۔ میں جس روز اپنے ہاتھوں سے تمہیں قتل کروں گی اُس روز میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی...."

یہ شاید پاگل پن تھا یا کیا تھا کہ میں نے وہ شعلے اُگل دیئے جو مجھے نو برسوں سے جلا رہے تھے۔ میں نے اُسے ایک ایک لمحے کی کہانی سنائی کہ میں اُسے کس طرح قتل کرنا چاہتی تھی اور وہ کس طرح میرے ہاتھ سے بچتا رہا اور اس ناکامی نے مجھے پاگل بنا دیا۔

سلطان تیزی سے اندر گیا اور اپنی بندوق اُٹھا لایا۔ اُس نے بندوق میں کارتوس لوڈ کیا اور مجھ سے کہنے لگا——"حور بانو! میں تمہاری محبت میں اپنی جان پر بھی کھیل جانے کو تیار ہوں"——یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور

اُس نے بندوق کا بٹ زمین سے لگا کر نالی اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ لی اور مجھ سے کہنے لگا——"حُور بانو! اگر تم میری موت سے ہی خوش ہو تو یوں ہی سہی.... میرے قریب آؤ اور بندوق کا ٹریگر دبا دو۔ گولی میرے دماغ سے پار ہو جائے گی اور سب یہی کہیں گے کہ شہزاد سلطان نے خودکشی کی ہے۔ تمہارے اُوپر حرف نہیں آئے گا.... میرے قریب آؤ.... جلدی کرو۔"

اُس نے یہ بھی کہا کہ خودکشی کرنے والے یہی طریقہ اختیار کیا کرتے ہیں۔ بندوق سے کسی کو قتل کرنے والے مقتول کی ٹھوڑی کے نیچے بندوق کی نالی نہیں رکھا کرتے۔ وہ گولی چلا دیا کرتے ہیں۔

"کارتوس کے چھرّے میری ٹھوڑی کے نیچے سے اُوپر جائیں گے تو سب یہی کہیں گے کہ یہ خودکشی ہے"——سلطان نے کہا——"تم باہر چلی جاؤ۔ میں تمہارا کام کر دیتا ہوں۔"

مجھ پر پاگل پن کا ایک اور دَورہ پڑا۔ میں اُس کے قریب گئی اور میں نے بندوق اُس کی ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ میں نے کارتوس نکال کر پھینک دیا اور پھر پتہ نہیں کیا ہُوا کہ میں اگلے ہی لمحے سلطان کے بازوؤں میں تھی۔ میں اُس کے سینے پر سر رکھ کر بہت روئی بلکہ ساری رات روتی رہی۔ اگلے روز میں ہلکی پھلکی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے میرے وجود پر سے سارا بوجھ اُتر گیا ہو۔ میں نے سلطان کو معاف کر دیا تھا۔

سلطان نے بھی مجھے معاف کر دیا۔

اس سے اگلے سال میری پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ پھر بیٹا پیدا ہُوا۔ میں دو سال بعد بابا جان سے ملنے گئی۔ وہ میرے بچّوں سے ملے اور اُن کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

"تمہارے بیٹے کی شکل اپنے ماموں سے ملتی ہے"——اُنہوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہا——"[illegible] وہ۔ اب ان بچّوں کو یتیم نہ کرنا۔"

"ہاں بابا جان!"——میں نے کہا——"اب میں وہ سانپ ہوں جس کا

زہر نکل گیا ہے۔ آپ بھی سلطان کو معاف کر دیں اور تنہا رہنے کی بجائے ہمارے ساتھ چل کر رہیں۔"

"میں ابھی اتنا بے غیرت بھی نہیں ہُوا" ۔۔۔ بابا جان نے بگڑ کر کہا ۔۔۔ "کہ اپنے بیٹے کے قاتل اور اپنی بیٹی کے خاوند کے پاس جا کر پناہ حاصل کر لوں۔"

باباجان کو نگہداشت کے لئے ہماری ضرورت بھی نہیں تھی۔ اُن کے وفادار نوکر اُن کے ساتھ تھے۔

میں نے جس روز سے سلطان کو معاف کیا تھا اُس روز کے بعد حُور بانو جو اپنے بھائی کی لاش کے ساتھ ہی دفن ہو گئی تھی دوبارہ پیدا ہوتی۔ میں نے اس کے بعد تیسری بیٹی کو بھی جنم دیا جس سے اب میں یہ کہانی لکھوا رہی ہوں۔ سلطان کو خدا جنت نصیب کرے، دس سال گزرے فوت ہو گیا ہے۔

بھٹکے راہی پیار کی منزل

یہ آپ بیتی میری امّی کی ہے۔ وہ بولتی جا رہی ہیں، مَیں لکھتی جا رہی ہوں۔ اُن کے بولنے کا مطلب یہ نہ سمجھیں کہ وہ بوڑھی عورتوں کی طرح ویسے ہی کچھ نہ کچھ بول رہی ہیں۔ وہ مجھ سے اپنی آپ بیتی لکھوا رہی ہیں۔ بڑھاپے نے اُن کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا کر دیا ہے، اس لئے وہ لکھ نہیں سکتیں۔ امّی پرانے زمانے کی میٹرکیولیٹ ہیں اور میں ایم۔ اے ہوں لیکن جو علم اُنہوں نے دس جماعتوں میں حاصل کیا ہے وہ میں سولہ جماعتوں میں حاصل نہیں کر سکی۔ یہ پرانے اور نئے زمانے کی تعلیم کا فرق ہے۔

امّی پر جو بیتی ہے وہ میں اُنہی کے الفاظ میں لکھ رہی ہوں۔ میرا قلم چل رہا ہے، زبان اُن کی ہے اور اب "میں" اُن کی ہے:

پہلے میری والدہ فوت ہوئیں پھر ڈیڑھ سال بعد والد صاحب بھی فوت ہو گئے۔ اُس وقت میری عمر پندرہ سال تھی۔ دنیا میں میرا کوئی رہ گیا تھا تو وہ میری بڑی بہن تھی جس کی عمر تیرہ سال سے کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔

وہ اسی شہر میں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ ہم دو بہنوں کے درمیان دو بھائی پیدا ہوتے تھے۔ دونوں فوت ہو گئے۔ میری والدہ کو انہی کا غم کھا گیا تھا۔ والدہ کو دوسرا غم یہ تھا کہ میری بڑی بہن کا خاوند اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس آدمی کو ہم نے کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہر وقت اُس کا مُنہ بنا رہتا تھا۔ بات غصے کی زبان میں یا شکوے شکایت کی زبان میں یا الزام عائد کرنے کے لہجے میں کرتا تھا۔

اب میں اپنی بڑی بہن کی ذمہ داری میں تھی لیکن عورت کی تو کوئی پوزیشن یا پاور نہیں ہوتی۔ اُس زمانے میں بھی ایسا ہی تھا، آج کے زمانے

میں بھی ایسا ہی ہے۔ میرا والی اور وارث میرا بہنوئی تھا۔ اُن کے تین بچے
تھے۔ بڑا لڑکا تھا جس کی عمر بارہ سال تھی۔ اُس سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی بہن
تھی اور اس سے دو اڑھائی سال چھوٹا ایک اور بھائی تھا۔ یہ بچے ہر وقت
خوف کی حالت میں رہتے تھے۔

ان بچوں کی حالت میں بعد میں سناؤں گی۔ میں پندرہ سال کی عمر میں
اپنے والدین کی اتنی بڑی حویلی میں اکیلی رہ گئی۔ ہماری حویلی کو لوگ چوبارہ کہا
کرتے تھے کیونکہ اس کی دو منزلیں تھیں۔ میری بہن کے سسرال کا بھی اپنا
مکان تھا لیکن میرے بہنوئی کی اپنے والدین کے ساتھ بن نہ سکی اور وہ
کرائے کے مکان میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے
والد صاحب بھی فوت ہو گئے تو میری بہن اور بہنوئی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ
ہماری حویلی میں آجائیں۔ یہی فیصلہ بہتر تھا۔ میرا بہنوئی اور بہن کرائے کا مکان
چھوڑ کر ہماری حویلی میں آگئے۔

میں اُس غم کا ذکر نہیں کرنا چاہتی جو والدین کی وفات نے مجھے دیا۔
بس اتنا کہہ دیتی ہوں کہ مجھے ایسے لگتا تھا جیسے میں دفن ہو گئی ہوں اور یہ
حویلی میرا مقبرہ بن گئی ہے۔ بہن، بہنوئی اور ان کے بچے آگئے تو تنہائی کا
جو احساس تھا، وہ ختم ہو گیا مگر تین چار دنوں بعد ہی میرا غم پہلے سے زیادہ
ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میرے والدین پیار کے پجاری تھے۔ گھر میں میرے
لئے شفقت تھی، سکون تھا اور غصے کا تو کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ ہوتا کیا ہے۔
ہم لوگ امیر نہیں تھے۔ بس یہ کہہ لیں کہ خوشحال تھے۔ والد صاحب کو تعلیم کا
بہت شوق تھا۔ اُس زمانے میں میٹرک تک تعلیم بہت سمجھی جاتی تھی۔ کوئی
کوئی لڑکا میٹرک تک پہنچتا تھا۔ لڑکیوں کی تو والدین سوچتے ہی نہیں تھے
کہ انہیں بھی دس جماعتیں پڑھائی جائیں۔ مسلمان اپنی لڑکیوں کو چار پانچ جماعتوں
سے آگے پڑھانا اچھا نہیں سمجھتے تھے، لیکن میرے والد صاحب کے خیالات
روشن تھے۔ مسلمانوں کے گرلز ہائی سکول ہوتے ہی نہیں تھے، ہندوؤں
کے ہائی سکول تھے۔ والد صاحب نے مجھے سناتن دھرم گرلز ہائی سکول میں

داخل کرا دیا تھا۔

جب والد صاحب فوت ہوتے تو میں نویں جماعت میں تھی۔ میرا
بہنوئی میری تعلیم جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ میری بہن کے زور دینے
پر اور میری ضد پر میں سکول جاتی رہی۔ میری تو اب دُنیا ہی بدل گئی تھی۔
میرے والدین، خصوصاً والد صاحب کی شفقت اور تربیت نے میرے دماغ
کو ایسی روشنی دی تھی جس نے مجھے غموں کے اندھیروں میں راستہ دکھایا اور میں
نے صدمے کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ میں نے اپنے دل کو یہ بھی سمجھا لیا کہ بہنوئی
میرے والد صاحب جیسا ہمدرد نہیں ہو سکتا اور مجھے اپنی بہن سے بھی توقع
نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ والدہ کی جگہ پُر کرے گی۔ مجھے اب حالات کے ساتھ
چلنا تھا۔ یہ میرے والدین کی تربیت کا اثر تھا کہ میں نے شکست قبول نہ کی۔

میں بتا رہی تھی کہ والدین کی زندگی میں میرے لئے پیار ہی پیار تھا۔
میرے والدین آپس میں کبھی نہیں لڑے تھے، مگر میری آپا اور میرا بہنوئی
آگئے تو ایسے ہوا جیسے سورج چمکا اور شبنم اُڑ گئی۔ حویلی میں غصہ اور فساد آگیا۔
میرے بہنوئی اور میری بہن نے آتے ہی آپس میں لڑائی جھگڑا کیا۔ اُن کے
بڑے بیٹے نے جس کا نام اویس تھا، ماں سے کہہ دیا کہ اس محلے میں آکر
شور نہ کریں۔ لوگ کہیں گے کہ یہ لڑاکے لوگ کہاں سے آگئے۔

بارہ سال کے بچے کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی لیکن میری آپا نے جو
غصہ اپنے خاوند پر نہیں نکال سکتی تھی، وہ بچے پر اس طرح نکالا کہ اُس
کے مُنہ پر بڑی زور سے تھپڑ مار کر کہا ——"تو میرا باپ کہاں سے آگیا
ہے!"—— بچہ تیورا کر پیچھے ہٹا تو پیچھے سے ایک تھپڑ باپ نے جما دیا اور
بولا ——"حرام کی اولاد! سو دفعہ کہا ہے بڑوں کی بات میں مت بولا کر۔"
اویس باپ کے تھپڑ سے پلنگ کے ساتھ جا لگا اور فرش پر گر پڑا۔
بڑا پیارا بچہ تھا۔ میں دوڑی اور اُسے اُٹھایا۔ میرا بہنوئی بڑی زور سے
گرجا ——"پڑا رہنے دے اسے یہیں"—— میں ڈر تو گئی لیکن بچے کو

اُٹھا کر اوپر لے گئی۔ کمرے میں جا کر میں کرسی پر بیٹھی۔ اویس فرش پر میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اُسے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا پھر میں اتنی روئی کہ میری ہچکی بندھ گئی۔ میں اپنی والدہ اور پھر والد صاحب کی وفات پر بھی ایسے ہی روئی تھی۔

"خالہ!... خالہ جی!" ___ اویس مجھے ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا ___ "نہ روئیں نا خالہ!... نہ روئیں نا خالہ! اُنہوں نے تو مجھے مارا ہے۔ آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔"

میں فوراً چپ ہو گئی اور اس پیارے اور خوبصورت بچے کے دونوں گالوں کو میں نے چوما۔

"مجھے اسی طرح مار پڑتی رہتی ہے" ___ اویس نے کہا ___ "امی ابا آپس میں لڑتے ہیں تو مجھے مارتے ہیں۔ میں نہ ہوں تو کاکی (چھوٹی بہن) کو مارتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ایسے ہی ہوتا ہے۔"

اُس کے گھر میں ایسے ہی ہوتا ہو گا، ہمارے گھر میں ایسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اویس کو پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تم اُوپر میرے ساتھ ہی رہا کرو ویسی!" ___ میں نے اُس کا گال چوم کر کہا ___ "سکول سے آ کر اوپر آ جایا کرو۔"

یہ میں نے ایک ہی واقعہ سنایا ہے۔ اس سے زیادہ دردناک واقعات سُنا سکتی ہوں۔ یہ تو ایسے تھا جیسے قصائی ہر روز بکرے ذبح کرتے ہیں۔ اویس نے ٹھیک کہا تھا کہ ہمارے گھر میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ میرا گھر جنت تھا جو جہنم بن گیا۔ میں تو اس پر حیران ہوتی تھی کہ میری آپا کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو بڑی پیاری عورت تھیں۔ اُن کی طبیعت خوشگوار رہتی تھی مگر یہ تو جاہل عورتوں کی طرح تجربہ کار لڑاکی ہو گئی تھیں۔

"آپا!" ___ میں نے تین چار روز بعد ایک اور لڑائی کے بعد اپنی بہن سے کہا ___ "آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ تو..."

میری بہن نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔ کہنے لگی ___ "اگر میں ایسی نہ ہو جاتی جیسی تم دیکھ رہی ہو تو میری ساس اور اُس کی بیٹیاں مجھے

گھر کی بھنگن بنا کر رکھتیں۔ ہمیں والدین نے سبق دیتے تھے کہ پیار اور محبت سے رہو اور جو بات کہنی ہے وہ سب کے سامنے کہو مگر میرے سسرال کا دستور کچھ اور تھا۔ میرا خاوند اور سسر گھر نہیں ہوتے تھے تو میری ساس مجھے دشمن سمجھ کر ایک سے ایک بُری بات مُنہ سے نکالتی تھی۔ میری دونوں نندیں بھی ایسے ہی کرتی تھیں۔ پہلے تو میں برداشت کرتی رہی پھر میں پھٹ پڑی۔ ایسے ہوتا کہ ساس مجھے بھڑکا دیتی اور میں واہی تباہی بکنے لگتی۔ خاوند اور سسر آ جاتے اور دیکھتے کہ میں بک بک کر رہی ہوں اور میری ساس اور نندیں اس طرح اِدھر اُدھر بیٹھ جاتیں جیسے میں بڑی لڑاکی اور بدتمیز ہوں اور یہ بے چاری مظلوم ہیں....

"اڑوس پڑوس والے بھی یہی دیکھتے کہ بول میں رہی ہوں اور میری ساس کونے میں چُپ چاپ بیٹھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سسر اور خاوند مجھے قصوروار کہنے لگے۔ میری ساس عجیب طریقوں سے میرے خاوند کو میرے خلاف بھڑکاتی۔ مجھے یہ اوچھے طریقے والدین نے کبھی بتاتے نہیں تھے۔ میری ساس میرے سسر اور خاوند کی غیر حاضری میرے گلے پڑ جاتی اور ناقابلِ برداشت باتیں کہتی۔ میں جب اپنے خاوند کو بتاتی تو وہ میری مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ اُس کی ماں اور بہنیں تو معصوم اور مظلوم بنی چُپ بیٹھی ہیں....

"ہماری ایک پڑوسن نے ایک روز مجھے میری ساس کی کچھ باتیں سنائیں اور کہنے لگی کہ یہ عورت تو ہے ہی فسادی۔ یہ تو تمہیں طلاق دلا کر رہے گی۔ پڑوسن نے مجھے اس کا علاج بتایا۔ یہ تو پہلے ہی کرنا چاہتی تھی۔ وہ میں نے کیا۔ میں اپنے والد کی تربیت کو دل سے نکال کر ساس جیسی ہو گئی۔ میں نے اُسے کہہ دیا کہ اب مجھے نہ اپنی عزت کا پاس ہے نہ کسی اور کی عزت کا۔ میں نے ساس اور نندوں کا جینا حرام کر دیا۔ میرا خاوند آخر سمجھ گیا کہ فساد کی جڑ کہاں ہے۔ ایک روز وہ اپنی ماں سے لڑا اور دوسرے دن ہم نے کرائے کا مکان لیا اور وہاں چلے گئے لیکن میرا خاوند اُسی ماں کا بیٹا ہے۔

میری ساس اپنے خاوند کے ساتھ لڑتی جھگڑتی رہتی تھی، پھر دونوں ذرا ذرا بات پر اپنے بچوں کی پٹائی کر دیتے تھے۔"

میں سارا معاملہ سمجھ گئی۔ میرے بہنوئی نے ایسے ہی گھریلو ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اُس کی فطرت اور ذہنیت اسی ماحول نے بنائی تھی۔ لہٰذا اُس نے اپنی فطرت کے مطابق اپنے گھر کا ماحول ویسا ہی بنا دیا۔ اُس ماحول کو میری آپا بہتر بنا سکتی تھی لیکن اُس کی فطرت بھی یہ بن چکی تھی کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ اُس کا خاوند محبت کرنے والا نہیں حکم چلانے اور اپنی بات منوانے والا خاوند تھا۔ میری بہن کو تو اپنی مرضی سے ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

گھروں میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں اور گندی ذہنیتوں کے مظاہرے ہوتے ہیں جو بڑے اچھے اور قابلِ قدر انسانوں کے حُلیے بگاڑ دیتے ہیں اور انہی سے بچوں کی ذہنیت بنتی ہے۔ بھلے مانس بدمعاش بن جاتے ہیں۔ ایسے بگولوں کی لپیٹ میں میری بہن آگئی اور اُس کا یہ حال ہو گیا کہ میں اب اُسے صرف چہرے سے پہچانتی تھی۔ اُس کی شادی کو بارہ تیرہ سال گزر گئے تھے۔ اپنے والدین نے اُس کی جو فطرت بنائی تھی اُس پر زنگ چڑھ گیا تھا —— یہ زنگ اب اُن کے بچوں پر چڑھ رہا تھا۔

باپ گھر آتا تھا تو لگتا تھا جیسے بچے سو گئے ہوں یا زمین میں اُتر گئے ہوں۔ اگر کوئی بچہ باپ کو نظر آجاتا تو باپ کے مُنہ سے بے اختیار نکل جاتا —— "اوتے، اِدھر آ" —— بچہ خوفزدہ حالت میں مجرموں کی طرح اپنے باپ کے سامنے جاتا تو باپ پوچھتا —— "کہاں جا رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟" —— بچہ جو کچھ بھی جواب دیتا، باپ اُسے کوئی نہ کوئی حکم دے دیتا اور یہ حکم تھانیداروں جیسا ہوتا۔ بچوں کے لئے گھر میں دھتکار اور پھٹکار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری بہن جب بولتی تھی تو ایسے لگتا تھا جیسے چھُری چل رہی ہو۔

ادیس کو میں نے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ پیار کے لئے ترستا تھا۔ مجھ

سے اُسے پیار ملنے لگا۔ پھر میں نے رات کو اُسے اپنے پاس سلانا شروع کر دیا۔ وہ میرے ساتھ لیٹ کر سوتا تھا۔ گھر میں صرف میں تھی جس کی وہ بات مانتا تھا۔ اپنی ماں کو تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ میری یہ ایک بات بھی جو وہ نہیں مانتا تھا کہ اپنی ماں کا کہا مانا کرے۔ دو تین مرتبہ اُس نے مجھے کہا —— "آپ کو معلوم نہیں خالہ! میری امی اور ابا بڑے گندے ہیں" —— ایک مرتبہ اُس نے کہا —— "اگر آپ نہ ہوتیں تو میں اس گھر سے بھاگ جاتا" —— اور مجھے اُس وقت بہت دُکھ ہُوا جب اُس نے کہا —— "یہ میرے ماں باپ ہیں ہی نہیں۔ یہ مجھے کہیں سے اُٹھا لاتے ہیں۔"

بارہ تیرہ سال کی عمر کے بچے تو بڑی پیاری پیاری باتیں کیا کرتے ہیں۔ شوخیاں کرتے ہیں اور ماں باپ کو اچھے لگتے ہیں مگر ادیس جیسا خوبصورت اور پیارا بچہ گلی سڑی اور پختہ باتیں کرتا تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے جوان ہو گیا تھا۔ وہ بچہ صرف رات کو لگتا تھا جب وہ میرے ساتھ سویا ہُوا ہوتا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن اور بھائی بھی میرے ساتھ گھل مل گئے تھے لیکن میرے کمرے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے تھے۔ کہتے تھے ابا ماریں گے۔

میں نے ان ہنگاموں اور دنگا فساد میں میٹرک پاس کر لیا۔ ادیس آٹھویں جماعت میں تھا۔ وہ پڑھنے میں اچھا تھا لیکن کہتا تھا کہ پڑھائی میں اُس کا دل نہیں لگتا۔ ہفتے میں ایک بار کبھی دو بار اپنے باپ کے ہاتھوں اُس کی پٹائی ہوتی تھی جس کی وجہ بہت ہی معمولی ہوتی تھی۔ اکثر وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ ماں کا یا باپ کا کوئی حکم نہیں مانتا تھا۔ اب اُس نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں ان کے باپ کا نوکر تو نہیں۔

میں نوعمر تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس گھر کے حالات کو کس طرح سیدھا کیا جائے۔ میں خود اپنے آپ میں اس ماحول کے اثرات محسوس کر رہی تھی۔ میں یہ سمجھ گئی تھی کہ ادیس خراب ہو رہا ہے۔ اس کے بعد میں یہ بھی سمجھ گئی کہ جب میری بہن اور بہنوئی بوڑھے ہو جائیں گے تو ادیس ان کا سہارا بننے سے صاف انکار کر دے گا مگر میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا

سوائے اس کے کہ میں اویس کو وہ پیار دیتی جو اسے اپنے والدین سے ملنا چاہیئے تھا۔

میٹرک کر کے میں نے گھر میں آپا کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ پہلے تو میں سکول جاتی اور گھر آکر پڑھنے بیٹھ جاتی تھی اور اویس کے لئے بھی وقت نکال لیتی تھی، اب پڑھائی ختم ہو گئی تھی۔ سارا دن گھر رہنا پڑتا تھا۔ میری دو کلاس فیلو ہندو لڑکیاں میری گہری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اُنہوں نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اُنہوں نے مجھ پر یہ احسان کیا کہ میرے ساتھ دوستی قائم رکھی۔ دونوں کے گھر ہمارے محلے کے قریب تھے۔ کبھی ان میں سے کوئی آجاتی۔ کبھی دونوں آجاتیں۔ کبھی میں انہیں مِل آتی۔ اُن سے میں کتابیں لے آتی اور پڑھتی رہتی تھی۔ ان میں انگریزی کی کتابیں بھی ہوتی تھیں اور اُردو کی بھی۔ یہ ناول نہیں تھے نہ مجھے عام سے ناولوں کے ساتھ دلچسپی تھی۔ ان لڑکیوں کی مدد سے میرا مطالعہ جاری رہا جو وسیع ہوتا گیا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور اس گھر کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ میرے بہنوئی میں تلخی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ اس کے جواب میں میری بہن اور زیادہ چڑچڑی اور غصیلی ہو گئی۔ وہ تو مجھے بھی نہیں بخشتی تھی۔ اُس کے دل میں میرا پیار بھی نہیں رہا تھا۔ البتہ بہنوئی نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا تھا، بلکہ میری بھول چوک کو بھی برداشت کر لیتا تھا۔ ایک روز میں اپنی ایک ہندو سہیلی کے گھر سے واپس آئی تو میری بہن نے مجھ پر غصہ جھاڑ دیا کہ باہر نہ پھرتی رہا کرو۔ بہنوئی اتفاق سے گھر تھا۔ اُس نے سُن لیا۔

"قیدی بنا کے رکھو گی اسے؟" — میرے بہنوئی نے تلخ لہجے میں کہا — "سینما تماشہ دیکھنے تو نہیں گئی تھی۔"

"یہ میری بہن ہے" — میری آپا نے جل کر کہا — "اس کے نیک اور بد کی ذمہ دار میں ہوں..... گھر رہا کرے۔"

"کیا ہے اس گھر میں جو یہ گھر میں ہی بیٹھی رہا کرے؟" — بہنوئی نے

اپنی مخصوص بلند آواز سے کہا — "مَیں تو مجبور ہوں جو اس گھر میں آجاتا ہوں۔"

میری بہن برتن دھو رہی تھی۔ اُس نے برتن وہیں چھوڑے اور مورچہ باندھ لیا۔ میاں بیوی کو بہانے کی ضرورت تھی، وہ انہیں مل گیا۔ مَیں نے آپا کو چُپ کرانے کی بہت کوشش کی تو اُس نے ایک ہی سانس میں تین چار گالیاں مجھے دے دیں۔ میں اُوپر چلی گئی اور تینوں بچے پناہ گزینوں کی طرح میرے پاس آگئے — یہی اس گھر کا معمول تھا۔

دو سال اور گزر گئے۔ اویس میٹرک کا امتحان دے رہا تھا میں اُسے پڑھاتی تھی۔ اب وہ سیانا ہو گیا تھا، بلکہ اپنی عمر کی نسبت زیادہ سیانا ہو گیا تھا۔ وہ جب دسویں جماعت میں پہنچا تھا تو اس کے بعد میں اُس میں کچھ تبدیلیاں دیکھ رہی تھی۔ یہ تبدیلیاں پوری طرح واضح تو نہیں تھیں لیکن میں یہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی دوستی اچھے لڑکوں کے ساتھ نہیں۔ ایک رات مجھے اُس کے مُنہ سے سگریٹ کی بُو آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ سگریٹ پیتے ہو؟ اُس نے میرے مُنہ پر نظریں جما دیں۔ میں نے ذرا رعب سے پوچھا۔

"اگر ابا یا امی میری گردن پر تلوار رکھ کر یہی بات پوچھتے تو میں صاف انکار کر دیتا" — اُس نے کہا — "آپ کے آگے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں کئی دنوں سے دن میں دو تین بار سگریٹ کے ایک دو کش لگا رہا ہوں۔"

آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میں نے اُسے کیا لیکچر دیا ہو گا۔

"مجھے سگریٹ پینے کی خواہش نہیں ہوتی خالہ!" — اُس نے کہا — "بس، ایسے ہی دل کرتا ہے کہ اُلٹی اُلٹی حرکتیں کروں۔ دوسروں پر رُعب جماؤں اور سب میرے آگے جھکے رہیں۔"

"تم غنڈے اور بدمعاش بننا چاہتے ہو" — میں نے کہا۔

"شاید یہی بات ہے" — اُس نے کہا۔

"پھر تم میرے پاس نہ آیا کرو" — میں نے کہا۔

اُس نے اس طرح میرے مُنہ کی طرف دیکھا جیسے کسی نے اُس کے

جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیتے ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چل پڑا۔ مجھے بہت افسوس ہُوا۔ وہ اس طرح مایوس ہو کر چل پڑا تھا جیسے کسی بھکاری سے کہہ دیا جاتے کہ بابا معاف کرو۔ میں نے اُسے واپس بُلا لیا۔ اُس نے خود کہا ——"آئندہ سگریٹ نہیں پیئوں گا"—— میں نے اُسے گلے لگا لیا۔

میری عمر انیس سال ہونے والی تھی اور اویس سولہ سال کا ہو رہا تھا۔ وہ جوان ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے دو تین مرتبہ کہا تھا کہ وہ میرے کمرے میں ہی سویا کرے لیکن الگ۔ وہ نہ مانا۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ جوان ہو گیا ہے۔

"میں آپ کے لئے جوان نہیں ہُوا خالہ!"—— اُس نے مایُوسی کے لہجے میں کہا ——"مجھے اپنا بچّہ سمجھتی رہیں۔ میں وہاں نہیں سو سکتا جہاں میری امّی اور ابّا سوتے ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر اُسے یہ بات سمجھائی تو اُس نے کہا کہ میں پھر گھر سے بھاگ جاؤں گا۔ اس عمر میں اُسے میرے پاس نہیں سونا چاہیئے تھا لیکن وہ میرے ساتھ لگ کر سوتا تھا تو دُودھ پیتا بچّہ لگتا تھا۔ میں اُسے معصوم اور مظلوم بچّہ سمجھتی تھی۔ میں ایک بات یہیں کہہ دینا چاہتی ہوں کہ آگے چل کر حالات نے مجھے بڑی سخت آزمائش میں ڈالا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر خاص کرم کیا تھا۔ میں آج بھی کہتی ہوں کہ اللہ نے مجھے اسی نیکی کا صلہ دیا تھا کہ میں نے ایک مظلوم بچے کو وہ پیار دیا تھا جس کے لئے وہ ترس رہا تھا۔

اویس آخری پیپر دے کر آیا۔ ماں نے اُس سے پوچھا پرچہ کیسا ہُوا ہے؟ اویس نے بے رُخی سے کہا اچھا ہو گیا ہے۔

"اگر فیل ہو گئے تو جُوتے مار کر گھر سے نکال دوں گی"—— ماں نے فیصلہ سنایا۔

میں نے اُسے کہا کہ وہ اُوپر چلے، میں کھانا لے کر آتی ہوں۔ میں کھانا لے کر گئی اور اُس سے پوچھا کہ آج کا پیپر کیسا رہا؟ اُس نے مجھے بڑے آرام سے بتایا کہ تسلی بخش ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ فسٹ ڈویژن میں تو نہیں آئے گا، فسٹ ڈویژن کے قریب قریب نمبر لے گا۔

شام کو میرا بہنوئی گھر آیا تو اویس کو جس طرح بلایا اور اویس کے ساتھ اس کے جو مکالمے ہوتے وہ مجھے آج تک یاد ہیں۔

"او.... او بندر کی اولاد!"—— باپ نے اویس کو بلایا ——"اِدھر آ .... آج کیا کر آیا ہے تُو؟ .... جھوٹ بولا تو مُرغا بنا کر جُوتے ماروں گا۔"

"آج کا پرچہ بہت بُرا ہُوا ہے"—— اویس نے بڑی دلیری سے کہا۔

باپ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اویس کو میں نے دیکھا۔ وہ پہلے کی طرح ڈرا نہیں۔ باپ نے اُس کے مُنہ پر تھپّڑ مارا۔ اویس دوڑتا ہُوا کمرے سے نکلا۔ ہم سب سمجھے کہ بھاگ گیا ہے۔ باپ نے اُسے گالی دے کر بلایا۔ وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔

"آجا!"—— اویس نے باپ کو للکارا ——"آج مرغا بنا کے دیکھ۔"

باپ غصّے سے آگے بڑھا۔ اویس نے گھما کر ڈنڈا مارا جو باپ کے کندھے پر پڑا۔ وہ دوسری بار ڈنڈا مارنے لگا تو باپ پیچھے ہٹا۔ میرا تو خون خشک ہو گیا۔ میری بہن واہی تباہی بکتی اویس کی طرف گئی۔ اویس نے اُسے کہا —— آجا تو بھی۔"

اویس کی آنکھوں میں خون اُترا ہُوا تھا۔ وہ جب ماں کو ڈنڈا مارنے لگا تو میں نے چلّا کر کہا ——"وسی!"—— اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے غصّے سے کہا ——"خبردار"—— اُس نے ڈنڈا پیچھے کر لیا۔ اُسے بے خبر دیکھ کر باپ اُس پر جھپٹا، اُدھر سے ماں نے لپک کر اُس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا۔ دونوں نے اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اُن کے درمیان آنے کی کوشش کی۔ میں چلّا رہی تھی ——"بھائی جان!.... آپا.... اس نے میرے کہنے پر ہاتھ روک لیا تھا۔ چھوڑیں اسے"——

لیکن میری آپا نے ایک تھپڑ مجھے جڑ دیا اور بولی — "تُو نے اسے بگاڑا ہے۔ تُو نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔"

اویس میں بھی طاقت تھی۔ اُس کی رگوں میں زہر بھرا ہُوا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو چھُڑا لیا اور باہر کو دوڑ پڑا۔ اُس کے ماں باپ غصّے میں تھے۔ باپ کہتا تھا کہ واپس آئے، میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ ماں کہتی تھی کہ میں اس کا کلیجہ نکال کر کھا جاؤں گی۔ اویس کی چھوٹی بہن اور بھائی ڈرے ہوئے کمرے میں دبکے بیٹھے تھے۔ میں اُوپر چلی گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ میرے آنسو بہنے لگے۔ پھر میری ہچکی بندھ گئی۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ مجھے بہلانے والا اور سمجھانے والا کوئی نہ تھا۔ میں رونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے ساری رات اویس کا انتظار کیا۔ وہ نہ آیا۔ آدھی رات کو نیچے گئی تو وہاں خاموشی تھی۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ میں سمجھی کہ اویس آ گیا ہو گا اور اسی خیال سے نیچے ہی سو گیا ہو گا کہ میں سو گئی ہوں اور بے آرام ہوں گی۔

صبح پتہ چلا کہ اویس نہیں آیا۔ میری آپا پریشان تھی اور بہنوئی میرا پھُنکار رہا تھا۔ اویس دن کو بھی نہ آیا، پھر دس بارہ دن گزر گئے تب باپ پریشان ہُوا اور بیٹے کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ تھانے بھی گیا مگر بہت دن گزر چکے تھے۔ تھانے والوں نے اُسے کہا کہ کسی پر شک ہو تو اُس کا نام بتاؤ اور کہو کہ اُس نے لڑکے کو اغوا کر کے قتل کر دیا ہے۔ باپ کو کسی پر بھی شک نہیں تھا۔

دو سال گزر گئے۔ اویس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ گھر میں یہ تبدیلی آئی کہ لڑائی جھگڑے بند ہو گئے تھے مگر گھر میں ہر وقت ماتم کی فضا رہتی تھی۔ کوئی کسی کے ساتھ بات نہیں کرتا تھا۔ اب میرے بہنوئی نے یہ معمول بنا لیا کہ کبھی کبھی میرے کمرے میں آ جاتا اور اُداس اُداس اور ہاری ہاری سی باتیں کرتا۔ میں اُس کی باتیں توجہ سے سُنتی اور ہمدردی کے دو کلمے کہہ

دیا کرتی تھی۔ اویس کی طرح میرے بہنوئی کو بھی میرے کمرے میں سکون ملتا تھا۔ میں تو اُس سے ڈرتی تھی لیکن وہ اب میرے ساتھ دُکھ سُکھ کی باتیں کرتا تھا جن سے میرے دل سے اُس کا ڈر نکل گیا اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اُس نے دیکھا کہ میں کتابیں پڑھتی رہتی ہوں تو وہ میرے لئے ناول لے آیا۔ پھر اُس نے مجھے فلمی رسالے لا کر دیئے۔ ان ناولوں میں گھٹیا سی عشق بازی تھی۔ یہ میرا ذوق نہیں تھا لیکن میں نے بہنوئی کا دل رکھنے کی خاطر اُسے نہ بتایا کہ میں یہ ناول نہیں پڑھا کرتی اور فلمی رسالوں کے ساتھ مجھے برائے نام بھی دلچسپی نہیں ہے۔

میں نے آپا سے کہا کہ بھائی جان بہت دُکھی ہیں اور اویس کے غم نے انہیں نڈھال کر دیا ہے۔ میں آپا سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ اب اچھا سلوک کیا کرے مگر آپا نے میری بات پوری نہ ہونے دی۔ یہی آپا میں خرابی تھی کہ کسی کی پوری بات سُنتی ہی نہیں تھی۔ ذرا سے اشارے پر بولنا شروع کر دیتی تھی۔

"تُو نہیں جانتی اس آدمی کو" — آپا نے کہا — "بڑا بے ایمان اور مکار ہے۔ میری تو اس نے زندگی حرام کر دی ہے .... اور سُن! اس کے ساتھ زیادہ مُنہ نہ لگانا۔ نیّت کا بہت بُرا آدمی ہے۔ یہ تمہارے پاس اُوپر جا کر بیٹھا رہتا ہے۔ اس سے ذرا دُور ہی رہنا۔"

مجھے آپا کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ تو میرا بھائی اور میرا باپ ہے۔ آپا کو میری یہ بات اچھی نہ لگی اور اُس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے تو اس کی باتوں میں آ گئی ہے۔ مطلب یہ سمجھ لیں کہ آپا کو اپنے خاوند کے اخلاق پر اعتبار نہیں تھا۔

ایک اور سال گزر گیا۔

میری عمر تیئیس سال ہونے والی تھی۔ اویس کی واپسی کی اُمیدیں ختم ہو گئی تھیں۔ آپا اُسے یاد کر کے روتی تھی۔ اس دوران آپا کے ایک بچہ ہُوا۔

لڑکا تھا۔ اب گھر کا سارا کام اور باورچی خانہ میرے اُوپر آ گیا۔ آپا کی زچگی میں اس کی تیمارداری بھی میرے ذمے تھی۔ آپا کے جسم میں اب پہلے والی جان نہیں رہی تھی۔ عمر چھتیس سال سے اُوپر ہو گئی تھی۔ اُس نے زچگی سے اُٹھتے بہت دن لگا دیئے۔ ان دنوں میرا بہنوئی میرے کمرے میں زیادہ آتا رہا اور پہلے سے زیادہ باتیں کرتا رہا۔

ایک روز آپا نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگی — "میرا خیال ہے کہ تم نے اپنے بہنوئی کو بھائی اور باپ سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔"

"وہ کیسے آپا؟" — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میری اس بڑی بہن نے جو جو الفاظ مُنہ سے نکالے، وہ میں پورے کے پورے لکھ نہیں سکتی۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اُس کے خاوند کے ساتھ قابلِ اعتراض تعلق پیدا کر لیا ہے۔ اُس روز مجھے احساس ہُوا کہ میں کتنی مجبور اور بے بس ہو گئی ہوں۔ مَیں رو پڑی اور بہن کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُس کا شک بالکل غلط ہے مگر بہن میں یہی تو خرابی تھی کہ صلح اور صفائی کے قائل نہیں تھی، وہ لڑائی کے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ اُس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا۔ پہلے مجھ پر رُعب جھاڑتی رہی پھر نرم پڑ گئی۔

"میں ہو گزری ہوں مُنّی!" — آپا نے جذباتی لہجے میں کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی — "تم جوان ہو اور اتنی زیادہ خوبصورت ہو کہ شریف آدمی بھی تمہیں رُک کر دیکھتے ہوں گے۔ میرے خاوند کا تو کوئی مذہب ہی نہیں۔ اسے جب دیکھتی ہوں اُوپر گیا ہُوا ہوتا ہے۔"

"آپا!" — میں نے کہا — "آپ نے میری شادی کی کبھی بات نہیں کی۔ میری شادی کر دیں۔ میں یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی۔ کوئی غریب سا آدمی ہی مل جائے، میں اللہ کا شکر ادا کروں گی۔"

آپا خاموش ہو گئی۔ اُس نے سر ہلایا اور سوچ میں پڑ گئی۔ اُس شام کو میرا بہنوئی اوپر میرے کمرے میں آیا تو میں اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

اُس نے مجھے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے مجھے اُس کی نیت پر شک ہوتا۔ البتہ یہ بات شک والی تھی کہ اُس نے میرے ساتھ اپنا رویہ بڑا اچھا رکھا ہُوا تھا اور وہ میرے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا، اپنے دُکھ مجھے سناتا اور میری بہن کے خلاف باتیں کرتا تھا۔ میری ایک کمزوری یہ تھی کہ میں پیار اور شفقت کی ترسی ہوئی تھی اس لئے بہنوئی کی یہ باتیں اور اُس کا میرے پاس آنا اچھا لگتا تھا مگر آپا کی شکایت کے بعد میں محتاط ہو گئی۔

اُس شام بہنوئی میرے پاس آیا تو میں نے اُسے کہا کہ وہ میری شادی کرا دے۔ اُس نے اس طرح چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا جیسے اُسے افسوس ہُوا ہو۔ اُس نے پوچھا کہ یہ خیال مجھے کیوں آیا ہے۔ میں نے کہا کہ میری شادی تو ہونی ہی ہے۔ اُس نے میرے خیال کے خلاف دلیلیں دینی شروع کر دیں۔ اُس نے اشاروں اشاروں میں مجھے اس شک میں ڈال دیا کہ اُسے میرے ساتھ کوئی اور ہی دلچسپی ہے۔ میں ناتجربہ کار تھی۔ میرے مُنہ سے نکل گیا کہ آپا ہم دونوں پر شک کرتی ہے۔

اس کا نتیجہ بہت بُرا ہُوا۔ بہنوئی بھڑک پڑا۔ پہلے تو اُس نے مجھے کہا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو اور اس سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا پھر وہ نیچے گیا اور میری بہن سے اُلجھ پڑا۔ ان کی ویسی ہی لڑائی ہوئی جیسا ان کا معمول تھا۔ اگلے روز آپا میرے گلے پڑ گئی۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ شام کو مَیں اُوپر آئی تو بہنوئی بھی آ گیا۔ میں نے اُسے صاف کہہ دیا کہ وہ میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔ اُس نے مجھے بہلانے اور ورغلانے کی کوشش کی لیکن میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔ مَیں نے اُسے بڑے اچھے لفظوں میں دھتکار دیا۔

"دیکھ مُنّی!" — اُس نے کہا — "تُو میرے پاس رہتی ہے، سوچ لے۔"

"تم اپنے پورے خاندان سمیت میرے ساتھ رہتے ہو" — میں نے جل کر کہا — "یہ مکان میرے ماں باپ کا ہے تمہارا نہیں۔"

"آدھا مکان تمہارا ہے" — اُس نے بڑے اوچھے لہجے میں کہا — "آدھا تمہاری بہن کا ہے۔"

بات کچھ اور ہو رہی تھی اور اُس نے مکان کی تقسیم شروع کر دی ہیں
پھر اصل مسئلے پر آ گئی اور اُسے کہا کہ میں اُس کے منہ لگنا بھی برداشت نہیں
کر سکتی۔ اس طرح اُس کے ساتھ تلخ کلامی ہو گئی۔ میرے لئے یہ مشکل پیدا
ہو گئی کہ آپا بھی میرے خلاف ہی رہی۔ میرے لئے یہ گھر صحیح معنوں میں
جہنم بن گیا۔ مجھے تو اپنا راستہ بنانا تھا۔ میرا کردار میرے قبضے میں تھا اور میرا
ایمان مضبوط تھا اس لئے میری جرأت قائم تھی۔ اس قسم کے ماحول کی لڑکیاں
عموماً عشق و محبت کا کھیل کھیلا کرتی ہیں جو دراصل فرار کا اور پناہ کی تلاش
کا ذریعہ ہوتا ہے، لیکن میں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی کہ میری
نظر حقیقت پر تھی۔ میرے ساتھ فلمی محبت کے ڈرامے کھیلنے والوں کی کمی
نہیں تھی۔ مجھے میری ہمجولی لڑکیاں بتایا کرتی تھیں کہ میری جوانی اور خوبصورتی
کے چرچے گلیوں میں ہوتے ہیں لیکن میں نے اپنے آپ کو ٹھکانے رکھا ہوا تھا۔

میں نے آپا اور بہنوئی سے کہنا شروع کر دیا کہ میری شادی کر دیں ورنہ
میں اپنا انتظام خود کر لوں گی۔ اُدھر آپا کی اپنی بیٹی جوان ہو گئی تھی۔ انہیں
اپنی بیٹی کی فکر تھی اور انہوں نے اُس کے لئے کچھ بھی نہیں بنایا تھا۔ زیور کی
ایک انگوٹھی بھی نہیں بنی تھی۔ اِدھر میں نے ضد شروع کر دی۔

سات آٹھ مہینے گزرے تو آپا نے ایک روز مجھے کہا کہ میرے بہنوئی
نے ایک آدمی کے ساتھ میری بات پکی کر دی ہے۔ میں نے نہ پوچھا کہ وہ
کون ہے، کہاں کا رہنے والا ہے اور کیا کرتا ہے، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا
کہ اس گھر سے نکلنے کا راستہ مل گیا ہے۔ دس بارہ دنوں بعد مجھے بتایا گیا کہ آج
شام میری شادی ہو جائے گی۔

آپا نے مجھے نئے کپڑے پہنائے۔ معمولی سا زیور تھا جو امی کے وقتوں
کا پڑا ہوا تھا۔ شام کو نکاح خوان اور پانچ آدمی آئے۔ نکاح ہوا اور شادی
ہو گئی۔ میں روتی ہوئی گھر سے نکلی۔ پڑوسیوں کو بھی پتہ نہیں چلا ہو گا کہ میں
دلہن بن کر جا رہی ہوں۔ میرا دولہا مجھے ریلوے سٹیشن لے گیا۔ ساری رات
ریل گاڑی میں گزر گئی۔ دوسرے دن بارہ بجے کے ذرا بعد گاڑی نے انبالہ

پہنچا دیا۔ دولہا نے مجھے تانگے پر بٹھایا اور اپنے گھر لے گیا۔ گھر اتنا بڑا
نہیں تھا لیکن اچھا تھا۔ بڑا صاف ستھرا اور نئی طرز کا بنا ہوا تھا مگر اس
میں دولہا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ہم جب آئے تو باہر تالا لگا ہوا تھا۔
چابی دولہا کے پاس تھی۔

جی چاہتا ہے کہ پہلی رات کی ساری باتیں سناؤں لیکن یہ باتیں
بڑی لمبی ہیں اور اصل کہانی رہ جائے گی۔ مختصر یوں ہے کہ میں ڈری ہوئی
تھی کہ دولہا میرے بہنوئی جیسا ہو گا یا معلوم نہیں کیسا ہو گا۔ اُس نے سب
سے پہلے میرا یہ ڈر دُور کیا۔ اُس نے ایسی باتیں کیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ
وہ مجھے اپنی ملکیت میں نہیں لے رہا بلکہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر
رہا ہے۔ اُس نے جب مجھے اپنا ماضی دکھایا تو پتہ چلا کہ اُس کا درد مجھ سے
مختلف نہیں۔ وہ بھی پناہ کی تلاش میں تھا۔

اُس کے ماں باپ اُس کے لڑکپن میں مر گئے تھے۔ اُس کا بڑا بھائی
شادی شدہ تھا۔ وہ اکھڑ مزاج اور بیوقوف تھا اپنی بیوی کے ہاتھوں میں
کھیلتا تھا۔ اُس کے دو بچے تھے۔ اُس کی بیوی میرے خاوند (الیاس)
کے خلاف ہو گئی۔ اُس کی جھوٹ موٹ کی شکایتیں اُس کے بھائی کو لگاتی
اور بھائی اُس کی پٹائی کر دیتا۔ الیاس نے مجھے بتایا کہ اُس کی بھابی اُسے
جائیداد کا حصہ دار سمجھتی تھی جس سے وہ اسے محروم کرنا چاہتی تھی۔ اُس
کا یہی طریقہ تھا کہ الیاس گھر سے بھاگ جاتا یا اس کا بھائی تنگ آ کر اسے
گھر سے نکال دیتا۔

الیاس میں اتنی عقل موجود تھی کہ وہ بھابی کے جھوٹے الزام اور
بھائی کی مار پٹائی اس لئے برداشت کرتا رہا کہ کم از کم میٹرک پاس کر لے۔
وہ اس نے کر لیا۔ اب بھائی نے اسے کہا کہ نوکری کر لے۔ الیاس نے کہا کہ
وہ نوکری کرے گا لیکن اس گھر میں نہیں رہے گا۔ بھائی نے اُسے حکم دیا
کہ وہ اسی گھر میں رہے گا۔ الیاس ادریس کی طرح باغی ہو گیا۔ ادریس کو تو باپ
نے اور ماں نے بھی پیٹا تھا، الیاس کو بھائی نے پیٹنے کی بجائے الگ لے

جاکر پوچھا کہ آج اُس نے اتنی بدتمیزی کیوں کی ہے ۔

الیاس نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ بھابی کس طرح اُسے بہکاتی رہی ہے ۔ الیاس نے بڑے بھائی کو یہ بھی کہہ دیا کہ بھائی جان! آپ اپنی بیگم کے آگے نہیں بول سکتے۔ آپ میں اتنی جرأت نہیں۔ الیاس کو یہ خطرہ تھا کہ اس بات پر اُس کا بھائی اُسے مارے پیٹے گا لیکن عجیب بات ہوئی کہ بھائی کی وہ رگ پھڑک اُٹھی جو اُس کی بیوی نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ اُس نے اپنی بیوی کو ڈانٹ دیا اور اسے کہا کہ میں تم پر اتنا اعتبار کرتا رہا ہوں کہ تم نے جو بات مُنہ سے نکالی وہ میں نے مان لی اور تم نے اس اعتبار کا یہ صِلہ دیا کہ میرے بھائی کو میرا دشمن بنا دیا ۔ اب میں تم پر ذرا سا بھی اعتبار نہیں کروں گا ۔

الیاس کی بھابی چُپ ہو گئی۔ الیاس کے بھائی نے الیاس کو راضی کر لیا لیکن صرف ایک مہینے بعد خاموش ہو جانے والی اس بیوی نے ایسا طوفان کھڑا کیا جس کے آگے کوئی کوئی مرد ٹھہر سکتا ہے۔ الیاس نے بتایا کہ اس کی بھابی پر بھابی کی ماں سوار تھی۔ یہ عورت مانی ہوئی فسادن تھی۔ وہی اپنی بیٹی کی پیر اُستاد تھی۔ الیاس کو شک تھا کہ نیا فساد اسی عورت نے اپنی بیٹی کے دماغ میں ڈالا تھا۔

فساد یہ ہُوا کہ گرمیوں کے دن تھے۔ الیاس گھر تھا اور اُس کا بھائی اپنے کام کاج پر گیا ہُوا تھا۔ ایک عورت جو الیاس کی بھابی کے محلّے میں رہتی تھی، الیاس کی بھابی کے پاس آئی بیٹھی تھی۔ اس عورت کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ الیاس کو اُس کی بھابی نے اپنے کمرے میں بلایا اور دونوں اُس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔

اچانک بھابی اور یہ عورت اُٹھیں اور اکٹھی کمرے سے نکل گئیں۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔ الیاس ابھی حیران ہی ہو رہا تھا کہ ان عورتوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اُسے گلی میں دونوں عورتوں کا واویلا سنائی دیا۔ وہ باہر نکلنے لگا تو دروازہ باہر سے بند تھا۔ دوسرے

کمرے میں کھُلنے والا دروازہ دیکھا تو یہ بھی دوسری طرف سے بند تھا۔ دو کھڑکیاں تھیں مگر ان میں سے وہ نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ ان میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ گلی میں شور بڑھ رہا تھا۔ الیاس باہر جا کر اپنی بھابی کو دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے ۔

باہر سے دروازہ کھُلا اور محلّے کے تین چار آدمی اندر آئے۔ اُنہوں نے الیاس کو پکڑ لیا۔ ایک نے اُسے دو تھپڑ بھی مارے۔ کوئی کہتا تھا اسے پولیس کے حوالے کرو، کوئی کہتا اس کے بھائی کو بلاؤ۔ اُس کی بھابی صحن میں کھڑی چلا رہی تھی کہ میں نے اسے بیٹوں کی طرح پالا ہے اور اس نے دیکھو میرے ساتھ کیا کیا ہے ۔

یہ قصہ بڑا لمبا ہے۔ مختصر یہ کہ بھابی نے اپنے محلّے کی اس عورت کو جو اس قسم کی بدمعاشیوں کی ماہر تھی اسی کام کے لئے بلایا تھا۔ اُنہوں نے ڈرامہ یہ کھیلا کہ الیاس کو بھابی نے اپنے کمرے میں بلا کر بند کر دیا اور گلی میں شور مچا دیا کہ الیاس نے اُس کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ اُس کے محلّے کی عورت کہتی تھی کہ یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ میں یہاں موجود تھی، ورنہ اس مسٹنڈے نے تو اسے (بھابی کو) بے آبرو کر دیا تھا ۔

الیاس بے ہوش نہیں ہُوا باقی کسر رہ نہیں گئی تھی۔ اس کی زبان بولنے سے معذور ہو گئی۔ اُس کا بھائی آ گیا۔ گھر میں محلّے کے لوگوں کا ہجوم دیکھا اور الیاس کے خلاف الزام سُنا۔ الیاس کی زبان چل پڑی۔ اُس نے کہا کہ ان دونوں عورتوں کے سروں پر قرآن رکھو اور انہیں کہو کہ یہی بات پھر کہیں۔ ایسا نہ کیا گیا۔ بڑے بھائی نے یہ عقل مندی کی کہ لوگوں کو گھر سے نکال دیا اور الیاس کو دوسرے کمرے میں لے جا کر پوچھا۔ الیاس نے بتایا کہ کیا ہُوا تھا۔

بھائی نے اُس عورت کو کمرے میں لے جا کر دھمکیاں دیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ اُسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ پھر بھائی نے اُسے پانچ روپے دیئے۔ عورت نے صاف بتا دیا کہ یہ ڈرامہ بھائی کی ساس نے بنایا تھا۔ بھائی نے اپنی بیوی کو بلایا اور اُسے کہا کہ تمہیں طلاق چاہیئے تو

صاف بتا دو۔ بیوی نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ الیاس کے بھائی نے اُس
کے مُنہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ الیاس نے مجھے بتایا کہ اُس کا بھائی اتنی
جرأت والا نہیں تھا لیکن وہ مجبور ہو گیا تھا۔

بات کھُل گئی۔ الیاس کی بھابی نے ہتھیار ڈال دیتے مگر الیاس کو چین
نہ آیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی وجہ سے اُس کے بھائی کی زندگی میں تلخیاں
پیدا ہو رہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جائیداد کے لالچ میں بھائی کی ساس کوئی
اور ڈرامہ بنا دے۔ الیاس نوعمر تھا۔ اسے زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔
دو روز سوچ سوچ کر وہ گھر سے نکل گیا۔ اپنے بھائی کے نام وہ
رقعہ چھوڑ آیا تھا۔

وہ تین چار مہینے بھٹکتا پھرتا رہا۔ اُس نے مزدوری بھی کی پھر ایک
نیک آدمی نے اسے ایک ٹھیکیدار کے پاس ملازم کرا دیا۔ اس نوکری میں
وہ انبالہ آیا۔ اس ٹھیکیدار سے ہٹ کر اس نے ایک اور ٹھیکیدار کی نوکری
کر لی۔ تجربہ حاصل ہو گیا تو اسے ہندو ٹھیکیدار نے رکھ لیا۔ یہ مکان
الیاس کا اپنا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے اتنی دیر سے شادی
کیوں کی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ اب اُس کی
عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ میرے ساتھ اُس کی شادی اتفاقیہ ہوئی تھی۔

یہ اتفاق اس طرح ہوا کہ الیاس کے ایک دوست کا ایک دوست
ہمارے شہر میں تھا۔ اُس نے کسی سے ذکر کیا کہ اُسے اپنے ایک دوست
(الیاس) کے لئے رشتے کی ضرورت ہے۔ یہ بات میرے بہنوئی تک پہنچی۔
اُس نے میری بات کی۔ بات پکی ہو گئی اور اس طرح ہم دو اجنبی زندگی کے
ہمسفر بن گئے۔ الیاس شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوستوں نے اُسے بتائے
بغیر یہ شادی طے کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خالی ہاتھ آیا اور شادی خاموشی سے ہوئی۔

الیاس کے متعلق میں اتنا ہی کہوں گی کہ ہر لحاظ سے اچھا آدمی تھا۔
آٹھ دس دنوں بعد وہ میرے لئے زیورات لے آیا پھر اُس نے میرے لئے
کپڑے بنوائے۔ اُسے جس توجہ اور محبت کی ضرورت تھی، وہ اُسے مجھ

سے مل گئی۔ اس کے جواب میں اُس نے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا۔
سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے والدین کی وفات کا صدمہ بھُول گئی۔ میں پھر کبھی
اپنے گھر نہ گئی نہ کبھی آپا کو خط لکھا نہ کبھی آپا اور بہنوئی کی طرف سے خط آیا۔
میں نے انہیں دل سے ہی اُتار دیا۔

ڈیڑھ پونے دو سال اس طرح گزر گئے جیسے انسان بڑا خوبصورت
خواب دیکھتا ہے۔ ایک حادثے نے مجھے اس خواب سے بیدار کر دیا۔
مجھے ہسپتال سے اطلاع آئی کہ الیاس ہسپتال میں ہے۔ میں نے بُرقعہ
لیا، تانگے میں بیٹھی اور ہسپتال پہنچی۔ مجھے جب ایک مریض کے پاس لے
جا کر بتایا گیا کہ یہ الیاس ہے تو مجھے یقین نہ آیا۔ الیاس کا رنگ تو بڑا صاف
تھا۔ اس مریض کا رنگ سانولا تھا۔ الیاس کی مونچھیں تھیں جو اس کے چہرے
پر نہیں تھیں۔ اُس کی آنکھوں پر اتنی بڑی پٹی بندھی تھی جس سے اُس کی
آدھی پیشانی ڈھکی ہوئی تھی۔

وہ الیاس ہی تھا۔ اُس کے ہاتھوں، بازوؤں اور جسم کا رنگ ٹھیک
تھا۔ حادثہ یہ ہُوا تھا کہ گیس کے سلنڈر سے گیس نکل رہی تھی۔ کسی کو پتہ نہ
چلا۔ ایک مزدور کو کچھ دیر بعد پتہ چلا تو اُس نے الیاس کو بتایا۔ سلنڈر زمین
پر پڑا تھا۔ الیاس اس پر جُھکا۔ ایک آدمی سلنڈر کے قریب بیٹھ گیا
اور اُس نے سگریٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی جلائی۔ جہاں سے گیس نکل
رہی تھی وہاں سے بھک کر کے شعلہ اُوپر کو اُٹھا۔ گیس اُوپر تک آ رہی تھی۔
الیاس وہیں جُھکا ہُوا تھا اور اُس کا چہرہ شعلے کے راستے میں تھا۔ پورا چہرہ
جھلس گیا۔ اس کی مونچھیں، ابرو اور پلکوں کے بال جل گئے۔ الیاس تین چار قدم
پیچھے جا پڑا۔ سلنڈر دھماکے سے پھٹا۔ الیاس اس دھماکے سے محفوظ رہا۔ اُس
کے ساتھی کے بازو کی ہڈی اور تین چار پسلیاں ٹوٹ گئیں اور تین چار دنوں
بعد وہ ہسپتال میں مر گیا۔

الیاس اس حالت میں ہسپتال سے نکلا کہ اُس کے چہرے کا رنگ

عجیب طرح ہو گیا تھا۔ کہیں سے گہرا سانولا، کہیں سے گندمی اور بھورٹی کا رنگ پھیکا سا تھا۔ رنگ بگڑ جانے کا تو غم نہ تھا، نقصان یہ ہوا کہ الیاس کی بینائی تباہ ہو گئی۔ اُسے صرف چار یا پانچ قدم دُور تک نظر آتا تھا۔ ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا تھا کہ بینائی اس سے بہتر نہیں ہو سکے گی اور عینک بھی کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔ پھر بھی الیاس نے آنکھوں کے دو ڈاکٹروں کو آنکھیں دکھائیں۔ اُنہوں نے عینکوں کے آخری نمبر کے شیشے بھی لگا کر دیکھے۔ نظر میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ میں نے الیاس سے کہا کہ وہ سارا زیور بیچ کر دِلّی چلا جاتے اور آنکھوں کے کسی انگریز ڈاکٹر کو دکھاتے مگر انبالہ کے دونوں ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ روپیہ برباد نہ کرتے رہنا، کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔

نظر جاتی رہی تو ٹھیکیدار نے نوکری سے جواب دے دیا۔ ٹھیکیدار نے الیاس پر یہ الزام بھی لگایا کہ سلنڈر اُس کی غلطی سے پھٹا ہے۔ جس نے گیس کے قریب دِیا سلائی جلائی تھی وہ تو مر گیا تھا۔ الیاس اب کہیں بھی نوکری کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے اُسے بہت مغموم دیکھا۔ اُس نے کہا کہ زیور بیچ کر کوئی دکان کرے گا مگر اتنی کمزور نظر سے وہ دکان کیسے کر سکتا تھا۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہوں" — میں نے الیاس سے کہا — "میں نوکری کروں گی۔ آپ گھر رہیں۔ اللہ مالک ہے۔"

الیاس نہیں مان رہا تھا لیکن کچھ تو کرنا ہی تھا۔ وہ وقت آج کی طرح نہیں تھا کہ لڑکی کو فوراً کہیں نہ کہیں نوکری مل جاتی۔ مجھے لڑکیوں کے کسی سکول میں ہی نوکری مل سکتی تھی۔ میں نے گزرے ہوئے دو سالوں میں محلّے کے ہر گھر میں راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور تین چار گھروں کے ساتھ تو میرے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے۔ ان میں ایک خاندان اثر و رسوخ والا تھا اور اس خاندان کے بزرگ اللہ کے نیک بندے تھے۔ آگے چل کر تحریکِ پاکستان میں اس خاندان نے بہت کام کیا تھا۔ میں ان کے ہاں گئی اور کہا کہ مجھے کسی

سکول میں اُستانی لگوا دیں۔ انہیں الیاس کی حالت کا علم تھا۔

اُنہوں نے تین چار دنوں بعد مجھے لڑکیوں کے ایک سکول میں ملازمت دلا دی۔ مجھے پانچویں اور چھٹی جماعتوں کو انگریزی پڑھانے پر لگایا۔ تنخواہ اسّی روپے تھی جو آج کے ایک ہزار روپے سے زیادہ تھی۔ گھر میں محلّے والوں نے میری مزید آمدنی کا یہ انتظام کر دیا کہ دس گیارہ بچیاں میرے پاس قرآن مجید پڑھنے آنے لگیں۔ ان بچیوں کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ وہ گھر کے کئی کام کر جاتی تھیں۔

الیاس کو یہ صورت پسند نہیں تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر اُداس ہو جاتا تھا۔ میں تھکی ہوئی ہوتی یا کسی وجہ سے میرے ذہن پر کوئی بوجھ ہوتا، میں الیاس کے سامنے ہنستی مسکراتی رہتی اور حوصلہ افزا اور خوشگوار باتیں کرتی تھی۔ میں شام کو ہانڈی پکاتی تھی جو اگلے دن کو بھی ہم کھاتے تھے۔ الیاس نے کہا کہ ہانڈی روٹی وہ خود کیا کرے گا۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا۔ ایک روز میں سکول سے آئی تو دیکھا کہ الیاس نے ہانڈی پکا دی ہے۔ پھلکے بھی اُسی نے پکاتے تھے۔ رات کی بچی ہوئی سبزی اُس نے الگ رکھ دی تھی۔ اُس نے اچھا خاصا کھانا تیار کر لیا تھا۔ میں نے گھر کی حالت دیکھی۔ مجھے کچھ تبدیلیاں نظر آئیں۔ گھر صاف ستھرا تھا اور جو چیزیں میری مصروفیت کی وجہ سے بکھری ہوتی اور بے ترتیب رہتی تھیں، وہ سب اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھی تھیں۔ یہ الیاس کا کام تھا۔

اُس نے عورتوں کے کام سنبھال لئے۔ میں نے اُسے منع کیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ وہ کہتا تھا کہ وہ کچھ کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال ہم دونوں نے گھر میں اُداسی نہ آنے دی۔ ہنستے کھیلتے وقت گزرتا رہا۔ الیاس کو معذوری اور بیکاری کا احساس پریشان کرتا رہتا تھا۔ میں پہلے سے زیادہ اُس کی خدمت کرنے لگی اور ہر طرح اُسے خوش رکھتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے آگے جھکا جھکا رہنے لگا تھا۔ میں نے ایک روز اُسے سختی سے کہا کہ اپنے آپ کو مرد سمجھو اور سر اونچا رکھو۔ اُس کے آنسو نکل آتے۔ میں نے اُسے بڑے

پیار سے بہلایا۔

چار پانچ مہینے گزر گئے۔ میں برقعے میں سکول جایا کرتی تھی۔ سکول دُور نہیں تھا۔ میں پیدل آتی جاتی تھی۔ اُس زمانے میں بھی لڑکے لڑکیوں سے چھیڑخانی کرتے تھے لیکن آج کی طرح نہیں کہ قدم قدم پر بکواس کرنے والے موجود ہوں۔ چار پانچ مہینوں میں مجھے ایسا کوئی تجربہ نہ ہُوا۔ ایک روز تین نوجوان میرے راستے میں کھڑے تھے۔ اُنہوں نے ہلکی سی بکواس کی جس کی میں نے پروانہ کی لیکن یہ تینوں دوسرے تیسرے روز میرے راستے میں موجود ہوتے اور میں قریب سے گزرتی تو کچھ نہ کچھ کہہ دیتے۔ یہ کوئی غنڈے اور بدمعاش تھے۔ اچھے خاندانوں کے لڑکے ایسی حرکتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ برقعہ پوش خاتون کے ساتھ تو اس طرح چھیڑخانی کا تو کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر ہندو مُسلم فساد ہو جایا کرتا تھا۔ ایسا تو اکثر ہوتا تھا کہ کسی لڑکے نے کسی لڑکی کو چھیڑا اور کسی بڑی عمر کے آدمی نے دیکھ لیا اور اُس نے لڑکے کو دو تین تھپڑ جڑ دیتے۔ وہ زمانہ کچھ اور تھا۔

ان تین لڑکوں کی میں نے یہ حرکتیں دیکھیں تو میں پریشان ہوتی اور میں ہر روز یہ سوچتی کہ ان کا کیا علاج کیا جائے۔ میں ایاس کو نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ وہ نظر سے معذور تھا۔ لڑائی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اُسے پریشان بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایک خیال یہ آیا کہ جنہوں نے مجھے نوکری دلائی ہے انہیں بتاؤں گی۔ وہ اثر اور ہمت والے لوگ تھے۔

میں کچھ دن تو سوچتی رہی۔ ایک روز میں سکول سے واپس آرہی تھی تو ان میں سے ایک لڑکا جس کی عمر اکیس بائیس سال تھی، اکیلا کھڑا تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں اِدھر اُدھر کوئی مکان نہیں تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے غصّہ آگیا۔ میں نے سوچا کہ میں دوسروں کا سہارا کیوں لوں؟ آج ان بدمعاشوں میں سے ایک مجھے اکیلا مل گیا تھا۔ میں نے اُسے مہلت ہی نہ دی کہ وہ مجھے چھیڑتا۔ میں اُس کے سامنے رُک گئی اور برقعے کا نقاب اُٹھا دیا۔

"تم اپنے باپ کی اولاد نہیں ہو" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "میں

تمہیں کسی اور سے نہیں پٹواؤں گی، میں تمہیں اپنے ہاتھوں جُوتے ماروں گی"
میں دلیر تو ہو گئی تھی لیکن اندر سے ڈر گئی تھی۔ وہ شکل و صورت سے ہی غنڈہ لگتا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ مجھے بڑا بیہودہ جواب دے گا لیکن اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھیں اس طرح کھُل گئیں جیسے اُس کے ڈھیلے باہر آجائیں گے۔ وہ بالکل نہ بولا۔

"مسلمان کی اولاد ہو؟" ــــ میں نے پوچھا۔ وہ پھر بھی آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا ــــ "تم ہنومان کی اولاد معلوم ہوتے ہو"

اُس نے سر جُھکا لیا۔ ایک بار پھر سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور سر جھکاتے ہُوئے چلا گیا۔ میں شیر ہو گئی اور سوچا کہ اب ان تینوں کو اسی طرح ڈراؤں گی۔

میں جب اپنے محلے میں داخل ہوتی تو پیچھے دیکھا۔ وہ پھر واپس آگیا تھا اور اُسی جگہ کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میں گلیوں کے موڑ مڑتی اپنے گھر آگئی۔ برُقعہ اُتارا۔ ایاس مجھے کہہ رہا تھا کہ آج میں نے تمہارے لئے نہایت اعلیٰ سالن پکایا ہے۔ ہم دونوں ہنس رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہُوئی۔ ایاس باہر گیا۔

"جوان سا ایک لڑکا ہے" ــــ ایاس نے واپس آکر مجھے کہا ــــ "تمہارا پوچھ رہا ہے"

"میرا پوچھ رہا ہے؟" ــــ میں نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"کہتا ہے مُنّی خالہ سے ملنا ہے" ــــ ایاس نے کہا۔

میں دماغ میں معمّے اور سوال لے کر باہر گئی۔ دروازے میں وہی بدمعاش کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے آگ لگ گئی لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا کہ اُس نے کہا تھا کہ مُنّی خالہ سے ملنا ہے۔ ایاس میرے پیچھے کھڑا تھا۔

"یہاں کیا لینے آئے ہو؟" ــــ میں نے کانپتی ہوتی آواز میں کہا۔

"صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم میری مُنّی خالہ تو نہیں ہو؟" ــــ اُس نے پوچھا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا جواب سُنے بغیر اُس نے

کہا ——"میں اویس ہوں۔ اب تو مجھے میری ماں بھی نہیں پہچان سکتی، تم کیسے پہچانتیں ..... میں نے تمہیں فوراً پہچان لیا تھا۔"

پھر اُسی طرح ہُوا جس طرح مقناطیس چھوٹی سی کیل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اویس گولی کی رفتار سے آیا۔ اُس کے بازو میرے گلے کا پھندا بن گئے اور وہ میرے ساتھ چپک گیا پھر میرے بازو اُس کے گرد لپٹ گئے۔ اویس ہچکیاں لے رہا تھا۔ اُس کا سر میرے کندھے پر اس طرح تھا کہ اُس کا ایک گال میرے گال کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ ذرا سے وقت میں اُس کے آنسو میری گردن پر بہنے اور میری قمیض کے اندر جانے لگے۔ وہ مجھ سے الگ ہو ہی نہیں رہا تھا۔

بڑی دیر بعد الگ ہُوا۔ اُس کے گال آنسوؤں سے دُھل گئے تھے۔ اُس نے میرے مُنہ کی طرف دیکھا اور بولا ——"معاف کر دینا خالہ!" —— اور وہ واپس جانے کو گھوما۔ مَیں نے اُسے پکڑ لیا۔ مجھ پر اتنی جذباتیت اور رِقت طاری تھی کہ بولا نہیں جاتا تھا۔ میں اُسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ الیاس کو مَیں نے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیرت تھی۔ میں نے اُسے شادی کے اگلے ہی دن اپنی یہ ساری کہانی سناتی تھی جو آپ کو سُنا چکی ہوں۔ اپنی بہن اور اُس کے خاوند نے اپنے گھر کا جو حال بنا رکھا تھا، وہ پورا پورا سنایا تھا۔ میں نے اویس کی گمشدگی اور اُس کے متعلق تمام باتیں الیاس کو اس طرح سنائی تھیں جیسے میرا اپنا بچہ لاپتہ ہو گیا ہو۔

"یہ میرا وہی بھانجا اویس ہے" —— میں نے الیاس کو بتایا لیکن یہ نہ بتایا کہ اس کے ساتھ میری ملاقات کس طرح ہوتی ہے۔

"تم نے اپنی خالہ کو کیسے دیکھ لیا تھا؟" —— الیاس نے اویس سے پوچھا —— "یہ تو نقاب اُوپر کرتی ہی نہیں۔"

"خالہ سکول کے گیٹ سے نکلیں تو ان کا نقاب اُوپر تھا" —— اویس نے جھوٹ بولا —— "گیٹ سے نکلتے ہی اُنھوں نے نقاب گرا لیا۔ میں نے ان کے چہرے کی ذراسی جھلک دیکھی تھی ... فوراً پہچان لیا لیکن

وہاں انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا۔ انہیں پتہ نہ چلا کہ میں بہت سا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔"

"اتنی احتیاط کی کیا ضرورت تھی؟" —— الیاس نے کہا —— "تم خالہ بھانجا ہو۔"

"لیکن میں شریف آدمی نہیں ہوں خالو!" —— اویس نے کہا —— "آپ مجھے نہیں جانتے۔ اس شہر کے غنڈے اور پولیس مجھے جانتی ہے۔"

میں تو اویس کا چہرہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اتنی پیاری صورت بالکل بگڑ گئی تھی۔ اتنا اچھا رنگ سانولا ہو گیا تھا۔ اُس کا قد بڑھ گیا تھا جسم گٹھا ہُوا تھا۔ قد اور جسم کے لحاظ سے وہ بڑا اچھا مرد لگتا تھا۔ اویس کی آنکھوں میں ایک حسُن ہُوا کرتا تھا۔ یہ حسُن بُجھا بُجھا سا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی لالی آگئی تھی —— میں اویس کو ساڑھے چھ سال بعد دیکھ رہی تھی۔

میری آپ بیتی میں کئی کہانیاں ہیں جو میں پوری پوری سنانے لگوں تو ایک موٹی ساری کتاب بن جاتے۔ اویس گھر سے نکل کر کہاں کہاں خراب ہوتا اور بھٹکتا رہا، یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ اُس نے ساڑھے چھ سالوں کی ساری باتیں مجھے سنائیں۔ وہ اپنے گھر کے ظالم ماحول سے تنگ آکر نویں جماعت میں ہی آوارہ لڑکوں کا دوست بن گیا تھا۔ ان میں اُسے سکون ملتا تھا۔ اس قسم کے ماحول میں پلے ہوتے لڑکے (اور لڑکیاں بھی) آوارگی اور بُری عادتوں میں لذت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ یہ نفسیاتی معاملے ہیں۔ ان پر کسی کا اختیار نہیں۔ اویس بھی انسانی نفسیات کی چکی میں پس گیا تھا۔

وہ اپنے شہر سے دو لڑکوں کے ساتھ نکلا تھا۔ تینوں بغیر ٹکٹ ریل گاڑی میں سفر کرتے امرتسر پھر لاہور گئے۔ دوسرے دو لڑکے گھر واپس آگئے۔ اویس وہیں رہا۔ اُسی عمر میں وہ چالاک اور ہوشیار ہو گیا تھا۔ چرسیوں اور جواریوں کے اڈے پر پہنچا دیا۔ وہاں سے پیشہ ور غنڈوں میں شامل ہو گیا۔ جیب تراشی اور چوری کی وارداتیں کیں۔ نو مہینے جیل بھی کاٹی۔ جیل میں اُسے پیشہ ور مجرموں کے

استاد مل گئے۔ وہاں سے وہ مزید مہارت حاصل کر کے نکلا۔ پھر لاہور سے انبالہ پہنچ گیا۔ اب وہ تجربہ کار بدمعاش ہو گیا تھا۔ اُس نے چوری وغیرہ چھوڑ دی تھی اور کرائے کا غنڈہ بن گیا تھا۔ چرس اور شراب پیتا تھا۔ انبالہ شہر میں طوائفوں کا جو بازار تھا، اویس نے وہاں نام پیدا کر لیا تھا۔

"لیکن خالہ!" —— اُس نے کہا —— "میں بے چین رہتا ہوں۔ ایسے محسوس کرتا رہتا ہوں کہ میں نے کچھ کھو دیا ہے۔"

"امی ابا یاد آتے ہوں گے" —— میں نے کہا۔

"نہیں خالہ!" —— اُس نے کہا —— "تمہارے سوا کوئی بھی یاد نہیں آیا کبھی .... سچ بتاؤں؟ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ امی اور ابا کو جا کر قتل کر آؤں، لیکن اپنی چھوٹی بہن اور بھائی کا خیال آ گیا تھا۔"

"تمہارا ایک اور بھائی پیدا ہُوا تھا" —— میں نے اُسے بتایا۔

"بدقسمت!" —— اُس نے کہا —— "کس جہنم میں پیدا ہُوا!"

اُس کی ساڑھے چھ سالوں کی کہانی اُس وقت ختم ہوئی جب سورج ڈوب چکا تھا۔ میں نے اُسے کھانا کھلایا تھا، چائے پلائی تھی۔ بچیاں قرآن مجید پڑھنے آئیں تو میں نے انہیں کہا کہ آج خود ہی پڑھتی رہیں۔ اویس اچانک اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"اجازت دو خالہ!" —— اُس نے کہا —— "اب تمہارے راستے میں کوئی نہیں آئے گا۔"

"بیٹھے رہو وسی!" —— میں نے حکم کے لہجے میں کہا —— "جا کہاں رہے ہو؟"

"جہاں کا ہوں" —— اُس نے جواب دیا۔

"تم اب یہیں کے ہو" —— میں نے کہا —— "اب تم کہیں نہیں جا سکتے۔"

"نہ خالہ!" —— اُس نے بڑی پختہ آواز میں کہا —— "غنڈے شریف

گھروں میں نہیں رہا کرتے۔"

"وسی!" —— میں نے رُعب دار آواز میں کہا —— "بیٹھ جاؤ۔"

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے اچھی طرح بتا دیا کہ میں اُسے نہیں جانے دوں گی۔ میں نے الیاس سے پوچھا کہ اُسے اویس کا یہاں رہنا بُرا تو نہیں لگے گا؟ الیاس دل کا بادشاہ تھا۔ اُس نے کہا کہ تم نے اسے جانے دیا تو میں اِسے روک لُوں گا۔

رات کو وہ بہت دیر میرے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بات کرتا اور روتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں باقی عمر اُسے اپنے ساتھ رکھوں گی اور شادی بھی کراؤں گی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا کہ سوچو مت۔ میں اپنا فیصلہ بدلوں گی نہیں۔

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں" —— اُس نے کہا —— "شادی نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟"

"بُرا تو نہ جانو گی خالہ؟" —— اُس نے کہا —— "میں شاید کسی لڑکی کو بیوی نہیں بنا سکوں گا، یا شاید ایسے ہے کہ میں کسی لڑکی کا خاوند نہیں بن سکوں گا .... ایسے ہُوا کہ میں پہلی بار ایک طوائف کے پاس گیا تو مجھے اُس کے جسم سے بدبُو آئی۔ مجھے تمہارے جسم کی بُو یاد آ گئی۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔ پھر میری دوستی دو لڑکیوں کے ساتھ ہو گئی۔ یہ محبت والی دوستی نہیں تھی لیکن میں گناہ نہ کر سکا۔ ان کے جسموں سے بھی مجھے بدبُو آئی اور مجھے تمہارے جسم کی بُو یاد آ گئی ....

"میں سولہ سال سے زیادہ عمر کا ہو گیا تھا تو بھی تمہارے ساتھ سوتا تھا۔ تمہارے جسم کی خوشبو اب تک میرے اندر موجود ہے۔ یہ پیار کی مقدس خوشبو ہے۔ اس میں احترام اور پاکیزگی ہے۔ اب اگر میری ماں مجھے اپنے ساتھ لگائے گی تو مجھے اُس کے جسم سے بھی بدبُو آئے گی۔ میں شادی کی سوچ چکا ہوں لیکن یہی مشکل پیش آ جاتی ہے۔ جب بھی کسی عورت کو ذہن

میں لاتا ہوں تو اُس کا جسم تمہارا جسم بن جاتا ہے .... پاک اور مقدس جسم .... خالہ! تم شاید یقین نہیں کرو گی کہ طوائفوں کے بازار میں میرا رعب کام کرتا ہے لیکن میں نے کبھی طوائف بازی نہیں کی اور آج تک کسی عورت کے ساتھ میں نے تعلق پیدا نہیں کیا۔"

"پھر تم میرے راستے میں کیوں کھڑے ہو جاتے تھے؟" ــــ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو اس پاپی مَن کو خوش کرنے کا بہانہ تھا" ــــ اُس نے جواب دیا۔

اس سے اندازہ کریں کہ بچے کو پیار کی کتنی ضرورت ہوتی ہے اور جس کسی سے اُسے پیار مل جائے، اُس کا وہ کس حد تک مرید ہو جاتا ہے۔ اویس نے جسموں کے متعلق جو بات کی تھی یہ نفسیات سمجھنے والوں کے لئے عجیب نہیں۔ شادی تو بعد کا معاملہ تھا، میں اُسے غنڈوں اور بدمعاشوں سے ہٹانا چاہتی تھی۔

بات مختصر یہ ہے کہ میرے پیار کا سرور اب تک اُس میں موجود تھا۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ یہ سرور نہیں جادو ہے جس کا اثر ابھی تک اُس پر طاری تھا۔ کہتے ہیں بُری عادتیں چھوٹتی نہیں۔ خاص کر سگریٹ پینے والے یہی کہتے ہیں لیکن اویس نے اپنے آپ کو یوں بدل لیا جس طرح بٹن دبا کر بجلی کا بلب جلایا اور بجھایا جاتا ہے۔ اُس نے اپنے دوستوں کو بتا دیا کہ اُسے کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے۔

وہ آخر بدمعاش اور بدنام تھا۔ اُس کی یہ شہرت میرے محلے میں بھی پہنچ گئی۔ ایک روز اُن دو بزرگوں نے جنہوں نے مجھے سکول میں نوکری دلائی تھی، مجھے اپنے گھر بلایا اور پوچھا کہ اویس میرا کیا لگتا ہے۔ مجھے اُس کی ساری کہانی سنانی پڑی اور جب انہیں یہ بتایا کہ اُس نے اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کر لی ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ میں اویس کو اُن کے پاس بھیجوں۔ میں نے انہیں کہا کہ اُسے ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں، وہ صرف پیار کو مانتا ہے۔

میں نے گھر آکر اویس کو بتایا کہ یہ بزرگ میرا سہارا، میرا تحفظ اور میرے سب کچھ ہیں اور وہ اُسے بلاتے ہیں۔ اویس گیا اور بہت وقت لگا کر آیا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ بزرگوں نے اُسے بہت ساری باتیں کہی تھیں جن میں پند و نصیحت بھی تھی اور حوصلہ افزائی بھی۔

"خالہ!" ــــ اویس نے کہا ــــ "مجھے تھوڑی سی غنڈہ گردی کی اجازت مل گئی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ بالکل ہی شریف آدمی نہ بن جانا۔ ہماری ٹکر ہندوؤں کی کانگرس پارٹی کے ساتھ ہے۔ اُنہوں نے غنڈوں کی ایک فوج بنا لی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ ہم پاکستان بنا کے رہیں گے۔ تم اپنے آپ میں تھوڑی سی غنڈہ گردی باقی رکھنا اور تمہارے جو مسلمان ساتھی بدمعاشی کو پیشہ بنائے ہوتے ہیں، ان کے ساتھ میل ملاقات رکھنا۔ حالات ایسا رُخ بدل رہے ہیں کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ٹکراؤ ضرور ہو گا۔ ہم بوڑھے لوگ تو نہیں لڑ سکتے۔ یہ کام تم جیسے نوجوانوں کا ہے۔"

اب مسئلہ یہ تھا کہ اویس کے لئے کوئی کام یا ملازمت مل جائے۔ الیاس نے یہ مسئلہ فوراً حل کر دیا۔ وہ اُسی ٹھیکیدار کے پاس چلا گیا جس کی اُس نے ملازمت کی تھی۔ اُسے کہا کہ وہ اویس کو اپنے پاس رکھ لے۔ اویس کے متعلق اُس نے ٹھیکیدار کو ایک تو یہ بتایا کہ وہ دس جماعتیں پاس ہے اور دوسرا وصف یہ بتایا کہ یہ وہ اویس ہے جو فلاں علاقے میں وسی دادا کے نام سے مشہور تھا۔ داداگیری بدمعاشی اور غنڈہ گردی کے پیشے کو کہتے ہیں۔ بڑے ٹھیکیداروں کو اس قسم کے آدمیوں کی ضرورت رہتی ہے۔ ٹھیکیدار نے اویس کو بلا کر ملازمت دے دی اور تنخواہ خاصی زیادہ مقرر کی۔

مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اویس پھر اُدھر ہی نہ چلا جائے لیکن اُس کی رگوں میں میرے [illegible] باپ کا خون بھی تھا۔ بدمعاشی اُس کی فطرت میں شامل نہیں تھی۔ وہ تو بھٹک رہا تھا۔ میرا پیار اُسے راستے پر لے آیا۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ میں نوکری چھوڑ دوں لیکن میں نے اُس کی یہ بات نہ مانی۔

میرے لئے سکول کی نوکری مشکل نہیں تھی۔

تقریباً چار مہینے گزر گئے۔ یہ تو میں بتا چکی ہوں کہ الیاس کی میں نے دل کی گہرائیوں سے خدمت کی۔ اُسے احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ معذور ہے اور میں کما رہی ہوں اور یہ کہ اُس کا چہرہ بدنما ہو گیا ہے، مگر مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کے اندر کوئی اور ہی احساس پرورش پا رہا ہے۔ ایک صبح میں جاگی۔ الیاس پلنگ پر نہیں تھا۔ میں سمجھی باورچی خانے میں ہوگا۔ اُس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھ سے پہلے اٹھ کر ناشتہ تیار کر دے اور میری کوشش ہوتی تھی کہ میں اُس سے پہلے اٹھوں۔ میں باورچی خانے میں گئی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ غسل خانے میں بھی نہیں تھا۔

میرے سکول جانے کا وقت ہو گیا۔ الیاس نظر نہ آیا۔ میں پریشان ہونے لگی۔ میں بتا چکی ہوں کہ وہ صرف تین چار قدم دُور تک دیکھ سکتا تھا۔ پریشانی یہ تھی کہ کہیں باہر نکل گیا ہوگا اور کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ میں نے ادریس کو اپنی پریشانی بتائی تو اُس نے کہا کہ وہ جا کر دیکھتا ہے۔ میں بستر سیدھے کرنے لگی۔ میرے تکیے کے نیچے ایک لفافہ پڑا تھا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ الیاس کے ہاتھ کا لکھا ہُوا کاغذ نکالا۔ میں نے جلدی جلدی پڑھا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے کچھ ضروری حصے سناتی ہوں:

"... ادیہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہیں پتہ چلنے تک میں بہت دُور جا چکا ہوں گا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس دنیا میں رہوں گا یا اپنے آپ کو ختم کر لوں گا .... میں تم سے کسی بات پر ناراض ہو کر نہیں جا رہا۔ بہت خوش جا رہا ہوں۔ تم نے مجھے اتنی مسرت اور اتنی محبت دی ہے جس کے قابل میں نہیں تھا۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ تمہیں اس محبت کی کیا قیمت دوں اور کیا نذرانہ ہے جو تمہارے قدموں میں رکھوں۔ تم نے ایک معذور اور بدصورت آدمی

کو پیار جیسی نعمت دی۔ تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ میرے پاس اپنی جان کے سوا کچھ بھی نہیں مُنّی! سوچ سوچ کر میں تمہیں یہ انعام دے رہا ہوں کہ تمہیں اپنے بوجھ سے آزاد کر چلا ہوں....

"میں نے تمہیں ایک دھوکے میں رکھا تھا۔ اگر تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو میں اُسے دھوکے میں ہی رکھتا۔ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوستوں نے مجھے بتائے بغیر تمہاری بات پکی کر دی تھی .... نہیں مُنّی! میں نے جھوٹ بولا تھا۔ تمہارے ساتھ شادی کی تو میری عمر تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ میں نے تمہیں اپنی عمر اٹھائیس سال بتائی تھی۔ میں پہلے شادی کر چکا تھا۔ چھ سال گزر گئے۔ ایک بھی بچہ پیدا نہ ہُوا۔ میں نے بیوی کا ڈاکٹری معائنہ کرایا۔ وہ بالکل ٹھیک نکلی۔ اپنا ڈاکٹری معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ عورت کے قابل تو ہوں، اولاد پیدا کرنے کے وصف سے محروم ہوں۔ علاج میں نے دلی جا کر ایک سپیشلسٹ سے چیکنگ کروائی۔ اُس نے بھی یہی رپورٹ لکھی....

"میری بیوی مجھ سے مطمئن تھی لیکن ہر عورت کا حق ہے کہ وہ ماں بنے۔ میں اُسے اس حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے شادی کے چھٹے سال اُسے طلاق دے دی۔ میں نے اُسے اور اُس کے والدین کو صاف صاف بتایا کہ میں اس عورت کو اپنی قید میں نہیں رکھنا چاہتا.... پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ دوستوں نے تمہارے ساتھ شادی کرا دی۔ مجھے بھی ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ تمہارے ساتھ شادی ہوتی تو میں نے ارادہ کیا کہ

تمہیں اپنی اس خامی سے بے خبر رکھوں گا۔ اگر تم عام قسم کی بیوی ہوتیں تو میں ایسے ہی کرتا لیکن تم نے مجھے اپنا مرید بنا لیا....

"تمہارے خلوص اور تمہاری محبت کا یہ صلہ دے رہا ہوں کہ تمہیں آزاد کر چلا ہوں تاکہ تم اولاد سے محروم نہ رہو۔ میرا غم لے کر نہ بیٹھ جانا۔ صوفی صاحب کو میری یہ تحریر دکھا دینا۔ وہ تمہاری شادی کا بندوبست کر دیں گے....

اپنا اٹیچی کیس کھولنا۔ اوپر ایک لفافہ پڑا ہے۔ اس میں ایک تو تمہیں اس مکان کے کاغذات ملیں گے۔ میں نے سات آٹھ روز پہلے یہ مکان تمہارے نام کروا دیا تھا۔ اسی لفافے میں تحریری طلاق نامہ بھی ہے تاکہ تمہیں دوسری شادی میں مشکل پیش نہ آئے۔ عدت پوری کر کے شادی کر لینا۔"

کیا اثر ہوا مجھ پر اس تحریر کا میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے خط اویس کو دیا۔ وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ الیاس کو ڈھونڈنا بیکار تھا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس نے خودکشی کر لی تھی یا زندہ رہا اور طبعی موت سے ہمکنار ہوا۔ میں نے یہ خط صوفی صاحب کو دکھایا۔ یہ صوفی صاحب وہی بزرگ تھے جنہوں نے مجھے نوکری دلائی تھی۔ خط پڑھ کر اُن کے بھی آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے ——"الیاس اچھا آدمی تھا.... تم عدت کا عرصہ پورا کر لو بیٹی! اللہ جو کرتا ہے وہ اپنے بندوں کی بہتری کے لئے ہی کرتا ہے۔"

"خالہ! ایک بات بتاؤ" —— تین چار دنوں بعد اویس نے مجھ سے پوچھا —— "اس اتنی بڑی حویلی کا آدھا حصہ تمہارا ہے۔ تم دو ہی بہنیں ہو۔ تم نے اپنا حصہ لے لیا تھا؟"

"سوچا بھی نہیں وسی!" —— میں نے جواب دیا —— "میں تو اسی پر

خوش تھی کہ اُس حویلی سے نکل آئی تھی، ورنہ میں تو وہاں پاگل ہو جاتی۔"

"ان باتوں کو چھوڑو خالہ!" —— اویس نے کہا —— "تم نے حویلی کا حصہ نہیں لیا۔ وہاں اتنا قیمتی سامان تھا۔ تمہاری امی کا زیور بھی ہوگا۔ اس پر میرے ماں باپ قابض ہیں..... میری ماں نے تمہیں زیور کتنا دیا تھا؟"

"دو جھمکے اور ایک انگوٹھی" —— میں نے کہا —— "یہ پہلے ہی میرے پاس تھے۔"

"باقی زیور میرے ماں باپ نے ہضم کر لیا" —— اویس نے کہا —— "میرا باپ پکا بے ایمان اور لالچی آدمی ہے۔ میں اُسے خط لکھ رہا ہوں کہ وہ تمہارا حصہ تمہیں دے۔ اُسے یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ میں زندہ ہوں اور یہاں ہوں"۔

میں سمجھی کہ وہ اپنے ماں باپ کے خلاف نفرت کا اظہار کر رہا ہے۔ میں نے اُس کی یہ بات ہنس کر اور یہ کہہ کر ٹال دی کہ جی میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ اُن سے اپنے حصے کا ایک ایک پیسہ وصول کروں لیکن میں نے انہیں اور اُس گھر کو دل سے اتار دیا ہے۔ پھر ہم الیاس کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے الیاس کا بہت ہی افسوس تھا۔

دوسرے دن اویس کام سے واپس آیا تو اُس نے مجھے خط دکھایا جو اُس نے اپنے باپ کو لکھا تھا۔ میں خط پڑھ رہی تھی تو اُس نے کہا، خالہ! مجھے یہ نہ کہنا کہ میں یہ خط نہ ڈالوں۔

"میں تو یہی کہوں گی وسی!"

"اور میں نہیں مانوں گا" —— اُس نے کہا —— "میں اپنے اس باپ کو چین اور آرام سے زندہ نہیں رہنے دوں گا" —— میں نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ غصے سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے دانت پیس کر کہا —— "خدا مجھے اگر اجازت دے تو میں باپ کے مرنے کے بعد اس کی قبر میں اُتر کر اُسے اپنے ہاتھوں عذاب دوں......اور میری ماں......"

"تمہاری ماں ایسی نہیں ہوا کرتی تھی وسی!" —— میں نے کہا اور میری آہ نکل گئی —— "وہ تو میری طرح تھی۔ اُسے تمہارے باپ نے چڑیل بنا دیا ہے"۔

"میں اُسے چڑیل ہی کہوں گا" —— اویس نے کہا —— "تمہیں یہاں آئے تین سال ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے کبھی تمہیں خط لکھا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہارا باپ تمہارے خط کا جواب ہی نہیں دے گا"

میں نے کہا۔

''نہیں دے گا تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا'' ___ اُس نے کہا۔

اُس نے باپ کو خط میں لکھا تھا کہ تم نے میری خالہ کو حویلی، سامان اور اُس کی والدہ کے زیور کا حصہ نہیں دیا تھا۔ حویلی کی اور گھر کے سامان کی قیمت لگواؤ اور آدھی رقم خود لے کر اس پتے پر پہنچو۔ جب آؤ تو خالہ کے حصے کا زیور بھی لیتے آنا۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا اور میں خالہ کا حصہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں خالہ کے پاس ہوں۔

اُس نے انبالہ کا ایڈریس لکھ دیا تھا۔

چھ سات دنوں بعد میرا بہنوئی اور میری بہن آ گئے۔ اُس روز غالباً کوئی ہندو تہوار تھا جس کی چھٹی تھی۔ اویس گھر پر تھا۔ اُسے نہ باپ نے پہچانا نہ ماں نے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ اویس ہے تو دونوں اُس کی طرف بڑھے۔

''میں تمہارا کچھ نہیں لگتا'' ___ اویس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ___ ''میرے ساتھ مطلب کی بات کرو''۔

ماں کیسے صبر کر لیتی۔ وہ اپنے بیٹے کی طرف لپکی لیکن اویس پتھر بن گیا تھا۔ میں نے اپنے بہنوئی اور بہن کو بٹھایا۔ وہ اپنے بچوں کو ساتھ نہیں لائے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ ان دونوں کو یہ شک ہو سکتا ہے کہ اُن کے بیٹے کو میں نے ورغلا کر اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ اویس کو میں نے اتفاق سے یہاں گھومتے پھرتے دیکھ لیا اور اسے گھر لے آئی تھی۔ اُنہوں نے الیاس کے متعلق پوچھا تو میں نے اصل بات بتانے کی بجائے یہ بتایا کہ وہ اپنی نوکری کے سلسلے میں چار پانچ دنوں کے لئے باہر چلا گیا ہے۔ میں نے اُن سے کوئی گلہ شکوہ نہ کیا۔ اویس الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

''تم لوگ میرے خط کا کیا جواب لائے ہو؟'' ___ اویس نے اُن سے پوچھا۔

''ذرا سوچو بیٹا!'' ___ اویس کے باپ نے کہا ___ ''ہم اتنی رقم کہاں سے دے سکتے ہیں۔ آدھی حویلی اور آدھے سامان کی قیمت کا تم خود اندازہ کر سکتے ہو'' ___ اُس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پوٹلی نکال کر میری طرف کی اور کہنے لگا ___ ''یہ لو وسی تمہارے حصے کا زیور لے آیا ہوں''۔

میں نے پوٹلی لینے کے لئے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔ اویس نے جھپٹ کر پوٹلی

باپ کے ہاتھ سے چھین لی۔

''حویلی بیچو اور سامان بھی بیچو'' ___ اویس نے باپ سے کہا ___ ''اور خالہ کے حصے کی رقم خالہ کو پہنچاؤ... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں شریف آدمی نہیں ہوں۔ اگر تمہیں شک ہے تو تھانے جا کر پوچھ لینا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ میں تم لوگوں کو صرف اتنی مہلت دوں گا کہ آج ہی گاڑی میں بیٹھو۔ واپس جاؤ اور حویلی بیچو، نہیں تو میں خالہ کو لے کر خود وہاں آ جاؤں گا۔ پھر میں دیکھوں گا کہ حویلی بکتی ہے یا نہیں''۔

''منی بہن!'' ___ میری آپا نے ہاتھ جوڑ کر مجھے کہا ___ ''حویلی بک گئی تو ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارے حال پر رحم کرو۔ تمہاری بھانجی جوان ہو گئی ہے۔ ہم تو اویس نے کہا اُس کی شادی کرنے کے بھی قابل نہیں''۔

''تم جہنم میں جا کے رہو'' ___ وسی! ___ میں نے غصیلے لہجے میں کہا ___ ''زبان بند رکھو'' ___ خالہ!'' اویس نے کہا ___ ''آج میری زبان نہ روکو۔ ان کے ظلم نے مجھے گھر سے بھگایا تھا۔ انہیں کیا پتہ میں چھ سات سال کہاں کہاں ذلیل اور خوار ہوتا رہا ہوں۔ میں نے رنڈیوں کے کوٹھوں پر، چرسیوں کے تکیوں میں اور سڑکوں پر راتیں گزاری ہیں۔ میں نے نو مہینے جیل کاٹی ہے'' ___ اویس کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے دانت پیس کر کہا ___ ''یہ بھوکے رہیں، ننگے رہیں میں ان سے تمہارا حصہ لے کے رہوں گا''۔

یہ منظر بڑا ہی تلخ اور بہت ہی دردناک تھا۔ میری بہن مریض لگتی تھی۔ وہ بار بار میرے آگے ہاتھ جوڑتی تھی۔ اویس ان کا جانی دشمن بن گیا تھا۔ میری بہن رو رو کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ میں برداشت نہ کر سکی۔

''وسی!'' ___ میں نے اویس سے کہا ___ ''میں کچھ نہیں لوں گی''۔

''خالہ!......''

''وسی'' ___ میں نے اُسے آگے بولنے نہ دیا اور کہا ___ ''اپنی چھوٹی بہن کی خاطر چپ رہو'' ___ میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا ___ ''یہ زیور مجھے دے دو'' ___ اُس نے زیور والی پوٹلی مجھے دے دی۔ میں نے یہ پوٹلی اپنی بہن کو دے کر کہا ___ ''لو آپا! یہ میری بھانجی کو دے دینا''۔

اویس اُٹھ کھڑا ہوا اور بے چین سا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

”خالہ!“ ـــــ اُس نے رُک کر کہا ـــــ ”تم نے انہیں اپنا حصہ بخش دیا ہے۔ انہیں کہو کہ اب چلے جائیں۔“

”نہیں وَسی“ ـــــ میں نے کہا ـــــ ”میں انہیں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی“۔

اس کے بعد اویس نہ بولا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ان کے لئے کھانا تیار کیا۔ اس دوران اویس کا باپ کمرے میں خاموش بیٹھا رہا۔ آپا میرے ساتھ رہی اور روتی ہی رہی۔ میں نے جب کھانا تیار کر کے رکھا اور اویس کو بلانے گئی تو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھا۔

میری آپا اور میرا بہنوئی کھانا کھا کر چلے گئے۔ آپا نے جاتے جاتے کہا کہ اویس کو ساتھ لے کر کبھی آنا۔

”وَسی کو تم نے دیکھ لیا ہے نا آپا!“ ـــــ میں نے کہا ـــــ ”مجھے تم لوگوں نے پہلے ہی بھلا رکھا ہے۔ اب بھی بھلائے ہی رکھو۔“

اُن کے جانے کے بعد میری حالت کچھ عجیب سی ہوگئی۔ بڑی بہن کو دیکھ کر والدین یاد آ گئے۔ میرے دو بھائی جو مر گئے تھے وہ بھی یاد آئے اور میں بہت دیر روتی رہی۔ اویس شام کو واپس آیا۔

”روتی رہی ہو خالہ!“ ـــــ اُس نے کہا ـــــ ”تم نے میری بے عزتی کرا دی ہے۔ تم اگر میری چھوٹی بہن کو درمیان میں نہ لے آتیں تو میں چُپ کرنے والا نہیں تھا۔ مجھے اُس گھر میں کوئی یاد آتا ہے تو وہ صرف بہن ہے“۔

تین چار دن گزرے تو رات آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ اویس کمرے میں تھا اور میں صحن میں کچھ کر رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ باہر باوردی تھانیدار کھڑا تھا۔ اُس نے مجھ سے اویس کے متعلق پوچھا میں نے اُسے بتایا کہ وہ یہیں ہے اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ اُس نے کہا کہ اویس کو باہر بھیجو۔ مجھے خیال آ گیا کہ اویس مجرموں کی دُنیا میں رہ چکا ہے۔ یہ تھانیدار اسی سلسلے میں آیا ہوگا۔ میں تھانیدار کو اندر لے گئی اور کمرے میں بٹھایا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے مجھ پر بھی اُسے کوئی شک ہو۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اویس کی خالہ ہوں اور فلاں سکول میں استانی ہوں۔ میں نے وہیں سے اویس کو آواز دی اور وہ آ گیا۔

”وَسی دادا تم ہی ہونا؟“ ـــــ تھانیدار نے اویس سے پوچھا۔

”تھا، اب اویس ہوں“ ـــــ اویس نے جواب دیا ـــــ ”اور اپنی خالہ کے پاس رہتا ہوں۔ اگر آپ کو شک ہے تو یہ صوفی صاحب ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اُن سے پوچھ لیں۔ صوفی صاحب کو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔“

تھانیداروں کی باتیں بڑی لمبی ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ چند مہینے پہلے بازار میں کسی دکان میں چوری ہوگئی تھی۔ اب کوئی آدمی پکڑا گیا تھا اور اُس نے اویس سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ تھانے چلے۔ اویس نے کہا کہ وہ چوری کی کسی واردات میں شریک نہیں تھا۔ تھانیدار اتنی جلدی کہاں مانتے ہیں لیکن اس تھانیدار کو میں نے دیکھا۔ خوبصورت جوان تھا۔ اُس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہوگی اور وہ شائستگی سے بات کرتا تھا۔ اُس کے اور اویس کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ سنانے کی ضرورت نہیں اویس تھانیدار سے ڈرنے کی بجائے اُس کے ساتھ اس طرح بول رہا تھا جیسے دونوں گہرے دوست ہوں۔ وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھا جسے لوگ چھوٹا تھانیدار کہا کرتے ہیں۔

میں نے تھانیدار سے پوچھا کہ اویس کے خلاف کوئی پکا ثبوت ہے؟ اُس نے کہا کہ پکا ثبوت نہیں ہے لیکن تفتیش ضروری ہے۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ وہ میری پوری بات سن لے۔ اتفاق سے وہ مسلمان تھا۔ اُس نے بڑی شرافت سے کہا کہ وہ بات سنے گا۔

میں نے اُسے اویس کے متعلق ساری بات سنا دی۔ کس طرح وہ گھر سے نکلا اور کتنے عرصے بعد کس طرح مجھے ملا اور میرے کہنے پر کس طرح یہ راہ راست پر آ گیا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اب یہ فلاں ٹھیکیدار کی نوکری کرتا ہے۔ میری بات بڑی لمبی ہوگئی تھی لیکن اس تھانیدار نے پوری توجہ سے اور بڑے صبر سے میری بات سنی۔

”اگر آپ کے اختیار میں ہے تو مجھ پر ایک کرم کریں“ ـــــ میں نے تھانیدار سے کہا ـــــ ”اگر اویس کے خلاف کوئی پکا ثبوت نہیں تو اسے تھانے نہ لے جائیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مجرموں کی دنیا میں ایک بار پھر چلا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میری محنت ضائع جائے۔ یہ لڑکا غنڈہ نہیں...... میں آپ سے یہ بھی درخواست کرتی ہوں کہ یہ چلا گیا تو میں اکیلی رہ جاؤں گی“۔

”کیا آپ شادی شدہ نہیں ہیں؟“ ـــــ اُس نے پوچھا۔

میں نے یہ کہانی بھی اُسے سنا ڈالی اور اُسے کہا کہ میں صوفی صاحب کو بلا لاتی ہوں۔ اُس نے کہا کہ ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ تھانیدار بہت ہی بھلا آدمی تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوُا اور اُس نے مجھے تسلی دی کہ وہ اویس کو نہیں چھیڑے گا۔

''دیکھ اویس!'' ـــــ تھانیدار نے اویس سے کہا ـــــ ''تمہاری اس پردہ دار خالہ کی عزت کی خاطر میں تمہیں شامل تفتیش نہیں کر رہا۔ اس کی اور میری عزت رکھنا تمہارا کام ہے۔ اگر کسی وقت مجھے ذرا سا بھی شک ہوُا کہ تم نے پھر غنڈہ گردی میں منہ مارا ہے تو خدا کی قسم، ایسا پھنساؤں گا کہ سات آٹھ سال اندر رہو گے''۔

''ایسا نہیں ہو گا خان صاحب!'' ـــــ اویس نے کہا۔

تھانیدار نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور چلا گیا۔

میں صبح ہوتے ہی صوفی صاحب کے ہاں چلی گئی اور اُنہیں بتایا کہ رات یہ بات ہوئی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ فکر نہ کرو۔ چھوٹے تھانیدار کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بڑے اُونچے خاندان کا آدمی ہے۔ اُس نے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا کرے گا۔ اب یہ ذمہ داری تمہاری ہے کہ اویس اپنا وعدہ پورا کرے۔

تیسرے ہی روز صوفی صاحب میرے گھر آئے۔ اُن کی بیوی بھی ساتھ تھی۔ وہ بھی بڑی نیک خاتون تھی۔

''تم ہماری بیٹی ہو'' ـــــ صوفی صاحب میرے گھر آئے۔ اُن کی بیوی بھی ساتھ تھی۔ وہ بھی بڑی نیک خاتون تھی۔

''تم ہماری بیٹی ہو'' صوفی صاحب نے کہا ـــــ ''مجھے پوری اُمید ہے کہ ہماری کسی بات کو غلط نہیں سمجھو گی''۔

صوفی صاحب نے اس طرح کبھی بات نہیں کی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ یہ جو اپنی بیوی کو بھی ساتھ لائے ہیں، بات کوئی خاص ہی ہے۔ میرا دھیان اویس کی طرف گیا میں نے سوچا کہ اُس کی کوئی شکایت لائے ہوں گے۔ میں نے ڈرے ڈرے سے لہجے میں اُن سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔

''الیاس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ صوفی صاحب تمہاری شادی کا بندوبست کر دیں گے'' ـــــ صوفی صاحب نے کہا ـــــ ''ہم دونوں اس بندوبست کے سلسلے میں آئے ہیں۔ تمہیں اب شادی کر لینی چاہئے بیٹا!''

''کوئی آدمی آپ کی نظر میں ہے؟'' ـــــ میں نے پوچھا۔

''ہاں'' ـــــ صوفی صاحب نے جواب دیا ـــــ ''اُس آدمی کو تم دیکھ چکی ہو یہ وہی چھوٹا تھانیدار ہے جو اویس کو پکڑنے آیا تھا۔ تم نے اگلی صبح مجھے بتایا تھا۔ میں اُسی روز تھانے گیا اور اُس سے بات کی۔ اُس نے کہا کہ وہ اویس کو نہیں پکڑے گا۔ اُسی رات وہ ہمارے گھر آیا اور کہنے لگا کہ وہ تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اور میری بیوی کو یہ بات بہت ہی پسند آئی ہے۔ اسی لئے میں اسے بھی ساتھ لے آیا ہوں''۔

''ایسا آدمی کہاں ملتا ہے بیٹی!'' ـــــ صوفی صاحب کی بیوی نے کہا ـــــ ''اس آدمی کو نوکری کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ بہت بڑے زمیندار خاندان کا لڑکا ہے۔ انگریزوں نے اسے تھانیداری میں ہی بھرتی کیا تھا۔ اُس نے تمہیں دل سے پسند کر لیا ہے''۔

''اگر آپ کو تسلی ہے تو میں کیسے انکار کر سکتی ہوں'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''آپ ہی میرے ماں باپ ہیں''۔

اویس گھر پر نہیں تھا۔ وہ صوفی صاحب کے جانے کے بعد گھر آیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ صوفی صاحب کیا کہہ گئے ہیں۔

''ہاں ہاں خالہ!'' ـــــ اویس نے کہا ـــــ ''یہ تھانیدار جاگیرداروں کا بیٹا ہے۔ میں اسے اور اس کے سارے خاندان کو جانتا ہوں۔ اچھے اخلاق والا آدمی ہے تم نے دیکھا تھا نا، کہ اُس نے یہاں آ کر ذرا سی بھی بدتمیزی کی بات نہیں کی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو وہ تم پر رُعب جمانے کے لئے نہ جانے کیا کیا بکواس کرتا''۔

پندرہ سولہ دنوں بعد میری شادی اس طرح ہوئی کہ صوفی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ محلے کی لڑکیاں جمع ہو گئیں۔ انہوں نے مجھے دُلہن بنایا۔ وہ گاتی بجاتی بھی رہیں۔ باقاعدہ بارات آئی جس میں زیادہ آدمی نہیں تھے۔ نکاح پڑھا گیا اور میں چلی گئی۔ وہ مجھے انبالہ سے ساٹھ ستر میل دور ایک بڑے گاؤں میں لے گیا جہاں اُس کی زمین تھی۔

میں نے اپنے دولہا سے پہلی بات یہ کہی کہ میں اویس کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔

''اکیلا کیوں رہے گا؟'' ـــــ اُس نے کہا ـــــ ''ہم وہیں جا رہے ہیں۔ میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ اب تمہارے مکان میں رہیں گے''۔

میرا یہ خاوند ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کے ماں باپ نے مجھے سر آنکھوں پر

بٹھایا۔ دو روز بعد ہم واپس انبالہ آ گئے۔ میں نے خاوند سے کہا کہ اویس کی شادی کا بندوبست کرنا ہے۔ دو تین مہینوں بعد یہ بندوبست بھی ہو گیا۔ بڑی اچھی لڑکی مل گئی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد پاکستان کے نعرے لگنے لگے۔ ہندوؤں کے الگ اور مسلمانوں کے الگ جلوس نکلنے لگے۔ کہیں کہیں ہندو مسلم فساد بھی ہو جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں میرے خاوند نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی۔ یہ واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ مسلم لیگ نے انبالہ سے چند میل دُور کسی گاؤں میں ایک جلسے کا اعلان کیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا تھا کہ جلسہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ڈیوٹی میرے خاوند کو دی گئی کہ وہ پولیس گارد ساتھ لے جائے اور جلسہ نہ ہونے دے۔ جب وہ گارد لے کر وہاں پہنچا تو جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ تلاوتِ قرآن ہو رہی تھی۔ میرے خاوند نے جلسہ منتشر کرنے کی بجائے اپنی گارڈ سے کہا کہ دُور پیچھے کھڑے رہو۔ ہم اُس وقت کارروائی کریں گے جب دنگا فساد کا خطرہ ہوگا۔ وہاں اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ میرے خاوند نے مسلمان کی حیثیت سے جلسے میں دخل اندازی نہ کی۔ جلسہ ہوا اور میرا خاوند واپس آ گیا۔

پولیس گارد میں ہندو اور سکھ کانسٹیبل بھی تھے۔ اُنہوں نے چغلی کھائی۔ میرے خاوند کو معطل کیا گیا۔ محکمانہ کارروائی ہوئی جس کے نتیجے میں دو سال کے لئے اُس کی ترقی روک دی گئی۔ اُس نے استعفیٰ دے دیا۔ جس میں اُس نے لکھا کہ میں مسلمان ہوں اور اپنے آپ کو اپنی قوم سے الگ نہیں کر سکتا۔

اُسے نوکری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں اویس اور اُس کی بیوی کو ساتھ لے کر اپنے خاوند کے گاؤں چلی گئی۔ سنانے کو تو بہت سی باتیں ہیں لیکن میں کہانی کو یہیں ختم کرنا چاہتی ہوں۔ ایک ہی سال بعد پاکستان بن گیا اور ہم اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ کر پاکستان میں آ گئے۔ ہم وقت سے پہلے نکل آئے تھے۔ اُن علاقوں میں مسلمانوں کا بہت ہی کشت و خون ہوا تھا۔ یہاں آ کر اتنی تو نہیں پھر بھی خاصی زمین مل گئی۔ نئی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اویس کو میں نے ساتھ ہی رکھا۔ یہ زندگی بہت خوبصورت گزری۔